
خواتین اور دوشیزاؤں کیلیئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ
خواتین ڈائجسٹ
جولائی 2022

خواتین ڈائجسٹ

بانی و مدیرِ اعلیٰ ــــ محمود ریاض

مدیرہ ــــ سادرہ خاتون

مدیر ــــ آذر ریاض

نائب مدیرہ ــــ رضیہ جمیل

معاونِ خصوصی ــــ امت الصبور

بلقیس بھٹی

نفسیات ــــ عدنان

اشتہارات ــــ خالدہ جیلانی

خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی

MEMBER APNS CPNE	رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

واٹس اپ

03172266944



ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت، یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔



جولائی 2022
جلد 50 شمارہ 03
قیمت 120 روپے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ——— 1,440 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ——— 18,250 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا — 20,750 روپے
سالانہ خریداری کے لیے ای میل کریں
subscriptions@khawateendigest.com

نظمیں غزلیں

رنگا رنگ پھول

میری بیاض سے

پکوان

نفسیات

بیوٹی بکس

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617 Fax: 92-21-32766872 0317 2266944
Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

ختم نبوت ﷺ زندہ باد **عظمت صحابہ زندہ باد**

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:

معزز ممبران: آپ کا وٹس ایپ گروپ ایڈمن "**اردو بکس**" آپ سے مخاطب ہے۔

آپ تمام ممبران سے گزارش ہے کہ:

- گروپ میں صرف PDF کتب پوسٹ کی جاتی ہیں لہذا کتب کے متعلق اپنے کمنٹس / ریویوز ضرور دیں۔ گروپ میں بغیر ایڈمن کی اجازت کے کسی بھی قسم کی (اسلامی وغیر اسلامی، اخلاقی، تحریری) پوسٹ کرنا سختی سے منع ہے۔
- گروپ میں معزز، پڑھے لکھے، سلجھے ہوئے ممبرز موجود ہیں اخلاقیات کی پابندی کریں اور گروپ رولز کو فالو کریں بصورت دیگر معزز ممبرز کی بہتری کی خاطر ریموو کر دیا جائے گا۔
- کوئی بھی ممبر کسی بھی ممبر کو انباکس میں میسج، مس کال، کال نہیں کرے گا۔ رپورٹ پر فوری ریموو کر کے کاروائی عمل میں لائے جائے گی۔
- ہمارے کسی بھی گروپ میں سیاسی و فرقہ واریت کی بحث کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔
- اگر کسی کو بھی گروپ کے متعلق کسی قسم کی شکایت یا تجویز کی صورت میں ایڈمن سے رابطہ کیجئے۔
- سب سے اہم بات:

گروپ میں کسی بھی قادیانی، مرزائی، احمدی، گستاخِ رسول، گستاخِ امہات المؤمنین، گستاخِ صحابہ و خلفائے راشدین حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت حسنین کریمین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین، گستاخ اہلبیت یا ایسے غیر مسلم جو اسلام اور پاکستان کے خلاف پراپیگنڈا میں مصروف ہیں یا ان کے روحانی وذہنی سپورٹرز کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے لہذا ایسے اشخاص بالکل بھی گروپ جوائن کرنے کی زحمت نہ کریں۔ معلوم ہونے پر فوراً ریموو کر دیا جائے گا۔

- تمام کتب انٹرنیٹ سے تلاش / ڈاؤنلوڈ کر کے **فری آف کاسٹ** وٹس ایپ گروپ میں شیئر کی جاتی ہیں۔ جو کتاب نہیں ملتی اس کے لئے معذرت کر لی جاتی ہے۔ جس میں محنت بھی صَرف ہوتی ہے لیکن ہمیں آپ سے صرف دعاؤں کی درخواست ہے۔
- عمران سیریز کے شوقین کیلئے علیحدہ سے عمران سیریز گروپ موجود ہے۔
- **لیڈیز کے لئے الگ گروپ کی سہولت موجود ہے جس کے لئے ویریفکیشن ضروری ہے۔**
- اردو کتب / عمران سیریز یا سٹڈی گروپ میں ایڈ ہونے کے لئے ایڈمن سے وٹس ایپ پر بذریعہ میسج رابطہ کریں اور جواب کا انتظار فرمائیں۔ برائے مہربانی اخلاقیات کا خیال رکھتے ہوئے موبائل پر کال یا ایم ایس کرنے کی کوشش ہر گز نہ کریں۔ ورنہ گروپس سے تو ریموو کیا ہی جائے گا بلاک بھی کیا جائے گا۔

نوٹ: ہمارے کسی گروپ کی کوئی فیس نہیں ہے۔ سب فی سبیل اللہ ہے

0306-7163117	0343-7008883	0333-8033313
محمد سلمان سلیم	پاکستان زندہ باد	راؤایاز

پاکستان زندہ باد **پاکستان پائندہ باد**

اللہ تبارک تعالیٰ ہم سب کا حامی وناصر ہو

مُدیر

کہی سُنی

خواتین ڈائجسٹ جولائی کا شمارہ عید نمبر لیے حاضر ہے۔
عید الاضحیٰ کی آمد آمد ہے۔
ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی جانب سے آپ سب کو دلی عید مبارک۔
ہماری دعا ہے کہ عید آپ سب کے آنگن میں خوشیوں کی بہار لے کر آئے۔ آپ سب کو عید کی حقیقی خوشیاں نصیب ہوں۔

ہر قوم اور مذہب میں کچھ دن خاص ہوتے ہیں۔ وہ ان دنوں میں اپنے اپنے انداز سے خوشیاں مناتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے تہوار ایک علیحدہ اور جداگانہ شان رکھتے ہیں۔ ان میں اللہ کی عبادت، اطاعت، وقار اور پاکیزگی کا جو رنگ نظر آتا ہے وہ دوسرے مذاہب اور قوموں کے تہوار میں نظر نہیں آتا۔ دوسری قومیں تہواروں کے دن ہلا گلا کرتی ہیں، مختلف قسم کے کھیل تماشے کر کے تہوار مناتی ہیں لیکن مسلمان کا تہوار منانے کا انداز ہی جدا ہے۔ وہ عید کے دن بھی سب سے پہلے اللہ کے حضور جھک کر، اس کی کبریائی بیان کر کے عید کے دن کا آغاز کرتے ہیں۔ کوئی چھوٹا بڑا نہیں ہوتا۔ سب اللہ کے حضور کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

عید الاضحیٰ قربانی کے ایک عظیم واقعے کی یاد میں منائی جاتی ہے۔
محبت میں اطاعت شرطِ اوّل ہے اور حکمِ الٰہی کے سامنے سر جھکا دینا ہی حقیقی محبت ہے۔
حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ سے محبت اور اس کی اطاعت کی وہ عظیم الشان مثال قائم کی جو رہتی دنیا تک یاد رہے گی۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں اپنا لختِ جگر، اپنی عزیز ترین شے کی قربانی پیش کی مگر ان کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ محبت اور اطاعت اتنی پسند آئی کہ رہتی دنیا تک ان کی تابعداری اور قربانی امر کر دی گئی۔ قیامت تک مسلمان قربانی کر کے اس واقعے کی یاد تازہ کرتے رہیں گے۔
معاشرے میں بڑھتی مہنگائی نے جینا مشکل کر دیا ہے۔ مہنگائی کے باعث بہت سے لوگوں کے لیے قربانی کا فریضہ ادا کرنا مشکل ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ آپ کو قربانی کی توفیق دے تو ان لوگوں کا خیال رکھیں جو یہ فریضہ ادا کرنے سے قاصر ہیں۔

اس شمارے میں،

- نعیمہ ناز کا مکمل ناول — روشن سحر،
- سمیرا حمید کا مکمل ناول — مشکِ بام،
- نمرہ احمد کا مکمل ناول — مالا،
- افشاں آفریدی کا ناولٹ — تیری عید میری عید،
- دانہ پانی — عمیرہ احمد کا ناول،
- نادیہ الطاف، آمنہ جبار شیخ، آسیہ رئیس خان، ندا سکندر اور عندلیب زہرا کے افسانے،
- عید — خوشیوں کی نوید — قارئین سے سروے،
- نگہت عبداللہ سے ملاقات،
- باتیں احمد رضا حارث سے،
- کرن کرن روشنی — احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔
قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔
پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے۔ اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔
کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔
ہم جو احادیث شائع کررہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرامؓ اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

دیتوں سے متعلق احکام ومسائل

مسلمان کو ظلم کے طور پر قتل کرنا بڑا گناہ ہے

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”قیامت کے دن لوگوں میں سب سے پہلے خون کے مقدمات کے فیصلے ہوں گے۔“

فوائد ومسائل : حقوق العباد میں جان لینے کا معاملہ سب سے شدید ہے، اس لیے قیامت کے دن سب سے پہلے ان معاملات کا فیصلہ ہوگا۔
عبادات میں سب سے پہلے نماز کا حساب ہو گا۔
کسی جرم کی سزا کے طور پر اسلامی حکومت کے حکم سے مجرم کو قتل کرنا، ناحق قتل میں شامل نہیں بلکہ جلاد کا یہ ڈیوٹی انجام دینا اسلامی حدود کے نفاذ کی وجہ سے ثواب کا باعث ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”جس انسان کو بھی ظلم کے طور پر قتل کیا جاتا ہے اس کے خون (کے گناہ) کا ایک حصہ آدم علیہ السلام کے پہلے بیٹے قابیل کو بھی ملتا ہے کیونکہ سب سے پہلے اس نے قتل کا طریقہ جاری کیا۔“

فوائد ومسائل :
ظلم کا کوئی طریقہ ایجاد کرنا بہت بڑے خسارے کا باعث ہے۔
ایک گناہ کرنے والے کو دیکھ کر یا اس کی ترغیب سے جب دوسرے لوگ وہ گناہ کرتے ہیں تو پہلے شخص پر ان کے گناہوں کی ذمے داری بھی عائد ہوتی ہے، تاہم اس سے بعد والوں کے گناہ کی شناعت اور سزا میں کمی نہیں ہوتی۔

حضرت عقبہ بن عامر جہنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”جو شخص اللہ سے اس حال میں ملتا ہے کہ اس

کے ساتھ کسی چیز کو (عبادت میں) شریک نہیں کرتا اور کسی حرام خون میں ملوث نہیں ہوتا تو وہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔"

فوائد و مسائل : شرک کا مرتکب دائمی جہنمی ہے۔

قتل کے جرم کا ارتکاب جہنم میں داخلے کا باعث ہے۔

جنت میں داخلے کے لیے ضروری ہے کہ ان تمام کاموں سے اجتناب کیا جائے جو جہنم کی سزا کا باعث بنتے ہیں۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ کی نظر میں کسی مومن کو ناحق قتل کرنے سے پوری دنیا کا تباہ ہو جانا بھی کم اہمیت رکھتا ہے۔"

فوائد و مسائل : اللہ کی نظر میں مومن کا مقام بہت بلند ہے۔

عام طور پر قتل کا سبب کوئی دنیوی مفاد ہوتا ہے، اس چھوٹے سے مفاد کے لیے قتل کر دینا بہت بڑی غلطی ہے کیونکہ اللہ کی نظر میں مومن کی جان پوری دنیا کے خزانوں سے قیمتی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس شخص نے کسی مومن کے قتل میں آدھے لفظ کے ساتھ بھی تعاون کیا، وہ جب اللہ سے ملے گا تو اس کی پیشانی پر لکھا ہوگا اللہ کی رحمت سے مایوس۔"

کیا مومن کے قاتل کی توبہ قبول ہو سکتی ہے؟

حضرت سالم بن ابو جعد رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے پوچھا گیا کہ۔

"اس شخص کا کیا حکم ہے جس نے کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کر دیا، پھر توبہ کر لی، ایمان لایا، نیک اعمال کیے اور ہدایت اختیار کی؟"

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا

"افسوس! اسے ہدایت کہاں مل سکتی ہے؟ میں نے تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے "قیامت کے دن قاتل اس حال میں حاضر ہوگا کہ مقتول نے اس کا سر پکڑ رکھا ہوگا اور وہ کہے گا یارب! اس سے پوچھ" اس نے مجھے کیوں قتل کیا؟"

اللہ کی قسم! اللہ نے وہ آیت تمہارے نبی پر نازل فرمائی، پھر نازل فرمانے کے بعد منسوخ نہیں کی۔"

فوائد و مسائل : سائل کے سوال میں اللہ کے اس فرمان کی طرف اشارہ ہے۔

"اور بے شک میں اس شخص کو ضرور بخشنے والا ہوں جو توبہ کرے، ایمان لائے اور نیک عمل کرے، پھر ہدایت پر قائم رہے۔"

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے جواب میں اس آیت مبارکہ کی طرف اشارہ ہے۔

"جو کوئی کسی مومن کو قصداً قتل کر ڈالے تو اس کی سزا دوزخ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب اور اس کی لعنت ہوگی اور اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے بہت بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔"

قتل کے گناہ کی معافی کئی طریقوں سے ممکن ہے (ا) قصاص میں قتل ہو جانے سے، کیونکہ حد لگنے سے گناہ معاف ہو جاتا ہے۔ (ب) مقتول کے وارث کے معاف کر دینے سے، خواہ یہ معافی دیت لے کر ہو، یا اللہ کی رضا کے لیے بلا معاوضہ ہو۔ (ج) خلوص دل سے سچی توبہ کر لینے سے (جیسا کہ اگلی حدیث میں آرہا ہے۔)

آیت مبارکہ میں قتل کے جرم کی اصل سزا کا ذکر ہے۔ اگر قاتل کو معافی نہ ملے تو اس کو یہ سزا مل سکتی ہے۔ بعض علماء نے اس سزا کو اس صورت پر محمول کیا ہے جب کہ قاتل، قتل کو حلال سمجھے کیونکہ حرام کو حلال سمجھنا کفر ہے اور کافر کی سزا دائمی جہنم ہے۔ یا ہمیشہ رہنے سے طویل زمانے تک جہنم میں رہنا مراد ہے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا کیا میں تم کو ایک حدیث

نہ سناؤں جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دہن مبارک سے سنی ہے؟ اسے میں نے خود اپنے کانوں سے سنا، اور میرے دل نے اسے یاد رکھا۔ (نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔)

"ایک بندے نے ننانوے انسان قتل کیے۔ آخر اسے توبہ کا خیال آ گیا، چنانچہ اس نے دنیا کے سب سے بڑے عالم کے بارے میں دریافت کیا تو اسے ایک آدمی کا پتہ دیا گیا۔ وہ اس کے پاس گیا اور کہا۔

"میں ننانوے انسان قتل کر چکا ہوں۔ کیا میری توبہ ممکن ہے؟"

اس نے کہا "ننانوے انسان (قتل کرنے) کے بعد؟" (توبہ کا طریقہ پوچھتے ہو؟)

اس نے تلوار نکال کر اسے بھی قتل کر دیا اور سو کی تعداد پوری کر دی۔ اس کے بعد پھر توبہ کی خواہش پیدا ہوئی تو اس نے دنیا کے سب سے بڑے عالم کے بارے میں دریافت کیا۔ اسے ایک آدمی کا پتہ دیا گیا، چنانچہ وہ اس کے پاس گیا اور کہا۔

"میں نے سو افراد کو قتل کیا ہے تو کیا میری توبہ ممکن ہے؟"

اس نے کہا۔ "تیرا بھلا ہو! تیرے اور توبہ کے درمیان کون رکاوٹ بن سکتا ہے؟ تو جس گندی بستی میں رہائش پذیر ہے اسے چھوڑ کر نیک لوگوں کی فلاں بستی میں چلا جا اور وہاں اپنے رب کی عبادت کر۔ وہ نیک لوگوں کی بستی میں جانے کے ارادے سے (اپنی بستی سے) نکل کھڑا ہوا۔ راستے میں اسے موت آ گئی۔ اس کے بارے میں رحمت کے فرشتوں اور عذاب کے فرشتوں میں اختلاف ہو گیا۔ ابلیس نے کہا۔ "اس کا مجھ سے گہرا تعلق ہے۔ اس نے ایک گھڑی بھی میری نافرمانی نہیں کی۔"

رحمت کے فرشتوں نے کہا۔ "یہ تائب ہو کر گھر سے نکلا ہے۔"

(حدیث کے راوی) ہمام بیان کرتے ہیں کہ اللہ عزوجل نے ایک فرشتہ بھیجا۔ ان فرشتوں (کی دونوں جماعتوں) نے اس کے سامنے معاملہ پیش کیا اور اس کی طرف رجوع کیا۔ اس نے کہا "دیکھو، یہ آدمی دونوں بستیوں میں سے کس کے زیادہ قریب تھا، اسے اسی بستی والوں میں شامل کر لو۔"

حضرت امام حسن بصری رحمتہ اللہ نے فرمایا:

"اسے جب موت آئی تھی تو وہ (مرتے مرتے بھی) گھسٹ کر نیک لوگوں کی بستی سے قریب ہوا اور برے لوگوں کی بستی سے دور ہوا، چنانچہ فرشتوں نے اسے نیک بستی والوں میں شمار کر لیا۔"

فوائد و مسائل : ایمان میں اللہ کی ناراضی اور اس کے عذاب سے خوف اور اللہ کی رحمت کی امید دونوں پہلو شامل ہیں۔

اس شخص کے دل میں اللہ کا خوف موجود تھا جس کی وجہ سے اس نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ اس کی توبہ کیسے قبول ہو سکتی ہے۔

جو شخص اللہ کا خوف محسوس کر رہا ہو تو عالم کو چاہیے کہ اسے اللہ کی رحمت کا یقین دلائے تاکہ وہ رحمت سے ناامید ہو کر توبہ سے محروم نہ ہو جائے، البتہ جو شخص رحمت کا غلط تصور رکھتے ہوئے گناہوں میں بے باک ہو گیا ہو تو اسے اللہ کے غضب اور عذاب کی طرف توجہ دلانی چاہیے، عالم کے لیے ضروری ہے کہ وسائل کے حالات کا لحاظ رکھتے ہوئے مناسب فتویٰ دے۔

خالص توبہ سے کبیرہ گناہ حتیٰ کہ قتل کا گناہ بھی معاف ہو جاتا ہے۔

اصلاح کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ گندے ماحول کو ترک کر کے پاکیزہ ماحول اختیار کیا جائے۔

ابلیس نے جو بات کہی اس کا مطلب غالباً خوشی کا اظہار ہے کہ یہ مجرم ضرور جہنم میں جائے گا، اس لیے فرشتوں نے جواب میں اس کی توبہ کا ذکر کیا جس میں اس کی بخشش کی امید کا اظہار ہے۔ واللہ اعلم۔

مقتول کے وارث کو تین میں سے ایک چیز اختیار کرنے کا حق حاصل ہے

حضرت ابوشریح (خویلد بن عمرو) خزاعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''جس کو قتل یا زخم کی مصیبت پہنچے تو اسے تین چیزوں میں سے ایک کو اختیار کرنے کا حق حاصل ہے۔ اگر وہ چوتھی چیز حاصل کرنا چاہے تو اس کے ہاتھ پکڑلو (منع کردو۔)
وہ (قصاص کے طور پر مجرم کو) قتل کرلے۔
یا معاف کردے۔
یا دیت وصول کرلے۔
جس نے ان میں سے کوئی کام کیا، پھر دوسرا کام بھی کردیا تو اس کے لیے جہنم کی آگ ہے، اس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔''

فوائد و مسائل : مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق نے سنداً ضعیف قرار دیتے ہوئے کہا کہ مذکورہ روایت کے بعض حصے کے شواہد مسند احمد (32/4) میں حسن درجے کے ہیں، اس کے بعد انہوں نے آگے آنے والی حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے جو کہ صحیح ہے، اس میں دو باتوں (بدلے میں قتل کرنے یا دیت دینے) کا ذکر موجود ہے، لہٰذا مذکورہ دو باتیں صحیح روایت سے ثابت ہوئیں اور تیسری بات ''معافی کرنا'' اس کی اسلام میں بڑی اہمیت ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ترغیب بھی دلائی ہے۔ بنابریں مذکورہ حدیث میں جن تین چیزوں کا ذکر ہے وہ دیگر شواہد اور قرائن کی بنا پر درست ہیں۔ واللہ اعلم

''قتل یا زخم کی مصیبت'' کا مطلب یہ ہے کہ اس کا کوئی رشتے دار قتل ہوجائے، یا خود اسے زخمی کردیا جائے، دونوں صورتوں میں اسے قصاص لینے کا حق بھی ہے، دیت بھی لے سکتا ہے اور معاف بھی کرسکتا ہے۔ یہ مسئلہ دوسرے دلائل سے ثابت ہے۔

چوتھی چیز کا مطلب غیر قانونی مطالبہ ہے، مثلاً پہلے دیت وصول کرلے، پھر موقع پاکر قاتل کو قتل کردے۔ یہ بہت بڑا جرم ہے، ایسا شخص خود قتل کا مجرم قرار پائے گا اور شرعی قانون کے مطابق سزا کا مستحق ہوگا۔ ایک کام کرکے دوسرا کام کرنے کا بھی یہی مطلب ہے۔

(قاتل کی) دیت برادری پر ہے، اگر برادری نہ ہو تو بیت المال سے ادا کی جائے

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ دیا کہ ''دیت کی ذمہ دار، عاقلہ (قاتل کی برادری) ہے۔''

فوائد و مسائل :
عاقلہ سے مراد وہ رشتے دار ہیں جو باپ کی طرف سے ہوتے ہیں، یعنی ددھیالی رشتے دار۔
عاقلہ میں پہلے بھائی اور بھتیجے وغیرہ آتے ہیں، پھر چچازاد بھائیوں کی اولاد یعنی ایک دادا کے پوتے، پھر دادا کے بھائیوں کی اولاد وغیرہ۔
دیت کو عاقلہ کے ذمے کرنے میں یہ بھی حکمت ہے کہ وہ مل جل کر دیت ادا کرسکتے ہیں، کسی ایک یا چند افراد پر نا قابل برداشت بوجھ نہیں پڑتا۔
دیت کو برادری سے وصول کرنے میں یہ بھی حکمت ہے کہ لڑائی جھگڑے میں یہ لوگ عموماً ساتھ دیتے ہیں اور کوئی شخص اگر قتل کرتا ہے تو اسے یہ خیال ہوتا ہے کہ میری مدد کرنے کے لیے میری برادری موجود ہے۔ جب ان پر دیت کی ذمے داری آئے گی تو وہ مجرم کو جرم کے ارتکاب سے روکنے کی کوشش کریں گے، اس کی حوصلہ افزائی نہیں کریں گے۔

حضرت مقدام (بن معدیکرب) شامی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
''جس کا کوئی وارث نہیں، اس کا میں وارث ہوں۔ میں اس کی دیت دوں گا اور اس کی وراثت لوں گا۔ اور جس کا کوئی وارث نہیں، ماموں اس کا

وارث ہے۔ وہ اس کی دیت دے گا اور اس کی وراثت لے گا۔"

فوائد ومسائل :

وارثوں میں سب سے پہلے ان کو حصہ دیا جاتا ہے جن کے حصے قرآن مجید اور احادیث میں مقرر کر دیے گئے ہیں۔ انہیں اصحاب الفروض کہتے ہیں۔ ان کی عدم موجودگی میں، یا ان کو دے کر باقی بچنے والا مال "عصبہ" کو ملتا ہے، یعنی میت کے وہ رشتے دار جن کا تعلق میت سے عورت کے واسطے سے نہ ہو، مثلاً بھائی، بھتیجا، چچا اور تایا وغیرہ۔

اگر عصبہ موجود نہ ہوں تو پھر "اولوالارحام" وارث ہوتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا میت سے تعلق عورت کے واسطے سے ہوتا ہے، مثلاً ماموں (ماں کا بھائی)، بھانجا (بہن کا بیٹا)، نانا (ماں کا والد) اور خالہ (ماں کی بہن) وغیرہ۔

عصبہ کی عدم موجودگی میں اولوالارحام جس طرح ترکے کا حق دار ہوتے ہیں، اسی طرح مالی ذمے داریوں کی ادائیگی بھی ان پر لازم ہوتی ہے، چنانچہ یہ رشتے دار اس صورت میں دیت کی ادائیگی کے بھی ذمے دار ہوتے ہیں۔ وراثت سے متعلق تفصیلی احکام ومسائل کے لیے دیکھیے۔

"اسلامی قانون وراثت" از مولانا ابو نعمان بشیر احمد حفظہ اللہ، طبع دار السلام، لاہور۔

لاوارث میت کی جائیداد بیت المال کے لیے ہوتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسلامی حکومت کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے اس مال کا انتظام فرماتے تھے۔ خلیفۃ المسلمین، بیت المال کے ذریعے سے یہ ذمے داری پوری کرتا ہے۔

جو شخص مقتول کے وارث کو قصاص یا دیت نہ لینے دے۔ (اس کا گناہ)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس نے اندھا دھند لڑائی میں، یا عصبیت کی بنا پر پتھر، کوڑا یا ڈنڈا مار کر قتل کر دیا، اسے قتل خطا کی دیت ادا کرنی پڑے گی اور جس نے جان بوجھ کر قتل کیا، اس سے قصاص لیا جائے گا۔ اور جو کوئی قصاص لینے میں رکاوٹ بنے اس پر اللہ کی، فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔ اس کا کوئی فرض یا نفل عمل قبول نہیں ہوگا۔"

فوائد ومسائل :

اندھا دھند لڑائی کا مطلب ہے کہ دو پارٹیاں آپس میں لڑ پڑیں، اس میں کسی کو پتھر وغیرہ لگا جس سے وہ مر گیا۔ اس میں یہ معلوم کرنا دشوار ہے کہ فلاں شخص کس کی ضرب سے مرا ہے، لہٰذا کسی کو متعین کر کے قصاص تو نہیں لیا جا سکتا لیکن اس کا خون بے کار بھی نہیں کیا جا سکتا، اس لیے دیت ضروری ہے۔

قصاص، اللہ کا قانون ہے۔ اللہ کے قانون کے نفاذ کی راہ میں رکاوٹ بننا کفریہ حرکت ہے، لہٰذا لعنت کا باعث ہے۔ ایسے شخص کی عبادت قبول نہیں ہوتی۔

دجال کا بیان

سیدنا حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ......

"میں خوب جانتا ہوں کہ دجال کے ساتھ کیا ہو گا؟ اس کے ساتھ بہتی ہوئی دو نہریں ہوں گی۔ ایک تو دیکھنے میں سفید پانی معلوم ہوگی اور دوسری دیکھنے میں بھڑکتی ہوئی آگ معلوم ہوگی۔ پھر جو کوئی یہ موقع پائے وہ اس نہر میں چلا جائے، جو دیکھنے میں آگ معلوم ہوتی ہے اور اپنی آنکھ بند کر لے اور سر جھکا کر اس میں سے پیئے، وہ ٹھنڈا پانی ہوگا اور دجال کی ایک آنکھ بالکل چٹ ہوگی اس پر ایک پھلی ہوگی موٹی اور اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان کافر لکھا ہوگا جس کو ہر مومن پڑھ لے گا خواہ وہ لکھنا جانتا ہو یا نہ جانتا ہو۔"

(صحیح مسلم)

لوگ ہلالِ شام سے بڑھ کر

انشا جی

لوگ ہلالِ شام سے بڑھ کر پل میں ماہِ تمام ہوئے
ہم ہر برج میں گھٹتے گھٹتے صبح تلک گمنام ہوئے

ان لوگوں کی بات کرو جو عشق میں خوش انجام ہوئے
نجد میں قیس، یہاں پر انشاء، خوار ہوئے، ناکام ہوئے

کس کا چمکتا چہرا لائیں کس سورج سے مانگیں دھوپ
گھور اندھیرا چھا جاتا ہے، خلوتِ دل میں شام ہوئے

ایک سے ایک جنوں کا مارا اس بستی میں رہتا ہے
ایک ہمیں ہشیار تھے یارو، ایک ہمیں بدنام ہوئے

شوق کی آگ نفس کی گرمی گھٹتے گھٹتے سرد نہ ہو
چاہ کی راہ دکھا کر تم تو وقفِ دریچہ و بام ہوئے

ان سے بہار و باغ کی باتیں کر کے جی کو دُکھانا کیا
جن کو ایک زمانہ گزرا کنجِ قفس میں رام ہوئے

انشا صاحب، پو پھٹتی ہے تارے ڈوبے صبح ہوئی
بات تمہاری مان کے ہم تو شب بھر بے آرام ہوئے

مزے دار کھانوں کے بغیر ہر خوشی بے رنگ اور پھیکی ہوتی ہے خاص طور پر جب سب مل بیٹھیں تو کھانے کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ تہواروں پر جب سب اپنے ساتھ ہوتے ہیں تو دستر خوان بھی نت نئے کھانوں سے سجے ہوتے ہیں۔
عیدالفطر کے موقع پر شیر خورما، کیک اور مٹھائیوں سے مہمانوں کی تواضع کی جاتی ہے تو عیدالاضحیٰ کے موقع پر دستر خوان گوشت سے بنے نت نئے کھانوں سے سجے نظر آتے ہیں۔ گوشت چونکہ وافر ہوتا ہے تو کھانا پکانے کی نت نئی ترکیبوں پر بھی طبع آزمائی کی جاتی ہے۔
عید نمبر میں قارئین سے سروے میں ہم نے اسی حوالے سے سوالات کیے ہیں سوالات یہ ہیں۔
1۔ عیدالاضحیٰ کا دن کیسے گزرتا ہے؟ کیا آپ قربانی کے گوشت کو صاف کرنے، تقسیم اور دیگر کاموں میں حصہ لیتی ہیں؟
2۔ ہر گھر کی ایک روایتی ڈش ہوتی ہے۔ جو خاص موقعوں پر بنائی جاتی ہے۔ گوشت کی وہ کون سی ڈش خاص ڈش ہے جو ہر بقر عید پر آپ کے گھر ضرور بنتی ہے؟

عید، خوشیوں کی نوید

ادارہ

نجمہ جبار..... بہاولپور

س: عیدالاضحیٰ کا دن کیسا گزرتا ہے کیا آپ گوشت بنانے اور تقسیم کرنے کا کام کرتی ہیں؟

1۔ یہ دن گھر کے کاموں میں، ملنے ملانے، آنے جانے یا گوشت کھانے میں بانٹنے بولنے میں گزر جاتا ہے۔ میری جٹھانی بھابھی سعیدہ اور دیورانیاں راحت فاطمہ اور میری پیاری نندیں اپنی فیملی کے ساتھ عید کے دن شام یا رات کے وقت میری طرف آجاتی ہیں۔ ہم ان کے گھر چلے جاتے ہیں اور ہم میں بہت پیار ہے۔ وہ بھی میری طرح شعاع خواتین کی دیوانی ہیں۔ تو ہماری خوب بنتی ہے اور یہ دن بہت اچھا گزرتا ہے اپنوں کے سنگ۔ میکہ سندھ میں ہے تو وہاں نہیں جاتی عید پر۔ ہاں میں یہاں بچپن کا ذکر کروں گی کہ اس وقت بھی عیدی لینے کی جلدی ہوتی تھی ابو، نانا، چچا، ماما، تایا سے، ساتھ امی ہی مجھے اور باجی کو بھی جو مجھ سے بڑی ہیں کو عید پر بھی اپنے ساتھ کام میں لگالیا کرتی تھیں۔

میں اور چھوٹی بہنیں عائشہ وصائمہ رنگ برنگے کپڑے پہن کر، بن ٹھن کر نک سک سے تیار ہو کر میرون سرخی لگا کر (کہ ایک وقت تھا کہ لپ اسٹک کا یہ شیڈ بہت ان تھا) تھال میں گوشت لے کر محلے میں بانٹنے جاتی تھیں اور واپسی پر عیدی ہمارے ہاتھوں میں ہوتی تھی اور وہ الگ بات ہے کہ وہ ایک روپیہ یا دو تین روپے ہوتے مگر اس وقت تو وہ بھی بہت تھے۔ پھر ان پیسوں سے میٹھی گولیاں چھالیتی میں یا چناچاٹ۔ جس میں آلو اور چنے کھٹے پانی میں تیر رہے ہوتے۔ میں گوشت بنانے کا کام نہیں کرتی کہ شوہر ارشد اور میرے دیور ہی مل کر قربانی کر لیتے ہیں اور ہاں بس گوشت کو پکانے سے پہلے مزید چھوٹی چھوٹی بوٹیاں کر لیتی ہوں یا سل پر قیمہ پیس لیا۔

تقسیم ویسے تو شوہر ہی کرتے ہیں، ہاں حصے میں بنالیتی ہوں اور بچوں کے ساتھ جا کر شوہر ارشد

تقسیم کر دیتے ہیں۔

س: ہر گھر کی ایک روایتی ڈش ہوتی ہے جو خاص ہوتی ہے، گوشت کی وہ کونسی ڈش ہے جو گھر میں ضرور بنتی ہے؟ اس کی ترکیب بھی بتائیں؟

2۔ جی بنتی ہے گوشت کی خاص ڈش اور سب پسند بھی کرتے ہیں۔ عید کے گوشت میں ایک الگ ہی ذائقہ ہوتا ہے اور سب شوق سے کھاتے ہیں تو ڈش مٹکا گوشت ہے۔

مٹکا گوشت

گوشت	ایک کلو
لہسن ادرک	دو کھانے کے چمچے
دہی	ایک کپ
پیاز	تین عدد
آٹا	چوتھائی کپ
ہرا مسالہ	حسب ذائقہ
نمک	حسب ذائقہ
گرم مسالا	آدھا چائے کا چمچہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب: ہانڈی میں گھی گرم کرکے پیاز سنہری کریں، پھر گوشت کے ساتھ لہسن، ادرک، ہلدی، پسا دھنیا، پسی مرچ، سیاہ زیرہ، نمک اور پانی ڈال کر ہلکی آنچ پر پکنے دیں۔ ڈھکن کو آٹا لگا کر بند کر دیں۔

گوشت گل جائے تو روغن الگ نکال کر گوشت میں دہی ڈال کر بھونیں۔ چار گلاس پانی ڈال دیں۔ آدھا کپ پانی میں آٹا گھول کر شامل کرلیں۔ چمچہ مسلسل ہلائیں۔ گاڑھا ہونے لگے تو علیحدہ کیا ہوا روغن شامل کرکے گرم مسالا چھڑکیں اور مٹی کے کٹورے میں نکال کر کترے ہوئے ہرے مسالے کے ساتھ گارنش کرکے پیش کریں۔

آخر میں پھر سے تمام خواتین ڈائجسٹ سے منسلک اسٹاف اور قارئین کو یہ بڑی عید مبارک ہو۔ خوش رہیں اور دوسروں کے لیے خوشی کی وجہ بنیں۔

سلمٰی مسرت......راولپنڈی

1۔ اس عید کی تیاری ایک ہفتہ پہلے شروع ہوجاتی ہے جانور کے انتظام کے ساتھ مجھے لہسن ادرک مسالوں کی فکر ہوتی ہے یہ تیاری امی جان بھی کرکے رکھتی تھیں۔

گھر کے مرد جب قربانی کا گوشت تیار کررہے ہوتے ہیں تو عورتوں کا فرض ہے کہ اس دوران کھانا تیار ہوجائے تو مسالہ پہلے سے تیار ہوتا ہے۔ سالن روٹیاں سلاد رائتہ تیار کرلیتی ہوں پھر اگلے دن چاولوں کی ڈشیں بنتی ہیں دوپہر کو گھنٹہ آرام کرکے عصر کے درمیان قریبی گھروں میں جہاں قربانی نہیں ہوتی۔

میں سب سے پہلے گوشت بھجواتی ہوں پھر مغرب عشا تک دور دراز کے پیکٹ بنا کر اور قریبی گھروں میں بھی تقسیم کردیتی ہوں۔ ہر پیکٹ پر مارکر سے نام لکھ لیتے ہیں۔

گوشت انتہائی نفاست سے بناتے ہیں یہ سارا کام میرے شوہر کرتے ہیں اور میں برابر ساتھ دیتی ہوں الحمدللہ لیکن دن کے اختتام پر بخار ضرور ہوجاتا ہے۔ بہت تھکا دینے والا دن ہوتا ہے۔

2۔ ہمارے گھر میں ہمارے حصے کا جو گائے کا گوشت آتا ہے اس کا ہم قیمہ بنا لیتے ہیں۔

زیادہ تر قیمے کے کباب بنتے ہیں اسپیشلی چپلی کباب صرف عید کے موقع پر بنتے ہیں۔

اور شامی کبابوں کا بھی مزا علیحدہ ہی ہوتا ہے جو پورا سال نہیں ملتا چپلی کباب سب اپنے روایتی طریقے سے بناتے ہیں۔

میں نے جو طریقہ اپنایا ہے وہ اس طرح ہے کہ آدھا کلو قیمے میں پیاز، لہسن ادرک، ٹماٹر، سبز مرچ موٹا موٹا کاٹ کر ایک پیالی دہی میں ہلکی آنچ پر پکا لیتی ہوں۔

جب دہی کا پانی خشک ہوجائے تو اسے چوپر میں یا پھر کونڈی میں ڈال کر ایک پیکٹ چپلی کباب مسالہ چاہے وہ نیشنل کا ہو یا شان کا اسے باریک پیس لیں ایک انڈا بھی شامل کرلیں اور توے پر آئل ڈال کر کباب کی حسب پسند ٹکیاں بنا کر انڈے میں ڈپ

کر کے فرائی کریں۔

شامی کباب میں گھر کے مسالوں مثلاً ثابت دھنیا، سفید زیرہ اور باقی پیاز، لہسن ادرک، سبز مرچ، گرم مسالے کے ساتھ پیکٹ کا مسالہ بھی شامل کریں تو شامی کباب بھی اچھے بنتے ہیں۔

بریانی تو ہم سارا سال کھاتے ہی رہتے ہیں عید پر دیسی مسالوں کے ساتھ بیف ہو یا مٹن اس کا پلاؤ بنائیں میری فیورٹ ڈش ہے۔ سب شوق سے کھاتے ہیں۔

صدف ناصر......جڑانوالہ

1۔ عیدالاضحیٰ کا دن بہت زبردست گزرتا ہے۔ تقریباً پوری رات جاگنے کے بعد نماز فجر کی ادائیگی پھر گھر والوں کو جگا کر عید کی نماز کی تیاری۔ بھاگم بھاگ جائے نماز لے کر مسجد کی طرف دوڑ لگاتے ہیں جو کہ بالکل ساتھ ہی گلی میں ہے۔ واپسی پر "سویٹ ڈش" کھاتے ہیں۔ پھر دہی بھلے، چکن پلاؤ بناتی ہوں۔ کوک، سلاد، رائتہ تیار کرتی ہوں۔ بچوں کے چھوٹے چھوٹے سے دوست آتے جاتے ہیں انہیں عیدی دیتی ہوں۔ ساتھ ساتھ تمام سسٹرز، رشتہ داروں اور دوستوں کو کال میسج وغیرہ کر کے عید کی مبارک باد۔ جی بالکل! قربانی کے حوالے سے تمام کام اکیلی ہی بخیر وخوبی سرانجام دیتی ہوں۔ کیونکہ بچے ابھی بہت چھوٹے ہیں تو خود ہی گوشت کو صاف کرتی رہتی ہوں۔

ریسپی کے حساب سے گوشت کو الگ الگ پیکٹ میں ڈال کر بند کرتی جاتی ہوں۔ مارکر کے ساتھ ریسپی کا نام لکھ دیتی ہوں۔ قربانی کی ہو تو تقسیم کے مرحلے میں قطعاً دخل اندازی نہیں کرتی بس اتنی کہ یاددہانی کروائی جاتی ہوں رشتہ داروں، ہمسایوں اور ضرورت مندوں کے نام جنھوں نے قربانی نہیں کی ہوتی انہیں سب سے پہلے اور زیادہ بھیجتی ہوں۔ تمام مسالہ جات ایک دن پہلے ہی سے بنا دیتی ہوں۔ جو لوگ خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ آپ بھی اپنے اردگرد توجہ فرمائیں۔

2۔ جی بالکل! روایتی ڈش ہوتی ہے اور "پہلوانوں کے شہر" کی تو ایک نہیں جناب سیکڑوں ڈشز ہیں۔ ایک ڈش سے ہمارا کیا بنتا ہے بھلا۔ (ہاہاہا)

صف اول ڈش "بیف پلاؤ" ہے اور دوئم "کچے قیمے کے کباب" سوئم "نمکین گوشت" لازم و ملزوم ہیں۔ جو عید کے تین دنوں میں ہر حال میں بناتے ہیں۔ کچن میں "شعاع" اور "خواتین" جگہ جگہ بہار دکھاتے ہیں۔ "موسم کے پکوان" (خالدہ جیلانی) والا صفحہ فولڈ ہوا ہوتا ہے اور ایک کے بعد ایک ڈش فنگر ٹپس پر ہوتی ہے۔ امی ابو کے گھر کی خصوصی ڈش "گوشت کے پکوڑے" تیسرے دن بناتی ہوں۔

"بیف پلاؤ" کی ترکیب حاضر ہے میرے اپنے اسٹائل میں دو کلو گوشت کو لہسن، پیاز اور نمک ڈال کر پریشر کرتی ہوں۔ کچا اور سخت بالکل نہیں رکھتی۔ پھر چاولوں کی تیاری کے لیے پیاز فرائی کر کے ہاف پیاز نکالتی ہوں۔ لہسن ادرک کا پیسٹ ڈال کر فرائی کرتی ہوں۔ نمک، مرچ، ہلدی، زیرہ، ٹماٹر، اچار، لیموں، املی ایک ساتھ ڈال کر چند منٹ بھون کر گوشت شامل کرتی ہوں۔ تمام مسالا جات مناسب مقدار میں تاکہ ہر کوئی خوشی سے کھائے۔ اس کے بعد پانی اور پھر چاول، چاول کا پانی خشک ہو جائے تو فرائی پیاز، ہری مرچوں، دھنیے اور بادام، کاجو، پستہ کے ساتھ گارنش کر کے دم پر لگا دیتی ہوں۔ بہت ہی مزے کا پلاؤ تیار ہوتا ہے۔ سلاد، رائتے، کولڈ ڈرنک کے ساتھ۔ سب سے بہترین بات یہ ہے کہ اتنے اسپائس ڈالنے کے بعد بھی پلاؤ ذرا بھی اسپائسی نہیں ہوتا۔ اس قدر "خالدہ جیلانی" نے ہمیں ایکسپرٹ کر دیا ہے کہ ذرا بھی توازن خراب نہیں ہوتا۔ (جزاک اللہ خیر)

شاہین ظفر......کراچی

1۔ عیدالاضحیٰ کا دن بے حد مصروف گزرتا ہے۔ سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہوتی ہے کہ ہمارے بھانجے سے ملاقات ہوتی ہے، وہ اتنا مصروف

ہوتا ہے کہ پورے سال اس سے ملاقات نہیں ہوتی ہے۔ اس لیے اسے بقرعید کا چاند کہتی ہوں کہ وہ گوشت لے کر ضرور آتا ہے۔

میں قربانی کا گوشت صاف کرنے، تقسیم کرنے اور دیگر کاموں میں بھرپور حصہ لیتی ہوں۔ گوشت کے تین حصے کرتی ہوں ایک حصہ غریبوں کا نکالتی ہوں۔ ایک حصہ رشتہ داروں کا نکالتی ہوں اور ایک حصہ اپنا نکالتی ہوں اور مزے مزے کی ڈشز بناتی ہوں۔

2۔ ہمارے گھر پر عید قربان میں ایک خاص ڈش بنتی ہے جسے پسندے کہتے ہیں۔

ترکیب:

- اجزاء۔

پسندے	ایک کلو گوشت کے پتلے پارچے بنالیں
کچے پپیتے کا پیسٹ	چار چمچے
لال مرچ پسی ہوئی	ایک چائے کا چمچہ
ادرک لہسن	ایک چائے کا چمچہ
دہی	چار چائے کے چمچے
تیل	آدھا پاؤ
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
کالی مرچ پسی ہوئی	ایک چائے کا چمچہ
لونگ الائچی	آدھا چائے کا چمچہ
دال چینی	آدھا چائے کا چمچہ
گرم مسالہ پسا ہوا	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسب ضرورت

ترکیب:

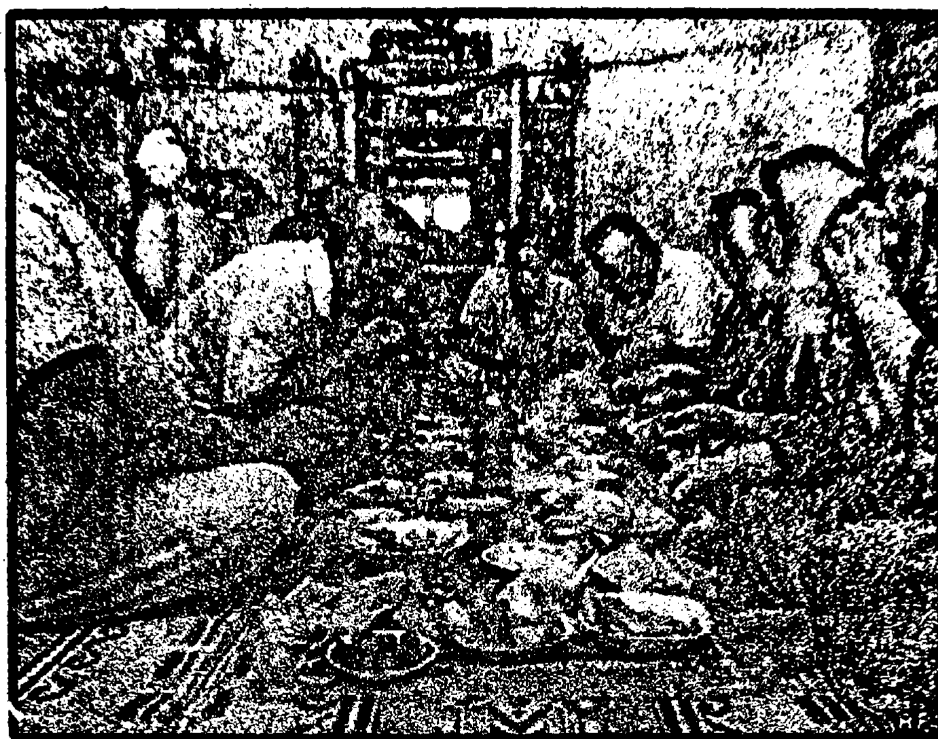
گوشت دھو کر چھلنی میں چھان لیں، تاکہ پانی خشک ہو جائے اس میں تمام مسالے مکس کر کے ساتھ دہی اور تیل بھی ملا کر ہاتھ سے خوب مکس کر لیں۔ ایک گھنٹہ رکھیں اس کے بعد تھوڑا سا پانی ڈال کر چولہے پر چڑھا دیں پکنے کے لیے جب پانی خشک ہو جائے تو اتار لیں۔

پھر فرائی پین میں تھوڑا سا تیل ڈال کر حسب ضرورت فرائی کرتے رہیں۔ اس کے بعد ڈش میں ڈال کر اس میں کھیرا۔ ٹماٹر، پیاز اور لیموں کاٹ کر سجا دیں پسندے تیار ہیں مہمانوں کو پیش کریں۔ شکریہ

مسرت حسین......امریکا ڈیلس

1۔ ہمارا عید کا دن بھی افراتفری میں گزرتا ہے صبح اٹھ کر ہم سب تیار ہوتے ہیں نماز پڑھنے جاتے ہیں۔ یہاں پر سب خواتین عید کی نماز پڑھنے جاتی ہیں وہاں میری ساری فرینڈز اور بچوں کے سارے فرینڈز ہوتے ہیں۔ سب نماز پڑھتے ہیں پھر اس کے بعد وہاں پر ناشتا کروایا جاتا ہے اور بہت زیادہ چیزیں ہوتی ہیں۔ اس میں پوریاں، آلو چھولے، پراٹھے، شیر خورمہ، مٹھائیاں چائے اور بہت کچھ ہوتا ہے سب ناشتے کے ساتھ ساتھ خوب انجوائے کرتے ہیں۔ بچوں کے لیے گراؤنڈ میں کافی گیمز ہوتے ہیں۔ دس بجے ہم گھر آتے ہیں، مرد حضرات واپسی میں قربانی کا گوشت لیتے ہوئے آتے ہیں گھر آکر لنچ بناتی ہوں۔ سب کھانا کھا کر ریسٹ کرتے ہیں پھر مرد حضرات قبرستان جاتے ہیں اور میں گوشت کو صاف کر کے اس کے حصے بناتی ہوں۔ یہاں پر فرینڈز کے ہاں بھیج دیتی ہوں۔ پھر ڈنر کا انتظام کرتی ہوں کیونکہ شام میں میرے دیور کی فیملیز آتی ہیں ان کے لیے ڈنر بناتی ہوں۔ شام میں وہ لوگ آتے ہیں چائے وغیرہ پیتے ہیں پھر ڈنر کرتے ہیں دس بجے تک وہ لوگ جاتے ہیں پھر میں کچن سمیٹ کر جو بستر پر گرتی ہوں تو مت پوچھیے کہ تھکن کی وجہ سے کیا حالت ہو رہی ہوتی ہے مگر اس طرح دن گزر جاتا ہے کہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ دن کہاں گیا۔ لیکن تہوار کی ایک اپنی خوشی ہوتی ہے۔ اس لیے دن اچھا ہی گزرتا ہے۔

2۔ ہمارے گھر کی روایتی ڈش تو ہماری قومی ڈش بریانی ہے جو ہر موقع پر بنائی جاتی ہے۔ عید یا بقرعید یا کوئی بھی خاص موقع ہو بریانی بنائی جاتی ہے مگر اس میں چینج آتا رہتا ہے کبھی سندھی بریانی تو کبھی تکہ بریانی کبھی چکن تندوری بریانی، کوفتہ بریانی کبھی



بیف بریانی اس طرح بریانی بنائی جاتی ہے۔

بقرعید پر سب سے پہلے اور لازمی کلیجی بناتی ہوں۔ جو کہ توے پر بناتی ہوں بہت مزے دار بنتی ہے مگر جو خاص ڈش بقرعید کو بناتی ہوں وہ چانپیں ہیں اس کی ترکیب یہ ہے۔

چانپیں	آدھا کلو
ادرک لہسن	ایک چمچہ
بریڈ کرمز	ایک کپ
آلو	آدھا کلو
انڈے	دو عدد
نمک	حسب ذائقہ
مرچ	حسب ذائقہ
آئل	تلنے کے لیے

چانپوں کو دھو کر ادرک لہسن کا پیسٹ، نمک مرچ لگا کر رکھ دیں۔ کھلے منہ کے ساس پین میں آئل ڈال کر چانپوں کو اس میں پھیلا کر رکھ دیں ہلکی آنچ پر پکنے دیں جب ایک طرف پک جائیں تو پلٹ دیں یہ اپنے ہی پانی میں گل جائیں گی، پانی خشک ہو جائے تو اتار لیں۔

آلو ابال کر میش کر لیں نمک اور سیاہ مرچ ملا دیں ان میش آلوؤں کو چانپوں پر اچھی طرح لگا دیں کہ وہ سب پوری طرح کور ہو جائیں ایک ایک چانپ پر الگ الگ اچھی طرح لگائیں انڈے پھینٹ لیں چانپیں اس میں ڈبو کر ڈبل روٹی کے چورے یا بریڈ کرمز میں اچھی طرح مکس کر لیں

پتیلی میں تیل گرم کریں درمیانی آنچ پر تل کر گولڈن براؤن کر لیں اچھی طرح براؤن ہو جائے تو اتار لیں اور پھر سلاد کے ساتھ چانپیں اس پر سجا کر مہمانوں کے سامنے پیش کریں۔

گوشی جمال......منڈی یزمان

1۔ عید کا دن ہو اور مصروف نہ ہو یہ ہو ہی نہیں سکتا اور اوپر سے عید قربان، سارا دن گوشت کی تقسیم، صفائی ستھرائی اور کھانے پکانے میں گزر جاتا ہے۔ ہاتھوں سے گوشت کی بساندھ ہی نہیں جاتی بلکہ دماغ

ے خواتین (خواتین) Sarvay Khawateen

میں گھس جاتی ہے۔

ہمارے ہاں قربانی تھوڑا لیٹ ہوتی ہے۔

عورتیں صبح سے لہسن پیاز بنا کر بیٹھی راہ دیکھ رہی ہوتی ہیں کب قربانی ہوگی اور ہم سارا کام ختم کریں اور ہماری خلاصی ہو۔ بھائی کلف لگے سوٹ میں تیار ہوکر چہل پہل کرتے رہتے ہیں اور قصاب من مرضی سے سارے گاؤں کے جانور ذبح کر کے ہمارے گھر کا رخ کرتے ہیں۔

لوگ صبح صبح بلکہ رات کو ہی چھریاں تیز کر کے قصاب کے سر ہوتے ہیں۔ ہمارے بھائی کو تھوڑی لاج آجاتی ہے کہ میں بار بار قصاب کو کال نہیں کروں گا وہ خود ہی آجائے گا۔

اماں کا واویلا عروج پر ہوتا ہے۔ اب تو بیماری کی وجہ سے ہاتھ میں ڈنڈا پکڑے رخ رخ کرتی پھرتی ہیں پھر بھی سب کے سر ہوتی ہیں اور بار بار باہر گیٹ پر چکر کاٹتی رہتی ہیں۔ قربانی کا مرحلہ وقوع پذیر ہونے کے بعد جو گھر کا حصہ ہوتا ہے۔ اس کی صفائی ستھرائی میں میرا ہاتھ لازمی اماں ڈلواتی ہیں۔

گوشت کی خوشبو ختم کرنے کے لیے سب سے پہلے اس کو کھلے برتن میں رکھ کر اوپر سے گیہوں کے آٹے کا تھوڑا سا چھڑکاؤ کر کے آدھا گھنٹہ رکھ دیا جاتا ہے۔ آٹا خون چوس لیتا ہے اور گوشت سے بساند ختم ہوجاتی ہے۔ ڈش کوئی بھی ہو لذیذ بنتی ہے۔ تجویز نوٹ فرما کر استفادہ حاصل کریں۔

گوشت کی تقسیم میں اماں اور گڈی آپا زیادہ رول پلے کرتی ہیں۔

2۔ ہمارے گھر کی ہر ڈش صدیوں سے روایتی ہی چلی آرہی ہے تبدیلی زیادہ پسند نہیں کرتے۔ لیکن میں نے کبھی کبھی تبدیلی لازمی لانی ہوتی ہے۔ ڈش وہی طریقے نئے۔ ہمارے گھر والے زیادہ تر سادہ کھانے پسند کرتے ہیں۔ زیادہ مرغن، مسالے دار ڈشز دونوں آپا پسند نہیں کرتیں۔ البتہ اماں چٹخارے دار پسند کرتی ہیں۔ نمک کی فراوانی شروع سے پسند کرتی چلی آرہی ہیں، اس لیے ان کا بی پی ہمیشہ ہائی پیمانے پر ہوتا ہے۔

اماں کا فرمان ہوتا ہے عید کی ڈشز میں مسالے ذرا تیکھے رکھا کرو لیکن اگر آپا بنائیں تو اماں وہ سالن ریجکٹ کر دیتی ہیں۔ پھر میں نے حسب روایت تیکھے مسالے والی کوئی ڈش اماں کو بنا کر دینی ہوتی ہے ہر عید قربان پر اماں کا یہ واویلا عروج پر ہوتا ہے کہ مجھے اوجڑی لازمی بنا کر دو۔

آپا کہتی ہیں ہم سے یہ بدبو والی پٹاری نہیں کھولی جاتی اور پکاتے وقت منہ اور ناک پر دوپٹہ نہیں رکھا جاتا۔ پھر چپکے سے اوجڑی کا بکس اٹھا کر کسی فقیر کو دے دیا جاتا ہے۔

البتہ کلیجی ضرور بنتی ہے۔ بھائی اور گڈی آپا وہ بھی نہیں کھاتے کہ یہ مٹی کے ڈھیلے ہم سے نہیں کھائے جاتے ہاہاہا۔ لیکن جب میں بناؤں تو نرم اور کراری پھر تو شوق سے کھا لیتے ہیں۔ اوجڑی کی بدبو ختم کرنے کا آسان نسخہ لہسن ادرک کا پیسٹ، نمک پانی میں ملا کر ابال دے لیں اور اس کو کھولتے ہوئے پانی میں 2 منٹ اوجڑی ڈال کر نکال لیں۔ ساری بدبو اڑن چھو ہو جائے گی۔ بنا کر کھلائیں اور داد وصول کریں کلیجی کی ریسپی پیش خدمت ہے۔ ہری مرچ میں کلیجی

کلیجی	ایک کلو
ٹماٹر	ایک پاؤ
ہری مرچیں	حسب ذائقہ
نمک	حسب ذائقہ
دودھ	دو کپ
لہسن ادرک	دو کھانے کے چمچ
گھی یا تیل	حسب ضرورت
سوکھا دھنیا	چٹکی بھر
گرم مسالا	چٹکی بھر

سب سے پہلے کلیجی کو دو منٹ شیلو فرائی کر کے نکال لیں۔ دو بڑی پیاز براؤن کر کے اس میں لہسن ادرک کا پیسٹ شامل کر لیں۔ ٹماٹر ڈال دیں اور پھر باقی مسالا ڈال کر بھونیں۔ گریوی اچھی طرح سے بھن جائے تو کلیجی ڈال کر پانچ منٹ بھونیں پھر دودھ ڈال کر پکائیں۔ اس سے کلیجی نرم رہے گی۔ سرو کریں تعریف پائیں۔



"ہمیشہ سادہ زندگی گزاری..... خواہشات بھی پالی ہی نہیں۔ سب کچھ سیٹ رہا۔"

"اب بچے کیا کرتے ہیں؟ آپ 'دادی' بنیں؟ کیونکہ بیٹی تو آپ کی ہے ہی نہیں؟"

"میرا بڑا بیٹا علی ہے اور بی کام کرنے کے بعد اس نے جاب کرلی۔ جاب کافی اچھی تھی اس کی...... عمر پر زیادہ محنت کرنی پڑی، کیونکہ وہ لاپرواہ قسم کا لڑکا ہے اگر امتحان دے کر آئے گا تو اسے رزلٹ کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ رزلٹ آگیا ہے، بس ٹھیک ہے کوئی ایکسائٹمنٹ نہیں ہوتی اور ابھی تک وہ ایسا ہی ہے اور میں ابھی تک اسی کی فکر میں رہتی ہوں۔ عبداللہ بھی اسی کی فکر میں رہتے تھے۔ اور ان کے آخری الفاظ بھی یہی تھے کہ عمر کہاں ہے۔ علی سے کہا

آپ کی پسندیدہ مصنفہ

نگہت عبداللہ سے ملاقات

شاہین رشید

کہ عمر کا خیال رکھنا۔

عمر مارکیٹنگ میں آیا اور اس نے بھی جاب کی۔ عثمان نے ریڈیو جوائن کرلیا اور تقریباً آٹھ سال وہ ریڈیو سے وابستہ رہا اور آٹھ سال وہ سیما رضا کے ساتھ اسسٹنٹ رہا اور پھر میگزین جوائن کرلیا۔

ابوبکر بھی جاب کرتا ہے۔

تو چاروں بچے جاب کرتے تھے اور تھے کا لفظ اس لیے استعمال کررہی ہوں کہ کووڈ کی وجہ سے سب کی جابس متاثر ہورہی تھیں۔ تو علی کو خیال آیا کہ جتنی محنت میں دوسروں کے لیے کرتا ہوں، اتنی ہی محنت میں اپنے کام کے لیے کروں تو ہم بہت ترقی کرسکتے ہیں۔ تو علی نے اپنا بزنس شروع کیا انکم ٹیکس کا اور وہ اس میں کامیاب ہے ماشاء اللہ سے۔ عمر نے بھی اپنا بزنس سیٹ کرلیا۔ عثمان اور ابوبکر جاب کررہے ہیں۔

اور ہاں دادی میں بن گئی ہوں۔ علی کی شادی 2008ء میں ہوئی۔ میں نے ساری زندگی کام کیا تھا اور مجھے اکیلے رہنے کی بھی عادت تھی تو جب بہو گھر میں آئی تو میں اسے بھی اپنے پاس زیادہ نہیں بیٹھنے دیتی تھی کہ مجھے کام کرنا ہوتا تھا۔ میں کہہ دیتی تھی کہ بیٹا اپنے کمرے میں جاؤ۔ میں کام کررہی ہوں۔ لکھ رہی ہوں۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ یہ اس کے ساتھ زیادتی ہے۔ خیر اللہ کا کرم ہوا کہ شادی کے سال بعد 2009ء میں عمر کی بھی شادی ہوگئی اور یوں گھر میں ایک سے دو لڑکیاں ہوگئیں۔ میری ذمہ داری میں تھوڑی سی کمی ہوگئی......

اب عثمان کی ضد تھی کہ مجھے کسی ملتانی لڑکی سے شادی کرنی ہے تو ماموں زاد بہن کی بیٹی سے عثمان کی شادی ہوگی۔ البتہ ابوبکر کی شادی کے لیے بہت خوار ہوئی۔ خیر اس کی بھی شادی ہوگئی۔ اب سب سے دلچسپ بات جو میں بتانا چاہتی ہوں وہ یہ کہ علی کی پہلی اولاد بیٹی ہوئی۔ مجھے بیٹی کی اتنی آرزو تھی کہ بیان سے

باہر ہے علی کی بیٹی ہوئی تو مجھے لگا کہ مجھے دو جہاں مل گئے ہیں اور میں نے اپنی زندگی کے حسین ترین دن اپنی پوتی کے ساتھ گزارے...... چھ ماہ تک میں نے اپنی پوتی عائشہ کو اپنے پاس رکھا اور ہر وقت اسے دیکھتی رہتی تھی پھر عمر کی بھی بیٹی ہوئی اور پھر سب کی بیٹیاں ہوئیں علی کی تین بیٹیاں ہیں۔

عمر کی چار بیٹیاں ہیں۔ عثمان کی دو بیٹیاں ہیں۔

میں سب کے لیے ماشاء اللہ ضرور پڑھتی ہوں...... اور نو پوتیوں کے بعد ابوبکر کے یہاں پہلی اولاد بیٹا ہوا ہے۔ تو یہ ہے۔" میری دادی بننے کی کہانی۔ لیکن سب مجھے "دادا" کہتے ہیں کیونکہ عائشہ نے جب بولنا سیکھا تو اس کے منہ سے پہلا لفظ "دادا" نکلا اور میں نے سب سے کہہ دیا کہ اس نے دادا کہا ہے تو سب دادا ہی کہیں گے۔ کوئی اس کو سمجھانے کی کوشش نہ کرے کہ یہ "دادا" نہیں "دادی" ہیں تو بس اب سب ہی مجھے "دادا" کہتی ہیں۔"

"چلیں جی ...... اب دوبارہ آپ کی فیلڈ کی طرف آتے ہیں۔ یہ بتائیے کہ پلاٹ اینڈ تک آپ کے ذہن میں آتا ہے یا پھر تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں؟"

"پلاٹ پورا ذہن میں نہیں آتا۔ میں پلاٹ نہیں سوچتی میں کردار کے بارے میں سوچتی ہوں۔ جب میں کردار کے بارے میں لکھوں گی تو کردار کی کہانی خود بخود بنتی چلی جاتی ہے، ہاں کوئی ایک جملہ کوئی ایک بات دل کو لگ جائے تو ایسا نہیں ہے کہ میں فوراً لکھنے بیٹھ جاؤں یا اس کو نوٹ کرلوں۔ نوٹ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ میں اسے بھول جاؤں...... ہاں وہ بات میرے ذہن میں رہ جاتی ہے۔ اور میرے ذہن میں جو بات رہ جاتی ہے، اس کا اثر کبھی بھی زائل نہیں ہوتا۔ میں اسے چھوڑ دیتی ہوں اور انتظار کرتی ہوں کہ کبھی یہ پوری طرح میرے سامنے آئے گی اور جب آہستہ آہستہ کردار کا پورا سیٹ اپ بن جاتا ہے میرے ذہن میں، تب میں اسے لکھنا شروع کرتی ہوں اور لکھنے کا وقت رات کا ہی ہوتا ہے۔ اور آپ یقین کریں کہ بیس پچیس سال سے میں ٹھیک طرح سے سوئی نہیں اور اب یہ عادت اتنی پختہ ہوگئی ہے کہ آج بھی یہ عالم ہے کہ مجھے رات کو مجھے نیند ہی نہیں آتی اور میں سوتی ہی نہیں ہوں۔ بس بیٹھی کچھ پڑھتی رہتی ہوں۔ یا پھر کچھ لکھ لیتی ہوں۔ بس یہی سب کچھ چلتا رہتا ہے۔"

"ناول مکمل ہونے میں کتنا ٹائم لگتا ہے؟"

"کئی ایسے ناولز ہیں جنہیں مکمل ہونے میں کچھ دیر لگی ہے۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اگر میری سوچی ہوئی کہانی آگے نہیں بڑھ رہی یا میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آگے کیا لکھوں تو میں کوئی دوسری کہانی شروع کردوں۔ ایسا نہیں ہوتا اور یہ میری بھی ایک طرح سے اپنے آپ سے ضد ہوتی ہے کہ جب تک اسے مکمل نہیں کرلوں گی، کوئی دوسری کہانی شروع نہیں کروں گی......

ہاں ایک اسٹوری ایسی ہے جو میں نے ایک ہی رات میں مکمل کرلی تھی۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ میرا بیٹا اس وقت میٹرک میں تھا اور اس کے اسکول کے شوز خراب ہوگئے تھے، تو اس نے کہا کہ میں کل اسکول نہیں جاؤں گا کیونکہ میرے شوز پھٹ گئے ہیں۔ اور اس وقت اسے شوز دلانے کے میرے پاس پیسے نہیں تھے چنانچہ اس رات کو میں نے ایک افسانہ لکھا۔ اسے صبح تک مکمل کیا۔ پھر اپنے بیٹے کو ساتھ لیا۔ آفس گئی۔ وہاں افسانہ بھی دیا اور پے منٹ بھی لی اور بیٹے کو ساتھ لے کر بازار گئی اسے شوز دلائے اور گھر آگئی بس جس دن یہ ساری کارروائی ہوئی، اسی دن اس کی اسکول سے چھٹی ہوئی تھی۔ اس کے بعد کبھی اس کو چھٹی نہیں کرنی پڑی۔"

"اتنی مشکلات اٹھائیں، اتنا کٹھن وقت دیکھا...... رومانس تو مشکل سے ہی لکھا جاتا ہوگا؟"

"نہیں، ایسا نہیں ہے۔ میرے لیے تو یہ بھی کہا جاتا ہے کہ میں رومانس اچھا لکھتی ہوں۔ لیکن میں نے کبھی حدود کراس نہیں کیں چاہے رومانس ہو یا کوئی بھی معاملہ ہو...... ایسی بات لکھتی ہوں اور اس انداز میں لکھتی ہوں کہ جو دوسروں پر تاثر چھوڑ جائے اور آپ کو بتاؤں

کہ رومانس لکھنے کے لیے پہلے میں غزلیں سنتی ہوں، اشعار پڑھتی ہوں۔ رومینٹک شاعری پڑھتی ہوں تو بس جو بات دل پر اثر کر جاتی ہے اور دل محبت سے لبریز ہو جاتا ہے، میرا تب میں رومینٹک پیراگراف لکھتی ہوں۔ تا کہ تاثر قائم رہے تو بہت ہی اچھی بات ہے۔ اور پڑھنے والا ایک بار نہیں بلکہ اس پیراگراف کو بار بار پڑھے ......اور ایسا ہوتا ہے اور میرے قارئین مجھے بتاتے ہیں کہ آپ نے جو یہ جملے لکھے ہیں میں نے بار بار پڑھے ہیں۔ یہ ایک شعوری کوشش ہے میری۔ اور آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ میرے مسودہ پر کسی کو بھی قلم (ایڈیٹنگ) چلانے کی ضرورت پڑی نہیں اور یہ بات آپ کو "امثل" بھی بتائیں گی۔ میری تحریریں جوں کی توں چھپ جاتی ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں بہت محنت سے لکھتی ہوں۔

ایک بار ریاض صاحب (محمود ریاض صاحب) میرا مسودہ پڑھ رہے تھے امثل کی عدم موجودگی میں کیونکہ وہ میرا مسودہ ریاض صاحب کو دے کر گئی تھیں۔ تو جب میں آفس گئی تو ریاض صاحب نے مجھ سے کہا "آپ کی تحریر کی زبان و بیان میں کہیں قلم چلانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔"

اور یہ چیز آج تک قائم ہے۔ اور میرا تو ایک جملہ بھی ادھر سے ادھر ہو جائے تو میں فون کر کے پوچھ رہی ہوتی ہوں کہ ایسا کیسے ہوا، تم لوگوں سے ہوا یا کتابت میں غلطی ہوئی ہے۔ تو کمپوزنگ میں غلطی ہو جائے تو ہو جائے، ایڈیٹر میرے مسودے پر قلم نہیں چلاتا۔ اللہ مجھے ہمت دیے رکھے کہ میں محنت سے لکھتی رہوں۔"

"ایک سوال کا جواب ادھورا رہ گیا تھا کہ ٹی وی پہ اس لیے نظر نہیں آتی آپ کی تحریریں کہ چینج ہو جاتی ہیں۔ تو دوبارہ کوشش کی کہ آپ کی تحریروں کو نہ بدلیں؟"

"نہیں، میں نے دوبارہ کوشش نہیں کی...... کیونکہ مجھے مزہ نہیں آیا کہ کہانی بدل دیتے ہیں......اور اب مجھے نہیں معلوم کہ ٹی وی پہ کون کون لکھ رہا ہے کیونکہ میں نے تو 2015ء سے ٹی وی دیکھنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ اور جب میں ٹی وی دیکھتی تھی تو مستقل چینلو سرچ کرتی رہتی تھی، تقریباً گیارہ بجے تک، تو ایک دن مجھے خیال آیا کہ میں یہ کیا کرتی رہتی ہوں؟ میں کیوں اپنا وقت ضائع کرتی رہتی ہوں اس چکر میں کہ مجھے میرے مطلب کا کوئی پروگرام نظر آ جائے۔ تو تقریباً سال دو سال کچھ اچھا دیکھنے کے چکر میں میرے ضائع ہو گئے۔ جس کا مجھے افسوس ہے۔ تو پھر میں نے ٹی وی کو طلاق دے دی اور ایک ساتھ تین طلاقیں دے دیں۔ (قہقہہ) اب سکون ہی سکون ہے۔

میں ٹی وی کو کچھ دے دیتی اور وہ تبدیل کر دیتے تو جواب دہ تو میں ہی تھی مجھے یاد ہے کہ ایک دن میں ملتان سے کراچی تک کا سفر کر رہی تھی تو سامنے نیوی کے ایک آفیسر بیٹھے تھے تو مجھ سے یونہی پوچھنے لگے کہ "آپ کا تعلق ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ سے ہے۔" میں نے کہا "نہیں، میں رائیٹر ہوں۔ کہنے لگے کہ آپ کا چہرہ بتا رہا ہے کہ آپ کچھ ہیں۔"

میں خاموش ہو گئی، تھوڑی دیر بعد انہوں نے کہا کہ "آپ میڈیا کے لیے بھی کچھ لکھتی ہیں؟"

میں نے انہیں بتایا کہ پہلے میں لکھتی تھی۔ مگر اب نہیں لکھتی انہوں نے وجہ پوچھی ......اور وجہ میں نے بتا دی تو کہنے لگے کہ پھر تو آپ کا "قد" چھوٹا ہو جاتا ہوگا......اور بالکل ٹھیک بات کی انہوں نے کہ میری کہانی کا "جو ڈرامہ بنتا ہے اس سے واقعی میرا قد چھوٹا ہو جاتا ہے۔ اسی لیے میں نے چھوڑ دیا۔ بس

سرورق کی شخصیت

ماڈل ...... انمول
میک اپ ...... روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی ...... موسیٰ رضا

میں جہاں ہوں، اللہ تعالیٰ میرے اس مقام کو قائم رکھے۔

خواتین ڈائجسٹ میں جو بھی رائٹرز لکھ رہی ہیں اچھا لکھ رہی ہیں اور کافی عرصے سے ڈائجسٹ پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ میں نے سال پہلے گھر تبدیل کیا ہے اور نیا ایڈریس میں لکھوا کے بھی آئی تھی۔ پھر میری آنکھوں کا بھی کچھ مسئلہ ہو گیا...... آنکھوں کا آپریشن ہوا ایک آنکھ ڈاکٹر نے کچھ خراب کر دی۔ تو جب پڑھتی ہوں تو چکر سے آنے لگتے ہیں اس لیے اب پڑھنا کافی کم ہو گیا ہے تو خواتین اچھے افسانے لکھ رہی ہیں۔ بس اب ٹرینڈ بدل گیا ہے...... اب بھی کسی رومینٹک اسٹوری کی ضرورت پڑے تو امتل مجھ سے کہتی ہے کہ نگہت بس میں اب تنگ آ گئی ہوں۔ اب آپ مجھے اچھی سی رومانٹک اسٹوری لکھ کر دیں۔"

"معاوضہ اچھا ملتا ہے...... آپ ڈیمانڈ کرتی ہیں یا جو ملتا ہے قبول کر لیتی ہیں؟"

"میں دوسروں کے بارے میں تو کچھ نہیں جانتی لیکن میں اپنے بارے میں ضرور بتاؤں گی کہ میں نے جتنی محنت کی ہے، اس کے حساب سے مجھے ٹھیک معاوضہ ملا ہے۔ میں اپنی محنت کے حساب سے معاوضہ لیتی ہوں۔ میں نے کبھی زیادہ کی ڈیمانڈ ہی نہیں کی میں صرف اپنی محنت کا معاوضہ لیتی ہوں۔ اور میں بتا دیتی ہوں کہ اس پر اتنی محنت کی ہے میں نے اور اپنی محنت کا میں اتنا معاوضہ لوں گی...... اور اللہ کا شکر ہے کہ مجھے کسی نے انکار بھی نہیں کیا۔ جتنا مانگا مل گیا۔"

"افسانوں کی لڑکیاں حقیقی دنیا میں کم ہی نظر آتی ہیں؟"

"میں تو لکھتی ہی حقیقی دنیا کی لڑکیوں کے بارے میں ہوں۔ آپ غور کریں تو آپ کو میری کہانیوں میں کبھی یہ بات نظر نہیں آئے گی کہ اس نے فلاں جیولری پہنی تھی، اس نے ساڑھی باندھی ہے یا فلاں رنگ کے کپڑے پہنے ہیں۔ میں ایک نارمل زندگی دکھاتی ہوں اپنے افسانوں میں یا اپنی تحریروں میں۔ جس زمانے میں میں بس میں سفر کیا کرتی تھی تو مجھے بڑے اچھے کردار مل جاتے تھے۔ اب جب سے بس کا سفر چھوڑا ہے تو پتا نہیں کردار کہاں کھو گئے ہیں۔ آس پاس کے کردار دیکھتی ہوں تو اتنے مشکل ہوتے ہیں کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انہیں کہاں سے پکڑوں اور کہاں پر چھوڑوں۔"

"نجی زندگی کی کیا مصروفیات ہیں آپ کی؟"

"اب تو میں فارغ ہو گئی ہوں ساری ذمہ داریوں سے، میری بہوؤں نے مجھے فارغ کر دیا ہے (قہقہہ) ہے تو یہ بہوؤں کی محبت لیکن میرے لیے نقصان دہ ہے کیونکہ نہ وہ مجھے کھانا پکانے دیتی ہیں نہ ہی کوئی کام کرنے دیتی ہیں۔ یہ تو ان کی محبت ہے مگر مجھے لگتا ہے کہ میں بالکل ڈل ہو گئی ہوں اور میرے لیے اب زندگی میں کچھ نہیں رہا بس جو کرنا تھا کر لیا سچ بات تو یہ ہے کہ اب تو زندگی سے اکتاہٹ سی ہونے لگی ہے۔"

"جوائنٹ فیملی ہے آپ کی؟"

"پہلے ہم سب ساتھ ہی گھر میں رہتے تھے۔ اب ماشاء اللہ سے سب کی اپنی فیملیز ہو گئی ہیں تو گزشتہ سال ہم نے تین گھر لے لیے ہیں، ایک علی کا ایک عمر کا اور ایک گھر میں عثمان، ابوبکر اور میں رہتی ہوں ان دونوں کی فیملیز کے ساتھ۔ فارغ بیٹھنا مجھے اچھا نہیں لگتا، لکھائی کے علاوہ مجھے سلائی بھی آتی ہے اور اب سردیاں شروع ہوں گی تو میرے ہاتھ میں اون سلائیاں بھی آ جائیں گی۔ اگر کرنے کو کچھ نہ ہو تو پھر بوریت انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو پھر میں کہتی ہوں کہ "بس بہت زندہ رہ لیا، اب مرنا جانا چاہیے۔" میری پوتیاں ہیں تو ان کے فراک سینے میں مجھے بہت مزہ آتا ہے۔ اور اپنی بوریت کو ختم کرتی ہوں سلائی کے ذریعے اور فریش ہو جاتی ہوں۔ تو میری الماری میں ایک دو جوڑے ان سلے ضرور پڑے ہوتے ہیں کہ نہ جانے کب مجھے بوریت کا دورہ پڑے تو کوئی کام ہو کرنے کے لیے۔"

کھانا زیادہ تر خود ہی پکاتی ہوں...... اور میں نے کبھی بازار کے مسالہ جات استعمال نہیں کیے۔ میں ہمیشہ گھر کے مسالوں سے کھانے پکاتی ہوں اور ماشاء اللہ بہت اچھے پکتے ہیں۔ آپ بھی سائرہ غلام نبی سے میرے کھانوں کے بارے میں پوچھیے گا۔ ایک بار میں نے کھانے پر بلایا تھا سب رائیٹرز کو تو سائرہ غلام نبی ہر نوالے پر کہتی تھی کہ "مجھے حیرت ہو رہی ہے کہ نگہت اتنا اچھا کھانا کیسے بنا لیتی ہیں۔"

سیاحت کا مجھے بے انتہا شوق ہے اور شروع سے ہی سفر میں ہوں۔ کبھی اس شہر تو کبھی اس شہر اور جب کبھی بہت زیادہ وقفہ آ جائے تو بے چینی ہونے لگتی ہے کہ کہیں جانا چاہیے اور جانا کہاں ہوتا ہے ملا کی دوڑ مسجد تک...... مجھے ملتان جانا ہوتا ہے اور میں چلی جاتی ہوں۔ بہت بور ہوتی ہوں تو علی سے کہتی ہوں کہ مجھے شہر کا ایک راؤنڈ لگوا دو......

اور ایک بات اور سفر کے دوران مجھے بولنا پسند نہیں ہے کوئی مجھ سے بات نہ کرے اور چونکہ علی میری اس عادت سے واقف ہے تو وہ تمام سفر میں مجھ سے بات نہیں کرتا......اور جیسے "آگ کا دریا" میں رائیٹر نے لکھا تھا کہ ایک دنیا میں کتنی دنیائیں ہیں تو اس طرح میں بھی سفر میں کتنی دنیائیں دیکھتی رہتی ہوں۔ سفر میں تصوف سے ایک تعلق قائم ہو جاتا ہے اور اس تصوف میں مجھے کسی کی مداخلت پسند نہیں ہے۔ اس لیے مجھے سفر کا شوق بھی بہت ہے اور خاموشی بھی پسند ہے۔

اس کے ساتھ ہی ہم نے نگہت عبداللہ صاحبہ سے گفتگو کا اختتام کیا اس شکریہ کے کہ انہوں نے ہمیں وقت دیا۔ اور آخر میں ہم ایک بات کے لیے نگہت عبداللہ صاحبہ سے معذرت چاہیں گے۔ انہوں نے ملتان کے قریب جس قصبے کا نام بتایا وہ "قبلہ" نہیں بلکہ "پپلاں ہے" اور ہم نے اسے ہر جگہ لکھا...... "پپلاں" ایک خوب صورت قصبہ ہے۔

خواتین ڈائجسٹ میں راحت جبیں کے قسط وار چھپنے والے خوب صورت ناولز

زرد موسم



قیمت -/1000 روپے
25% ڈسکاؤنٹ
قیمت -/750 روپے

تتلیاں پھول خوشبو



قیمت -/300 روپے
25% ڈسکاؤنٹ
قیمت -/225 روپے

پاکستان میں کہیں بھی بذریعہ ڈاک منگوائیں ڈاک خرچ فری

منگوانے کا پتہ
مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی
فون نمبر: 021-32216361

احمد رندھاوا سے باتیں

شاہین رشید

1۔ ''اصلی نام؟''
''احمد رندھاوا۔ رندھاوا ہماری کاسٹ ہے۔''
2۔ ''پیار کا نام؟''
''کوئی خاص نہیں۔ سب مختلف ناموں سے اور اپنی مرضی سے بلاتے ہیں۔''
3۔ ''تاریخ پیدائش/سال؟''
''19 فروری''
4۔ ''قد/ستارہ''
''5 فٹ 10 انچ''
5۔ ''مادری زبان؟''
''اردو اور پنجابی''
6۔ ''بہن بھائی آپ کا نمبر؟''
''دو بڑی بہنیں پھر میرا نمبر اور پھر ایک چھوٹا بھائی۔ یعنی دو بہنیں اور دو بھائی...... میرا نمبر تیسرا ہے۔''
7۔ ''شادی؟''
''ابھی تک تو نہیں ہوئی۔''
8۔ ''تعلیم''
''سول انجینئرنگ میں — بیچلر کیا ہے میں نے Nust یونیورسٹی سے۔''
9۔ ''شوبز میں آمد/ گھر والوں کا ردعمل؟''
''بچپن سے شوق تھا۔ مگر ہمت نہیں ہوتی تھی کہیں جانے کی۔ اور جب ہمت آئی تو پھر آ گیا فیلڈ میں/ گھر والے شروع میں تھوڑا پریشان ہوئے لیکن پھر بعد میں مان گئے۔''
10۔ ''بچپن میں کس سے بہت ڈر لگتا تھا؟''
''پڑھائی میں اچھا نہیں تھا۔ تو بس ڈر لگتا تھا۔ ڈانٹ سے۔''
11۔ ''پہلی کمائی کتنی تھی۔ کس کے ہاتھ میں رکھی تھی؟''
''25 ہزار۔ امی کے ہاتھ میں رکھی تھی۔''
12۔ ''بچپن کا پہلا پیار؟''
''پڑوس کی ایک لڑکی تھی اس سے پیار ہوا تھا۔ اس وقت وہ نو سال کی تھی اور میں بارہ سال کا تھا۔''
13۔ ''آپ کا سورج کب نکلتا ہے؟''
''چھٹی کے دن گیارہ بارہ بجے۔ اور کام کے دن جب کام ہو تب۔''
14۔ ''صبح کیا نہ ملے تو صبح نہیں ہوتی؟''
''چائے''
15۔ ''کیا برداشت نہیں بھوک یا غصہ؟''
''دونوں ہی برداشت کر لیتا ہوں۔ اللہ کا شکر ہے۔''
16۔ ''پاکستان کے لیے کیا سوچتے ہیں؟''
''یہی کہ اس قابل ہو جاؤں کہ اپنے ملک کے لوگوں کو کوالٹی انٹرٹینمنٹ دے سکوں......''
17۔ ''کسی بھی شعبے کی کوئی پسندیدہ شخصیت؟''
''جبران ناصر۔ یہ کراچی کے ایک بہت ہی قابل لائر اور ایکٹوسٹ ہیں۔ کسی سیاسی پارٹی سے ان کا تعلق نہیں ہے۔ آزاد الیکشن لڑتے ہیں۔''
18۔ ''کس ملک کی شہریت لینے کی خواہش ہے؟''
''کسی بھی ملک کی نہیں۔ اپنا ملک اپنا ہی ہوتا ہے۔''
19۔ ''آج کل کیا آن ایئر ہے، کیا انڈر پروڈکشن ہے؟''
''بچھو'' آن ایئر ہے، اس کے علاوہ گرین ٹی وی کے دو پروجیکٹ انڈر پروڈکشن ہیں۔''

20۔ ”شوبز میں کیا اچھا ہے، کیا برا ہے؟“
”اچھی بات تو یہ ہے کہ اداکاری کرنے کا موقع ملتا ہے اور برا تو ابھی تک کچھ بھی نہیں لگا۔“
21۔ ”اسپورٹس سے آپ کا لگاؤ؟ کون سا کھیل پسند ہے؟“
”تقریباً سب ہی کھیل دیکھنا اور کھیلنا پسند ہیں، سب سے زیادہ کرکٹ سے لگاؤ ہے۔“
22۔ ”کس بات پر آپ کی آواز اونچی ہو جاتی ہے؟“
”کسی پر ظلم ہو رہا ہو تو آواز اونچی ہو جاتی ہے۔“
23۔ ”تین چیزیں جنہیں خریدنا آپ کا خواب ہے؟“
”اللہ نے سب کچھ دیا ہوا ہے۔ پھر بھی خواہشیں تو بہت ہیں۔“
24۔ ”کس کے کہنے پر شوبز چھوڑ سکتے ہیں؟“
”والدین کے کہنے پر۔“
25۔ ”پہلی بار کیمرے کا سامنا کیا تو؟“
”بہت گھبرایا ہوا تھا۔“
26۔ ”تنہائی کا احساس کب ہوتا ہے؟“
”جب کام کے سلسلے میں کراچی آتا ہوں۔ تو پھر تنہائی کا احساس ہوتا ہے۔“
27۔ ”گھر کی کوئی چیز خراب ہو جائے تو ٹھیک کرانے کی ذمہ داری کس کی ہے۔“
”والد صاحب کی۔“
28۔ ”زندگی میں کچھ واپس ملنے کا چانس ملے تو آپ کیا واپس لینا چاہیں گے؟“
”لڑکپن“
29۔ ”گھر میں آپ کے فیصلے میں مداخلت کون کرسکتا ہے؟“
”کوئی بھی نہیں۔“
30۔ ”بیمار ہونے پر بیماری کو سیریس لیتے ہیں؟“
”بالکل بھی نہیں۔“



31۔ ”آپ کے اب تک کے ڈراموں کی تعداد/ کمرشل/ فلمز؟“
”تین ڈرامے کیے ہیں۔ ایک شارٹ ٹیلی فلم اور پانچ، چھ کمرشلز کیے ہیں۔“
32۔ ”رول کون سے اچھے لگتے ہیں نگیٹو یا پوزیٹو؟“
”دونوں ہی انجوائے کرتا ہوں۔“
33۔ ”ادب سے آپ کا لگاؤ۔ کس کو زیادہ پڑھا۔“
”لگاؤ بہت ہے۔ اور تقریباً سب کو ہی پڑھا ہے۔ اب ذرا ٹائم کم ملتا ہے۔“
34۔ ”کوئی فیصلہ جو غلط ثابت ہوا ہو؟“
”بہت سارے فیصلے غلط ثابت ہوئے۔ لیکن غلطیاں ہی صحیح راستے پر لے کر آتی ہیں۔“
35۔ ”کچن سے لگاؤ۔ کبھی شیف بننے کا خیال آیا۔“
”شیف بننے کی خواہش تو نہیں ہوئی۔ البتہ میں کھانا پکانا سیکھنا چاہتا ہوں۔“
36۔ ”کبھی سوچا کہ سوشل میڈیا نہ ہوتا؟“

"بالکل سوچا۔ شاید زندگی آسان ہوتی۔"

37۔ "کس شخصیت پر چاہتے ہوئے بھی غصہ نہیں اتار سکتے؟"

"اپنی نانی پر۔"

38۔ "کس بدلنے کا موقع ملے تو کس کی طرح نظر آنا چاہیں گے۔"

"کسی کی بھی طرح نہیں۔ الحمدللہ۔ اللہ نے جیسا بنایا ہے میں اس پر خوش بھی ہوں اور شکر بھی کرتا ہوں۔"

39۔ "ایک نصیحت جو سب کو کرتے ہیں۔"

"دل کے راستے پر چلو اور کبھی کسی کو تکلیف مت پہنچاؤ۔"

40۔ "ملک کی ترقی کی راہ میں کون رکاوٹ ہے۔ حکمران یا عوام؟"

"دونوں ہی۔ دونوں ہی قصوروار ہیں۔"

41۔ "کبھی غربت میں دن گزارے؟"

"الحمدللہ نہیں۔"

42۔ "طالب علمی کے دور میں کون سا مضمون برا لگتا تھا؟"

"کمپیوٹر۔"

43۔ "ڈاکٹر، حکیم اور ہومیو پیتھک۔ بیماری کے وقت آپ کا انتخاب؟"

"ڈاکٹر۔"

44۔ "دنیا کا سب سے بورنگ کام؟"

"کوئی بھی نہیں، ہر کام کو دلچسپی بنانے کی کوشش کرتا ہوں۔"

45۔ "کیا دل سے اترا ہوا انسان دوبارہ اپنی جگہ بنا سکتا ہے؟"

"بہت مشکل ہے لیکن اگر انسان کوشش کرے تو ہو بھی سکتا ہے۔"

46۔ "اپنے کام کے لیے کس سے مشورہ لیتے ہیں؟"

"اپنے دل سے۔"

47۔ "موجودہ حکومت سے مطمئن ہیں؟"

"کچھ خاص نہیں۔"

48۔ "ایمرجنسی میں کیا اچھا بنا لیتے ہیں؟"

"سینڈوچ"۔

49۔ "غصے میں منہ سے کیا نکلتا ہے؟"۔

"کوشش کرتا ہوں کہ غصے کے وقت کچھ نہ بولوں۔"

50۔ "ٹی وی ٹاک شو کے بہترین اینکر پرسن؟"

"کوئی خاص پسند نہیں ہے۔"

51۔ "آپ کے رازدار؟"

"امی اور کچھ قریبی دوست۔"

52۔ "فیملی پر آپ کا کتنا رعب ہے"

"رعب کسی پر نہیں ہے۔ بلکہ سب سے دوستی ہے۔"

53۔ "کون سی تاریخیں یاد رکھتے ہیں؟"

"قریبی لوگوں کی سالگرہ کی تاریخیں۔"

54۔ "ایک کھانا جو ہر وقت کھا سکتے ہیں؟"

"پلاؤ۔"

55۔ "اپنی پرفارمنس میں کیا کمی نظر آتی ہے؟"

"بہت ساری خامیاں اور کمیاں نظر آتی ہیں۔"

56۔ "اپنا ڈرامہ دیکھ کر کیا سوچتے ہیں؟"

"جیسا کیا ہے اس سے بہتر کر سکتا تھا یا کیا جا سکتا تھا۔" مثلاً کچھ جگہوں پر ٹھہراؤ نہیں ہوتا۔"

57۔ "ایک غلطی جس پر کبھی معافی نہیں مانگتے"

"کوئی خاص نہیں۔ اگر دوسرے کو میری کوئی بات بری لگے تو معافی مانگ لیتا ہوں۔"

58۔ "پہلی فلم جو سینما میں دیکھی؟

"The Mummy"، دی ممی"

59۔ "بچپن میں کس وجہ سے مار کھاتے تھے؟"

"میرے والدین بچوں کو مارنے کے قائل نہیں ہیں بلکہ بہت خلاف ہیں۔ اس لیے بہت ہی کم مار پڑی بچپن میں۔"

60۔ "کون سا رول کرنے کی خواہش ہے؟"

"مجھے کامیڈی رول کرنے کی بہت خواہش ہے۔ دیکھیں کب پوری ہوتی ہے۔"

61۔ "آپ کا نا قابل فراموش کردار؟"

"تھیٹر کی ایک پرفارمنس تھی۔ اب تک کی سب سے اچھی وہی لگتی ہے۔"

62۔ "کیسا رول کو کرنے سے انکار کیا؟"

"ڈیٹ نہ ہونے کی وجہ سے کچھ رولز نہیں کر پایا۔ ورنہ کسی کردار کی وجہ سے انکار نہیں کیا۔"

63۔ "کس سیاست دان کا رول کرنے کی خواہش ہے؟"

"ذوالفقار علی بھٹو۔"

64۔ "علم نجوم پر کتنا یقین ہے، کبھی نجومی کو ہاتھ دکھایا؟"

"بالکل یقین ہے دو تین بار ہاتھ دکھایا بھی ہے۔"

65۔ "کس کام کو کرنے کے لیے بہت سوچتے ہیں؟

"کسی کو منہ بلانے پر۔"

66۔ "کن چیزوں پر پیسہ اڑا دیتے ہیں؟"

"گھر والوں اور کپڑوں پر اڑا دیتا ہوں پیسہ۔"

67۔ "آئینے کو کتنا وقت دیتے ہیں؟"

"بہت زیادہ۔"

68۔ "کیا شادی کرنا ضروری ہے؟"

"ہاں...... اگر کوئی دل سے پسند ہو تو۔"

69۔ "اپنا گزرا کل سوچ کر کیا احساسات ہوتے ہیں؟"

"یہی کہ جو کچھ میں نے اپنے ماضی میں فیس کیا ہے۔ وہ مجھے آج یہاں لے کر آیا ہے۔"

70۔ "سگنل پر کھڑے ہو کر کس چیز کا جائزہ لیتے ہیں؟"

"اپنے خیالوں میں رہتا ہوں۔ ارد گرد کی چیزوں پر کم ہی دھیان دیتا ہوں۔"

71۔ "بچپن میں کون سے فنکار پسند تھے؟"

"شاہ رخ خان۔"

72۔ "بچپن میں کون سے گیمز کھیلے؟

"کرکٹ، فٹ بال، بیڈمنٹن، ٹیبل ٹینس، بس یہی گیمز کھیلے۔

73۔ "شاپنگ کے لیے نکلتے ہیں تو سب سے پہلے کس کا خیال آتا ہے؟"

"اپنی جیب کا۔"

74۔ "کب ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کرتے ہیں؟"

"جب شوٹ پر کوئی سین بہت اچھا ہو جائے۔ یا پھر جب دوستوں کے ساتھ کسی ٹرپ پر ہوتا ہوں تو۔"

75۔ "کبھی چھپ چھپ کر دوسروں کی باتیں سنی ہیں؟"

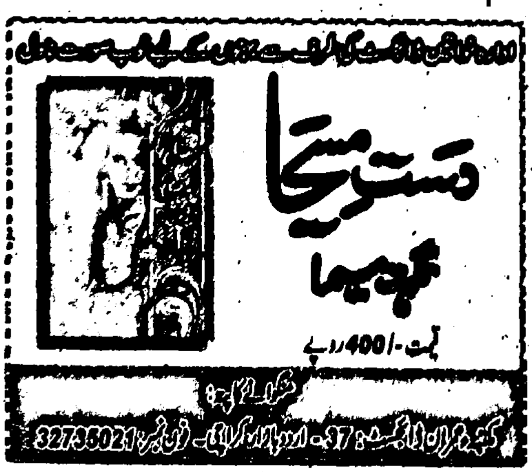
"نہیں کبھی نہیں۔"

76۔ "اپنی کمائی کس پر خرچ کرتے ہیں؟"

"گھر والوں پر اور کھانے پینے پر۔"

77۔ "کس طرح کے کام کرنے میں مشکل ہوتی ہے؟"

"گاڑیوں کی ریپئرنگ کرانا اور میکینکس والے کام۔"



78۔ ''کس کا انٹرویو کرنے کی خواہش ہے؟''
''شاہ رخ خان کا۔''
79۔ ''کیا آپ کے اندر بھی ایک ولن ہے؟''
''بالکل۔''
80۔ ''آپ کے گھر میں کون اس فیلڈ میں ہے یا آنا چاہتا ہے؟''
''کوئی نہیں ہے سوائے میرے اور نہ ہی کسی نے آنے کا اظہار کیا۔''
81۔ ''بچت کس شکل میں کرتے ہیں؟
''ابھی تک تو بالکل بھی نہیں کی۔''
82۔ ''شادی میں کن رسموں کے خلاف ہیں؟''
''جہیز کی۔''
83۔ ''کون سا کھانا زہر مار کر کے کھاتے ہیں؟''
''سبزیوں والا۔ جیسے کدو اور ٹینڈے وغیرہ۔''
84۔ ''آج کے لیے فکر مند رہتے ہیں یا کل کے لیے؟''
''کل کے لیے۔''
85۔ ''صبح اٹھتے ہی کیا بات لبوں سے نکلتی ہے؟''
''کوئی خاص نہیں۔''
86۔ ''گھر میں کون غصے کا تیز ہے''
''والد صاحب۔''
87۔ ''آپ کی کس بات سے گھر میں والدین ناراض ہوتے ہیں؟
''رات کو دیر سے گھر آنے پر ناراض ہوتے ہیں۔''
88۔ ''بچپن کا کون سا خواب پورا نہیں ہوا؟''
''فوج میں جانے کا۔''
89۔ ''پسندیدہ تہوار؟''
''بسنت۔''
90۔ ''جانوروں میں پسندیدہ جانور؟''
''بھیڑیا۔''
91۔ ''کن باتوں پر موڈ خراب ہو جاتا ہے؟''
''جب کوئی دوسروں پر اپنی رائے مسلط کرتا ہے۔''
92۔ ''ایک چیز جو نشے کی حد تک پسند ہے؟''
''چائے۔''
93۔ ''مہینے میں کتنی بار گھر سے باہر کھانا کھاتے ہیں؟''
''کراچی میں ہوتا ہوں تو ہر روز ہی باہر سے کھانا ہوتا ہے۔ لاہور میں ہوتا ہوں تو ہفتے میں دو تین بار جانا ہوتا ہے۔''
94۔ ''بجلی کی بچت کس طرح کرنا چاہیے؟''
''بچت تو غیر ضروری چیزوں کو بند کر کے ہی کی جاسکتی ہے۔ لیکن اس سے بھی بہتر ہے کہ گھر میں سولر پینلز لگوائے جائیں تاکہ اپنی ضرورت کی بجلی خود بنا سکیں۔''
95۔ ''کھانا میز پر، بیڈ پر یا چٹائی پر کھاتے ہیں؟''
''ڈائننگ ٹیبل پہ کھانا پسند ہے۔''
96۔ ''گھر میں کس کے لیے اپنا شیڈول بدل سکتے ہیں؟''
''اگر کام ضروری نہ ہو تو سب کے لیے بدلا جاسکتا ہے۔''
97۔ ''اچھی، بری خبر پہلے کس کو سناتے ہیں؟''
''اچھی خبر ہو تو پورے گھر والوں کو اور اگر بری ہو تو پھر قریبی دوستوں کے ساتھ شیئر کرتا ہوں۔''
98۔ ''اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟''
''خدانخواستہ زوال آگیا تو پھر مزید محنت کروں گا۔''



نادرہ خاتون

خط بھجوانے کے لیے پتا۔
خواتین ڈائجسٹ۔37۔اردو بازار کراچی۔
Email:Info@khawateendigest.com

عائشہ طاہر......ساہیوال

میں بچپن سے ہی ماہنامہ شعاع اور خواتین ڈائجسٹ پڑھتی ہوں چونکہ بچپن سے پڑھتی آرہی ہوں اس لیے کہانیاں لکھنے کا بھی بہت شوق ہے۔آپ تعاون کریں تو میرا یہ شوق پورا ہوسکتا ہے۔

ج: پیاری عائشہ! آپ کو کہانیاں لکھنے کا شوق ہے تو آپ کہانی ضرور لکھیں جس طرح خط لکھا ہے اس طرح کہانی بھی لکھ کر بھجوادیں۔ویسے آپ کے خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کو ابھی بہت محنت کی ضرورت ہے۔

انیلا قیصر گل...... چک نمبر 80/10R ڈسٹرکٹ خانیوال

میرا تعلق نچلے طبقے سے ہے (جسے آپ لوئر مڈل کلاس کہتے ہیں) سوئے اتفاق پڑھی لکھی بھی ہوں (اگرچہ بہت نہیں) گاؤں کی رہائشی ہوں۔اسکول میں ملازمت کرتی ہوں ماہانہ پانچ ہزار پر۔دو ماہ کی چھٹیاں ہوئیں تو سب سے پہلے یہی پریشانی کہ بچوں کے ساتھ دو ماہ بغیر پیسوں کے کیسے نکالوں گی (ہمارے اسکول والے چھٹیوں کی تنخواہ نہیں دیتے) گوکہ تعلیمی اخراجات ان دنوں نہ ہونے کے برابر ہیں پر پھر بھی......اور کچھ سجھائی نہ دیا تو کڑھائی کرنا شروع کردی کہ چلو جو بھی آئے گا گزر اوقات ہوہی جائے گی (مزے کی بات جب خواتین ملا جون کا تو سرورق پر موجود ماڈل کے سوٹ والی ہی کڑھائی کررہی تھی ان،ویسے میرا کام زیادہ نیٹ ہوتا ہے،ہاہاہا اعتماد) اب یہ مت سمجھے گا کہ میرے شوہر کماتے نہیں (ہے تو یہ سچ ویسے) کمانے میں پر جب موڈ بنے تو ورنہ...... آپ کو یہ سب بتانے کا مقصد آپ کی ہمدردی وصولنا ہرگز نہیں تھا (گوکہ ہمدردی بھی ہوہی جاتی ہے ہی ہی ہی ......) بتانے کا مقصد صرف یہ اتنی کم تنخواہ میں تین بچے اور چوتھی میں خود۔مجھے سب کرنا ہوتا ہے۔تو یقین کریں اپنا رسالوں کے 240/ نکالنا بھی جوئے شیر لانے کے مترادف لگتا ہے۔یہ تو نہیں کہ ہر بار رسالے مجھے ہی لینے پڑتے ہیں،کبھی شایان (چھوٹی بہن) تو کبھی باجی منور لے لیتی ہیں پر جب لینے پڑیں تو مجھے آپ سے ایک شکایت ہے اور وہ ہے رسالوں کے کاغذ کی۔براہ کرم کچھ کریں۔ سب سے پہلے تو راحت جبیں کو ناول کامیابی سے ختم کرنے پر ڈھیروں مبارکاں جہاں ناول کے مکمل ہونے کی خوشی،وہیں یہ اداسی کہ خدا جانے اب کب جلوہ افروز ہوں گی راحت آپی۔میرا پسندیدہ ترین ناول تھا بس ایک کسک محسوس ہوئی اختتام میں کہ کیا تھا اگر راحت آپی مراد اور زرمین کو رشتہ ازدواج میں منسلک دکھا دیتیں۔

"دانہ پانی" عمیرہ احمد کیا تعریف کروں زبردست لاجواب تحریر۔"کوئے یار سے نکلے" عنیزہ سید بلاشبہ بہترین تحریر پر زارا کا رویہ حد سے بڑھی حساست کے علاوہ کچھ نہیں لگا۔جبکہ معید تو ملوث بھی نہ تھا۔خیر مجموعی طور پر کہانی اچھی تھی۔

شمارے میں موجود واحد ناولٹ مٹی کے مکین ذرا برابر متاثر نہ کرسکا۔مجھے تو حیرت ہوئی عرشیہ کی ماں پر جو

بیٹی کی حالت نہ سمجھ سکی مائیں تو بن کہے جان جاتی ہیں اور انہوں نے بیٹی کے منہ سے سن کر بھی یقین نہیں کیا۔ خود غرض بس سوسو ہی تھا۔ ہم زاد کا دکھ بھی کچھ خاص نہ لگا۔ بے معنی لکیریں ٹھیک تھا۔ ارے ہاں یاد آیا شاہین رشید کا بہت شکریہ ہر ماہ ایک لکھاری سے ملاقات کروانے کا۔ نظمیں، غزلیں دونوں اچھی تھیں اعتبار ساجد میرے بہت پسندیدہ شاعر ہیں۔

مجھے ہمارے نام بہت پسند ہے۔ ایک عجیب سا رشتہ ناتا محسوس ہوتا ہے خط لکھنے والی بہنوں کے ساتھ اور بہت مزے کا لگتا ہے ایک بہن کا کسی بہن سے خط میں کچھ پوچھنا اگلے ماہ دوسری بہن کا جواب دینا یوں لگتا ہے وقت لمحات کی انگلی پکڑے الٹی سمت میں چلنا شروع ہوگیا۔ اور ہمیں وہاں لے گیا جہاں اپنے پیاروں کے حال احوال کا موثر ترین ذریعہ خطوط ہی ہوا کرتے تھے۔ اپنے پیاروں کو خط لکھنا پھر جواب کا انتظار۔ بہت خوب صورت دور تھا جو چھوٹ گیا۔

اب آؤں گی اس کہانی کی طرف جس نے قلم اٹھانے کی جرأت دی (ورنہ تو میں اگلے بائیس سال بھی خاموشی سے گزار دیتی)۔ ''مالا'' نمرہ احمد، بلاشبہ لاجواب تحریر تعریف کرنا گویا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ جب مالا شروع ہوا اور اس میں کیف اور ماہر کی حقیقت آشکار ہوئی تو میں نے شایان سے کہا ''شانی میں تو خود بھی سوچ رہی تھی ایک ناکام بندہ ہیرو کیسے ہوسکتا ہے۔''

ج: پیاری انیلا! ہمدردی تو انسانیت کے ناتے کسی بھی ایسے انسان سے ہوسکتی ہے جو مشکلات کا شکار ہو لیکن سچ کہیں آپ کے حالات جان کر ہمیں آپ کی ہمت اور حوصلہ پر پیار آیا۔ کیونکہ اتنی محنت کے باوجود آپ کی خوش مزاجی برقرار ہے۔ آپ محنتی ہیں باصلاحیت ہیں ان شاء اللہ مشکل وقت جلد گزر جائے گا۔

بہت کم لوگ ہوتے ہیں جن کی زندگی آرام وسکون کے ساتھ گزرتی ہے۔ ہمارے ہاں اکثریت ایسی ہی زندگی گزار رہی ہے۔ ایک پانچ ہزار کمانے والا تو ماچس کی ڈبیہ پر بھی ٹیکس ادا کر رہا ہے اور.....

آپ کے کاغذ خراب ہونے کی شکایت کر رہی ہیں۔ یہاں تو کاغذ ملنے کے ہی لالے پڑے ہیں۔ آپ پچھلے بائیس سال سے خواتین کی قاری ہیں تو اس سے پہلے اپنی رائے کا اظہار کیوں نہیں کیا۔

گوشی جمال.....منڈی یزمان

گڈی آپا کے پسندیدہ کلر میں ملبوس ماڈل ''خوشی'' طوطا بنی بے حد متاثر کر گئیں۔ کھلتے ہوئے سبز اور وائٹ کلر میں ٹائٹل گرمیوں کے لحاظ سے دیدہ زیب لگا سبزہ کسی بھی شکل میں ہو چاہے سبزیاں یا فصلیں سب ہی دل کو بھاتے ہیں۔ اینڈ پر اسپغول کے چھلکے کا اشتہار دیکھ کر چھوٹی آپا کو فوراً یاد آگیا کہ ننھی عنایہ کو یہ کھلانا تھا صبح سے اس کے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے تھے۔ پسند اس کی ساری دیسی خوراک ہے۔ پورا پورا انصاف کرتی ہیں دونوں ماں بیٹی۔ کافی دنوں سے ان کا پڑاؤ ادھر ہی ہے۔

''کرن کرن روشنی'' بہت سے مسائل سے آگاہی کا سلسلہ، ''ساری کہانی خوب صورت ہے'' مصنفین کے ٹولے سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری بہت اچھا لگ رہا ہے۔ انٹرویو میں اپنی پسندیدہ شخصیت نگہت عبداللہ سے ملاقات بہت خوب رہی۔ آج ان کو دیکھ بھی لیا۔ بہت گریس فل خاتون، ایاز سموں جو شکل وصورت میں سکینہ سموں سے بہت مماثلت رکھتے ہیں۔ موصوف کی راز داریاں سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ''جو کوئے یار سے نکلے'' عیزہ سید جی کی تحریر نے مجھے سوچوں میں ڈال دیا۔ سادہ اور جامع الفاظ سے گندھی عمدہ تحریر۔ ''زندگی ہم تجھے گزاریں گے'' ہائیں!! آخری قسط؟ میثوں پتہ نئیں لگیا۔ اک حسین ناول کا دلفریب اختتام بھئی مصروفیت تو میں نے آپ لوگوں سے شیئر کی ہی نہیں کچھ عرصہ پہلے میں نے گلی کے نکڑ پر ٹک شاپ کھول لی ہے جو پہلے وقتوں میں بڑے بھائی نے بنائی تھی پھر شادی کے بعد ان کا شوق پورا ہوگیا اور دکان پر تالے پڑ گئے اور وہ زمین داری میں مشغول ہوگئے بھابھی کے اصرار پر۔ بیس سال بعد اس دکان کے پھر سے بھاگ جاگ گئے اور اب کی بار یہ بیڑہ میں نے اٹھالیا۔ کسی کی باتوں کی پرواہ کیے بغیر۔ چھوٹے بھائی نے سپورٹ کیا اور ساتھ مل کر سٹر رنگ روغن کروائے

اور تھوڑا فرش کو بازار سے اونچا کرلیا۔ ماشاء اللہ سپر اسٹور کے نام سے محلے کی دکان ہے۔ سب لوگ عزت کرتے ہیں اور ماشاء اللہ سے بہت چل رہی ہے۔ گھر کے حالات میں ہر وقت کی لڑائی اور بے زاری سے تنگ آکر مصروفیت ڈھونڈلی اور انکم کا اچھا خاصا ذریعہ بھی بن گیا۔ پورے گاؤں میں اب کوشی کی دکان کے چرچے ہیں۔ معیاری اور عمدہ قسم کی اشیاء متعارف کروائی ہیں۔

میری دودکان پر خواتین کے ساتھ ساتھ مرد حضرات بھی تشریف لاتے ہیں۔ عزت سے بات کرتے ہیں اور سامان لے کر چلے جاتے ہیں گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹانا ابھی کوشی کے سر سے نہیں ٹلا۔ اماں روز دکان کا حساب کتاب اور ادھار کی بابت پوچھتی رہتی ہیں۔

مزے کی بات بتاؤں میرے پاس بچپن سے لے کر اب تک رسالوں کا کافی اسٹاک جمع ہے۔ بہت سنبھال کے رکھے ہیں، بچپن سے شوق ہے۔ ایک اسٹور نما کمرا ان کے لیے مخصوص ہے۔ رسالے خریدنے کے لئے پاکٹ منی بہت کم تھی اس لیے ان دنوں اسکول سے بچوں کی کتابیں گھر لا کر جلد سازی کا کام کیا اور ان سے حاصل ہوئی رقم سے ڈائجسٹ خرید لینے۔ اماں اور آپا نے کوسنے دینے اور کہنا، ان پیسوں سے کچھ کھا پی لیا کر کیسی شکل نکالی ہوئی ہے۔" اور میں نے مسکرا کے رہ جانا۔ گھر کے بہت سارے اخراجات اب دکان سے پورے ہوجاتے ہیں۔ اب کسی کی لتری نہیں چلتی۔ بہن ناہید اسماعیل کا بے حد شکریہ جنہوں نے میری والدہ کے لیے دعا کی۔

ج: پیاری کوشی! اس بار آپ کا خط پڑھ کر بہت خوش گوار سا احساس ہوا۔ آپ نے بہت اچھا کیا اپنا بزنس شروع کرکے۔ اس سے نہ صرف ایک بہت اچھی مصروفیت مل گئی بلکہ آمدنی کا ایک ذریعہ بھی ہوگیا۔ جو لوگ ہمت سے کام لیتے ہیں اور محنت سے جی نہیں چراتے، اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ڈھیر ساری خوشیاں دے ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

صدف ناصر ..... جڑانوالہ

جون کا خواتین آٹھ کو ملا ٹائٹل پر "خوشی" براجمان ہیں۔ پیاری لگ رہی ہیں محترمہ۔

اور آج ہمارے چہرے پر بھی رتی برابر خوشی نہیں ہے۔ وجہ تسمیہ یہ کہ دو دن میں پورا ڈائجسٹ پڑھ ڈالا جب تبصرہ لکھنے کا ٹائم آیا تو پچھلے تین دن سے بازار سے کوئی بھی پیپر یا دستے نہیں مل رہے۔

"کہانی خوب صورت ہے۔" فریدہ اشفاق رستہ بھول کر آ گئی ہیں شاید! ویلکم بیک، اب دوبارہ سے لکھنا شروع کردیں پلیز۔ کنیز نبوی اور ایمل رضا بھی نہیں لکھ رہیں۔ خاص طور پر کنیز نبوی کی تحریریں بہت یاد آتی ہیں۔

"نکہت عبداللہ" سے ملاقات میں کافی دیر کھوئے رہے۔ "شاہین رشید" زندہ باد۔

"دانہ پانی" سے تحریروں کا آغاز کرکے پچھلی ریت ختم کردی جوکہ "راحت جبیں" کو پڑھنے کی تھی۔

موتیا اور مراد کے کردار انوکھے سے لگے اور مراد کی والدہ محترمہ اک خوفناک سا (سانپ) تحریر تیزی سے رواں اور خوب صورت۔ بات ہوجائے "مالا" کی تو الفاظ ہی نہیں تعریف کے لیے۔ (ہاہاہا) تمام گرہیں کھل گئیں۔ اس تحریر میں اور کم و بیش سب ہی کردار عامل بابا "سرکار" کی بھینٹ چڑھے ہوئے ہیں جانے انجانے میں۔

"سمیرا حمید" مشک بام کو بھی تیزی سے بڑھا رہی ہیں۔ چراغ پر ہاتھ ہولا رکھا جائے کچھ۔

"جو کوئے یار سے نکلے" نام ہی گارنٹی ہے۔ عنیزہ سید کی تحریروں کے عنوان ہمیشہ سے ہی اچھے اور منفرد ہوتے ہیں۔

"مٹی کے مکین" عینی عرفان لے کر بیٹھی ہیں۔

"عرشیہ" کے ساتھ انتہائی ظلم ہوا۔ ساس کے دوہرے پن کا شکار ہوئی ساتھ ہی سگی ماں کی لاپرواہیوں کا بھی۔ اینڈ نے بہت رلایا۔ بات ہوجائے۔ "زندگی تجھے گزاریں گے" کی جس کی وجہ سے بہت غصہ تھا مگر سچی بات ہے سارا غصہ ختم ہوگیا۔ "راحت جبین" نے پورا پورا انصاف کیا ہر ہر کردار کے ساتھ ثریا سے لے کر زرمین تک سب ہی اپنے صحیح انجام تک پہنچے۔

مریم انصاری، "ہم زاد" کا دکھ لائی ہیں۔ مطلبی، موقع پرست خود پسند لوگوں کو آئینہ دکھاتی تحریر اچھا لکھا

مریم نے "نصرت شمسی"، "کفارہ" لکھ کر اچھا افسانہ تحفہ دیا ہے۔ "منور صاحب" کے ساتھ صحیح انصاف کیا اب بیٹھا رہے کفارے ادا کرنے تا حیات۔

"خود غرض" اچھا افسانہ ہے حنا اشرف ویری گڈ!

"بے معنی لکیریں" دل اداس اداس کر گیا۔ بے ادب کیا جانیں کتابوں کے راز، ابھی چند دن پہلے اپنی چھوٹی سسٹر "اریقہ محترمہ" سے کہا تمہاری برتھ ڈے پر نمرا احمد کا ناول گفٹ کر دوں۔ اچھلنے ہی لگ گئی بی بی "نا نا مجھے نہ دیناء میں نہیں پڑھتی۔" اور ہم پڑھنے والوں کو ایسی آفر کوئی نہیں کرتا (ہائے)

جی "ہمارے نام" کی۔ محبت زبردست ہے۔

"منا ہل بٹ" نے "چائے" کی آفر دے کر دل ہی اداس کر دیا۔ کیونکہ ہم چائے سمیت کھانا بھی کھلانے کو تیار ہیں۔ ناہید اسماعیل شکر ہے آپ کو واپسی یاد آئی۔ آپ کے بہترین اور جان دار تبصروں سے ہی میں نے تبصرہ لکھنا سیکھا ہے۔ (قسم لے لیں)

ج: پیاری صدف! آپ کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح لاجواب ہے۔ مزید کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں۔ آپ کی سب سے اچھی بات یہ ہے کہ آپ تمام سلسلے بھی بڑی باریک بینی سے پڑھتی ہیں۔ اور ان پر تبصرہ بھی کرتی ہیں۔

عروبہ حبیب، ثناء دانش، شہوار حسین......ای میل

خواتین ڈائجسٹ میں عینی عرفان کے ناولٹ مٹی کے مکین نے دل پر بہت انمٹ نقش چھوڑے ہیں۔ ان تک ہماری تعریف پہنچا دیں۔

بنت رشید......ای میل

خواتین ڈائجسٹ میں نمرہ احمد اور عمیرہ احمد کا ایک ساتھ نام آنا ہمارے لیے خوشی کا باعث ہے پر اس بار باری عینی عرفان نے ماری اتنا پختہ انداز تحریر جذبات احساسات سے گندھی بہترین کہانی اور اختتام نے رونگٹے ہی کھڑے کر دیے۔

منزہ حنان، بشریٰ عدنان، بشریٰ توصیف......ای میل

خواتین میں چھپنے والا ناولٹ مٹی کے مکین بہت بہت پسند آیا۔ عینی عرفان کو دل کی گہرائیوں سے مبارک یادپیش کرتی ہوں۔

مسز اظہر......لاہور

سمیرا حمید سے گزارش ہے کہ کبھی مشک بام کو ختم نہ کیجیے۔ ج: سمیرا حمید تک آپ کا پیغام پہنچا دیا ہے۔

مایا ناز......ضلع چنیوٹ

سترہ اٹھارہ سال کی درمیانی عمر میں یوں لگتا ہے صدیوں کی مسافت طے کر چکی ہوں تعلیم محدود لیکن علم لامحدود جو کہ ان ہی دو پرچوں خواتین و شعاع کا عطا کردہ ہے زندگی جمود کا شکار ہے بے اختیار زندگی میں رات سے دن اور دن سے رات میں بہت سے غم غلط کیے جا رہی ہوں۔ مطالعہ کا شوق وراثت میں ملا میری والدہ جو دنیائے ادب کی دل دادہ برسوں سے آپ کے پرچوں کی کم گو قاری ہیں ان ہی کے توسط سے مجھ میں یہ شوق منتقل ہوا گو کہ میں زیادہ پرانی قاری نہیں لیکن 1990 سے لے کر اب تک کے پرچے جو میری والدہ نے سنبھال رکھے اور اب میری دسترس میں ہیں، پڑھ چکی ہوں خط لکھنے کی وجہ سمیرا حمید کا ناول مشک بام جس کی تعریف بیان سے باہر ہے نمرہ احمد مالا کے ساتھ آپ بھی کسی سے کم نہیں۔ یہ خط پوسٹ کروانا میرے لیے اتنا ہی مشکل تھا جتنا کہ اس آفات کے دور میں جینا۔ سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ کے اس دور میں جو خوشی آپ کے رسالے کو پا کر ہوتی ہے وہ بیان کرنے سے قاصر ہوں۔

ج: پیاری مایا! آپ کی تحریر اور تبصرے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اتنی کم عمری کے باوجود آپ کی سوچ پختہ ہے آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے۔ چاہیں تو لکھ سکتی ہیں، خواتین اور شعاع کی پسندیدگی کے بارے میں جان کر خوشی ہوئی۔

بنت فاروقی......منڈو آدم

یوں تو 2002ء سے مستقل قاری ہوں مگر شرکت پہلی بار کر رہی ہوں وجہ اپنی شادی کے بعد ہر ماہ خرید کر پڑھنا شروع کیا۔ امی کے انتقال کے بعد اپنی نانی ماں کے گھر پلی بڑھی اور جناب نانی کے گھر جوائنٹ فیملی سسٹم تھا۔ نانی کی تین دیورانیاں ان کی بہو سب ساتھ مل کر رہا

بقیہ صفحہ نمبر 213 پر

جولائی 2022
کے شمارے کی ایک جھلک

بہنوں کا اپنا ماہنامہ
شعاع



جولائی 2022

کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

- "عسر یسرا" سدرہ حسین کا مکمل ناول،
- "تم سے ہی" صائمہ نور کا مکمل ناول،
- "والعصر" امت العزیز شہزاد کا ناول،
- "نور القلوب" تنزیلہ ریاض کا ناول،
- "ہمدرد" شازیہ الطاف ہاشمی کا ناولٹ،
- حمیرا نوشین، حمیرا شفیع، فاتحہ رابعہ، اُم اقصیٰ، منشا محسن اور رمشا روشن کے افسانے،
- معروف اداکار "گوہر رشید" سے ملاقات،
- "عیدالاضحیٰ اور آپ" قارئین سے عیدالاضحیٰ کے موقع پر خصوصی سروے،
- "جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" قارئین کے تجربات،
- "دستک" معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ،
- "پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں" احادیث کا سلسلہ،
- خط آپ کے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

شعاع ہر ماہ پوری محنت سے ترتیب دیتے ہیں، لیکن آپ کے خط ہمیں بتاتے ہیں کہ ہم اپنی محنت میں کتنے کامیاب ٹھہرے، ہمیں خط لکھنا نہ بھولیے گا۔

شعاع جولائی 2022 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

عمیرہ احمد

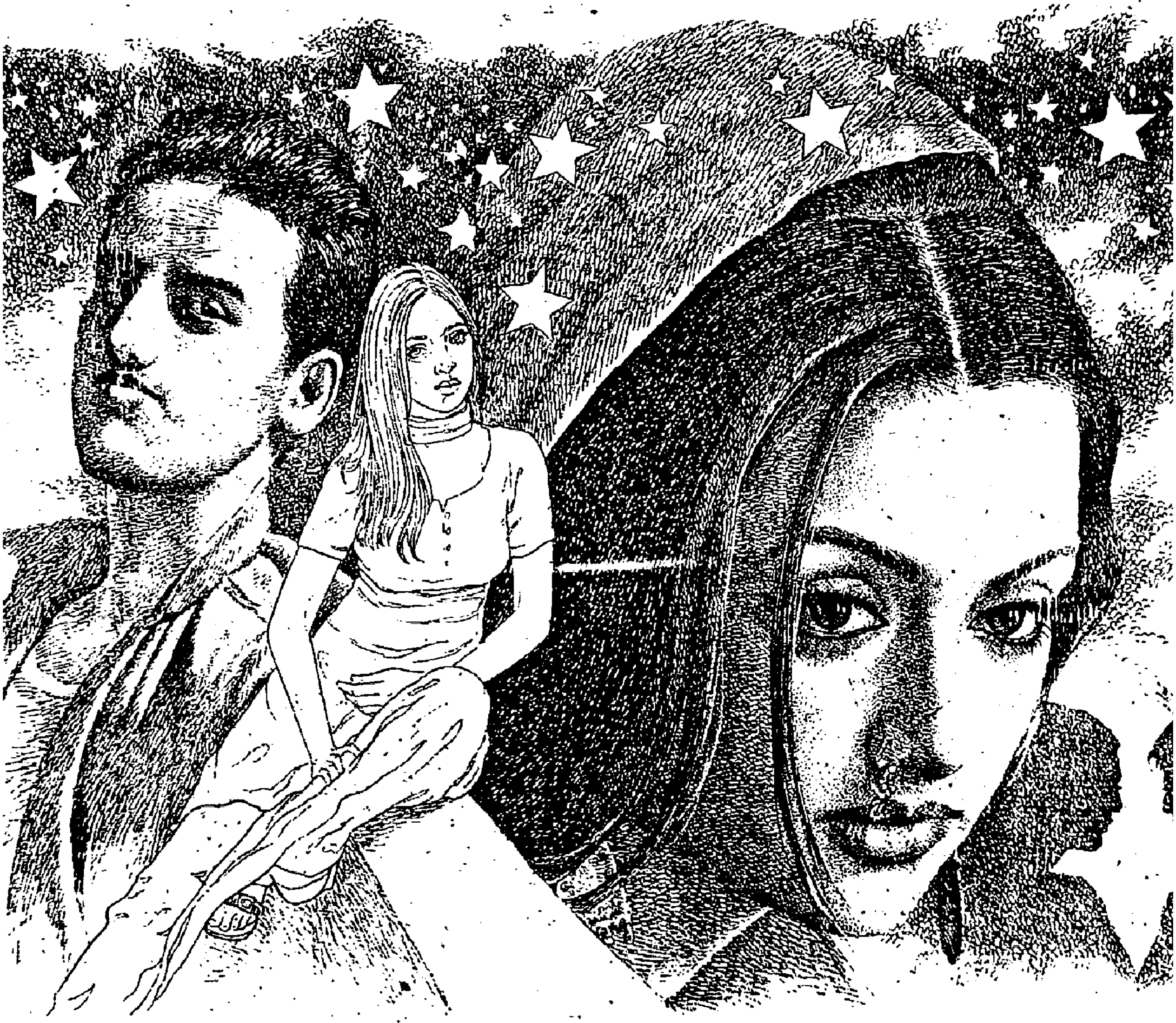
دانہ پانی



جھوک جیون کی ہر صبح گامو ماشکی کے حق باہو کے کلام سے ہوتی ہے۔ فجر کے بعد وہ گاؤں کے کنویں پر پہنچ جاتا ہے۔ گاؤں کے سارے گھر روزانہ ہی گامو کی مشک کے پانی کی مہک اور مٹھاس کا انتظار کرتے ہیں۔ گامو دس سال سے بے اولاد ہے اور اس کی بیوی اللہ وسائی توتلی ہے۔
گامو ماشکی کے گھر گندم کے دانے چوہدری کرامت کی حویلی سے آتے ہیں۔ چوہدری کے بیٹے کی شادی برابر والے گاؤں کے پیر ابراہیم کی بیٹی تاجور سے ہوتی ہے۔ گامو اور اللہ وسائی اولاد کی دعا کروانے کے لیے پیر ابراہیم کے پاس جاتے ہیں۔ وہ ان کے لیے دعا کرتے ہیں۔
تاجور کا حویلی میں پرتپاک استقبال ہوتا ہے۔ چوہدری کرامت اپنے بیٹے چوہدری شجاع کو نصیحت کرتے

ہیں تاجور کو کبھی کسی چیز کو منع نہ کرنا۔ اللہ وسائی تاجور کو دیکھنے حویلی آتی ہے تو تاجور اس کے توتلے پن کا مذاق اڑاتی ہے۔

تاجور ایک بیٹے کو جبکہ اللہ وسائی ایک خوب صورت بیٹی کو جنم دیتی ہے۔ جس کی خوب صورتی کے سارے گاؤں میں چرچے ہیں۔ اللہ وسائی اپنی بیٹی کو ڈاکٹر بنانا چاہتی ہے۔ گاؤں کے اسکول میں پہلی بار مراد اور موتیا کا سامنا ہوتا ہے۔ پہلے دن ہی چوہدری مراد اپنی میز کرسی چھوڑ کر موتیا کے ساتھ دری پر بیٹھ جاتا ہے۔ موتیا خواب میں دیکھتی ہے کہ ایک سانپ جنگل میں اس کا پیچھا کر رہا ہے اور وہ اس سے بھاگ رہی ہے۔ اچانک اسے کسی



کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے رک کر دیکھتی ہے تو ایک لڑکے پر اس کی نظر پڑتی ہے۔ سانپ پلٹ کر اس لڑکے کی طرف بڑھتا ہے تو موتیا گھبرا جاتی ہے۔

اللہ وسائی موتیا کو کبھی حویلی لے کر نہیں جاتی۔ جس پر تاجور برا مانتی ہے۔ موتیا ڈاکٹر بن رہی ہے اور شہر میں رہتی ہے۔ چھٹیوں میں گاؤں آتی ہے۔ گاؤں کی ڈسپنسری میں بلا اجازت بیٹھتی ہے۔ گاؤں کے لوگوں کا علاج یہ بتا کر کرتی ہے۔ کہ وہ ابھی ڈاکٹر نہیں اندازے سے دوا دے رہی ہے۔

مراد بیرسٹر بن کر واپس اپنے ملک لوٹ آیا ہے۔ تاجور حویلی میں اس کے استقبال کی تیاریاں کرتی ہے۔

موتیا اپنی سہیلی کی بارات دیکھنے اسٹیشن جاتی ہے۔ اسی ٹرین سے مراد بھی واپس آتا ہے۔ وہاں اس کی نظر موتیا پر پڑتی ہے۔ موتیا اسے دیکھ کر ساکت رہ جاتی ہے۔ یہ وہی خواب والا لڑکا تھا۔

بتول اور موتیا تانگے میں بیٹھ جاتی ہیں۔ گامو چوہدری مراد کو اپنے ساتھ آنے کا کہتا ہے کہ اسے اب تک کوئی لینے نہیں آیا۔ بارش کی وجہ سے سفر کے دوران مراد بھیگ جاتا ہے رات تک بخار میں جلنے لگتا ہے تاجور کو بالآخر موتیا کو بلانا ہی پڑتا ہے۔ تاجور اس دن پہلی بار موتیا کو دیکھ کر جل جاتی ہے۔ موتیا انجکشن اور دوا دے کر گھر آجاتی ہے۔

مراد اپنی ماں کے ساتھ نانا سے ملنے جاتا ہے جبکہ موتیا اپنے والدین کے ساتھ پیر ابراہیم کے ڈیرے پر جاتی ہے۔ امرود کے باغ میں پہنچ کر موتیا امرود توڑ کر کھانے لگتی ہے کہ اس کی نظر مراد پر پڑتی ہے جو اس کی طرف آرہا ہوتا ہے موتیا کو اس لمحے سانپ والا خواب یاد آتا ہے۔ وہ گھبرا کر زمین پر گھاس کو دیکھتی ہے۔ سانپ مراد کے قدموں کے قریب ہی رینگ رہا تھا۔ موتیا چیختی ہے اور گامو اپنی لاٹھی سے سانپ کو مار دیتا ہے۔

مراد پیر ابراہیم اور چوہدری شجاعت گامو اور اس کے خاندان کے بہت شکر گزار ہیں کہ ان کی وجہ سے مراد کی جان بچ گئی۔ مراد گامو کے گھر پھلوں کے ٹوکرے بھجواتا ہے۔

موتیا اپنی سہیلی بتول کو اپنے خواب کے بارے میں بتاتی ہے کہ وہ یہ سب خواب میں دیکھ چکی ہے لیکن وہ حیران ہے کہ سانپ نے کیوں نہیں کاٹا۔ بتول یہ باتیں شکوراں کو بتاتی ہے یہاں تک کہ مراد کے سینے پر دل کے مقام پر داغ کے بارے میں بھی، تاجور یہ سن کر حیران رہ جاتی ہے اور اسے موتیا کا کالا جادو قرار دیتی ہے۔ مراد ان دونوں کی باتیں سن کر دنگ رہ جاتا ہے اور بتول کے ذریعے موتیا کو ملنے کا پیغام بھجواتا ہے۔ مراد موتیا سے دن دہاڑے ملتا ہے اور کھل کر اپنی محبت کا اقرار اور شادی کرنے کا عہد کرلیتا ہے۔ بتول ان دونوں کے عشق سے حسد کرنے لگتی ہے۔

تاجور، موتیا کو حویلی میں دانے صاف کروانے بلاتی ہے اللہ وسائی منع کرتی ہے لیکن موتیا راضی ہو جاتی ہے۔ دانے صاف کرتے اس کی انگلی زخمی ہو جاتی ہے اور مراد اس پر اپنا رومال لپیٹتا ہے، تاجور یہ دیکھ کر جل جاتی ہے تب شکوراں ان دونوں کی ملاقات، محبت اور شادی کے بارے میں بتاتی ہے۔ تاجور فوری فیصلہ کرتی ہے اور ماہ نور سے رشتہ طے کرنے پر پیر ابراہیم کے پاس جاتی ہے جہاں اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ مراد پہلے ہی اپنے نانا سے موتیا کے رشتے کی بات کرچکا ہے اور انہیں کوئی اعتراض نہیں تاجور ایک ناگن کی مانند تلملا اٹھتی ہے۔

چوتھی قسط

وہ رات مراد پر بڑی بھاری گزری تھی۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی آنکھ بند نہیں کرسکا تھا۔ اس نے ماں کا یہ روپ پہلی بار دیکھا تھا کہ مراد کسی شے کی تمنا کرے اور تاجور وہ لانے کے لیے دوڑ نہ پڑے۔ تو پھر موتیا کی دفعہ کیا ہو گیا ماں کو؟

اس کے کمرے میں قانون کی کتابوں کے ڈھیر میں موجود کسی کتاب میں اس کا جواب نہیں تھا۔ وہ ماں پر جان قربان کرنے والا فرماں بردار بیٹا تھا اور موتیا پر آکر وہ نافرمان کیوں ہوا تھا؟ قانون کی کسی کتاب میں اس کا جواب بھی نہیں تھا۔ کوئی مراد سے پوچھتا تو وہ اسے محبت کہتا۔ تاجور سے پوچھتا تو وہ اسے آزمائش کہتی۔

وہ ساری رات کمرے میں پڑی میز پر ماچس کی تیلیوں سے تاج محل بناتا رہا تھا۔ وہ تاج محل جس میں اس نے موتیا کو بسانا تھا۔ پر اس تاج محل کا دروازہ وہ نہیں بنا سکا تھا۔

فجر کے وقت چوہدری شجاع نماز کے لیے اٹھے تھے اور انہوں نے مراد کے کمرے کی روشنی دیکھی تھی پھر کھڑکی سے بیٹے کو سر پکڑے بیٹھے دیکھا تھا اور ان کے جیسے کلیجے پر ہاتھ پڑا تھا۔ عشق معشوقی انہوں نے خود بھی نہیں کی تھی پر ہیر وارث شاہ بڑی سنی تھی۔ رانجھے کی فریاد بھی، مرزا کو لگنے والے تیروں کے نوحے بھی اور مہینوال کے اپنی ران کے گوشت کو کاٹ کر سوہنی کو کھلانے کی داستانیں بھی...... پر جو حال انہوں نے اس وقت بیٹے کا دیکھا تھا انہیں سب کچھ بھول گیا تھا۔

''تاجور! یہ نہ کر...... جوان اولاد ہے وہ بھی اکلوتی...... نہ کر اتنی ضد اس کے ساتھ۔'' چوہدری شجاع نماز کے لیے نیت باندھتی ہوئی تاجور کو ٹوک بیٹھے تھے۔ تاجور کو ان کی یہ مداخلت بے حد بُری لگی تھی۔

''صبح سویرے اللہ کا نام لیتے ہوئے آپ کون سے قصے لے کر بیٹھ گئے ہیں۔'' اس نے بے حد ناخوش انداز میں مصلے پر کھڑے ہوئے میاں سے کہا تھا۔

''مراد ساری رات نہیں سویا۔ میں نے کھڑکی سے دیکھا ہے۔ وہ پریشان بیٹھا ہوا ہے۔'' چوہدری شجاع نے اُسے بتایا۔

تاجور نے جواب دینے کے بجائے ہاتھ اُٹھا کر نیت باندھ لی۔ مگر چوہدری شجاع کے جملے جیسے اُس کے ذہن میں اٹک گئے تھے۔ وہ ہر دوسری آیت بھول رہی تھی۔ کبھی کچھ آگے کر دیتی تو کبھی کچھ پیچھے۔ وہ اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کی پریشانی کا سن کر تاجور بھی اپنے حواس میں نہیں رہی تھی۔ پر شوہر کے سامنے وہ اپنے آپ کو کمزور ظاہر نہیں کر سکتی تھی۔ چوہدری شجاع نماز پڑھنے چلے گئے تھے اور جب وہ نماز پڑھ کر آئے تو تاجور تسبیح لے کر بیٹھی ہوئی تھی۔

''تم نے کچھ سوچا تاجور؟'' چوہدری شجاع نے آتے ہی اس سے کہا تھا اور وہ جیسے آگ بگولہ ہوگئی تھی۔

''آپ چاہتے ہیں، میں ایک کمی کی بیٹی بیاہ کر گھر لے آؤں۔''

''میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ اس سارے معاملے کو حکمت سے سنبھالو۔ وہ ایک دو مہینے کے لیے یہاں ہے واپس چلا گیا تو موتیا کی محبت کا بخار بھی اُتر جائے گا۔ ابھی ضد نہ کر و اُس کو ماہ نور کے ساتھ کسی رشتے میں باندھنے کی۔ بس اُسے کہہ دیتے ہیں کہ ہمیں سوچنے کے لیے کچھ وقت دے وہ، اگلے سال آئے گا تو پھر فیصلہ کریں گے۔'' شجاع نے جیسے اُسے سمجھا کر کوئی حل نکالنے کی کوشش کی۔

''وہ نہیں مانے گا...... اس نے ضد لگائی ہے ماں سے اور ضد میں کوئی تاجور کو کیسے ہرادے۔''

تاجور نے چوہدری شجاع کے سامنے دوٹوک انداز میں کہا تھا۔ وہ مسلسل تسبیح کے دانے گرا رہی تھی اور چوہدری شجاع اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے ضد کرنے والی ماؤں کا سنا تھا پر وہ دیکھ پہلی بار رہے تھے اور وہ بے بس تھے۔ باپ ہو کر بھی وہ ماں کی اس ضد کے سامنے بیٹے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

''میں نے نیا وظیفہ شروع کیا ہے اس کے لئے۔ آپ دیکھیے گا چار دن میں سیدھا ہو جائے گا۔ یہ سب جادو ٹونے ہیں جن کے اثر میں ہے وہ۔ جب اثر سے نکلے گا تو موتیا کی تو شکل بھی نہیں دیکھے گا۔''

تاجور نے بے حد اعتماد سے شوہر سے کہا تھا وہ اسی طرح تسبیح کے دانے گراتی ہوئی کمرے سے نکل کر باہر صحن میں چلی گئی تھی جہاں برآمدے میں مراد کے کمرے کی کھڑکی سے اب بھی روشنی آرہی تھی۔ تاجور نے تسبیح پھیرتے ہوئے ڈوبتے دل کو سمجھاتے ہوئے اس کھڑکی سے نظریں چرائیں۔

''دل کو پکا رکھنا تاجور! ایک دفعہ کمزور پڑی تو بس تیری سلطنت گئی تیرے ہاتھ سے۔'' اس کے اندر جیسے کسی نے اس کو پکار کر کہا تھا اور تاجور نے اس پکار کو بار بار سنا تھا۔

☆☆☆

گامو اللہ وسائی کا چہرہ دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔
"تو کیا کہہ رہی ہے اللہ وسائی؟ چوہدرائن اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر ہمارے گھر آئے گی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" اللہ وسائی نے جواباً بڑے اعتماد سے اس سے کہا۔
"تجھے بتایا تو ہے گامو! موتیا کو پسند کرتا ہے چوہدری مراد۔ اُس نے کہا ہے اس سے کہ وہ رشتہ بھیجے گا۔"
اللہ وسائی نے جھجکتے جھجکتے اُسے موتیا اور مراد کے بارے میں جیسے سب کچھ سنا دیا۔ گامو بے حد پریشان ہوا تھا اور کچھ دیر کے لیے جیسے اس سے بات ہی نہیں ہو سکی تھی۔
"کچھ تو عقل کر اللہ وسائی! کہاں چوہدری کہاں ہم..... تو نے موتیا کو سمجھانا تھا۔"
"سمجھایا تھا گامو..... پر موتیا کا تو کوئی قصور ہی نہیں، دل تو مراد کا آیا ہے۔ رشتہ بھیجنے کی خواہش تو اُس نے کی ہے۔"
اللہ وسائی نے موتیا کے جذبات پر پردہ ڈالتے ہوئے گامو کے سامنے بیٹی کا دفاع کیا۔ گامو اُس کا چہرہ دیکھ کے رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔
"تیرا بھی تو دل کرتا تھا نا کہ چوہدری مراد کے ساتھ موتیا کا رشتہ ہو جائے۔ تو نے بھی تو مجھ سے کہا تھا کہ میری موتیا کے ساتھ صرف وہی سجتا ہے۔" اللہ وسائی نے یک دم جیسے عجیب سے لہجے میں اُس کے جملے دہرائے۔
"میرے سوچنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ میں تو پاگل ہوں، عقل کم ہے مجھ میں..... ہر الٹی سیدھی بات سوچ لیتا ہوں۔ تو میری بات کیوں دہرا رہی ہے؟" وہ یک دم گڑبڑا کر اللہ وسائی سے کہنے لگا۔
"کیا پتا چوہدرائن واقعی رشتہ لینے آ جائے۔" اللہ وسائی نے شوہر کے ساتھ بحث نہیں کی تھی۔ اس نے جیسے تمنا کی تھی۔
"وہ نہیں آئے گی اللہ وسائی! میں جانتا ہوں چوہدرائن کو اور تو بھی جانتی ہے۔ اس لیے جھوٹے خواب نہ دیکھ۔" گامو نے اسے ڈانٹ دیا۔ اس نے جواباً بڑی عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔
"تو اور میں تو جھوٹے خواب دیکھتے ہیں پر موتیا تو ہمیشہ سچے خواب دیکھتی ہے۔ اس نے دیکھا ہے کہ چوہدرائن رشتہ لے کے آئی ہے اس کے لئے۔" گامو اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔
اس کی سمجھ میں نہیں آیا، وہ آمین کہے، ماشاء اللہ یا الحمدللہ۔ موتیا کا خواب ہمیشہ سچا ہوتا تھا۔ یہ وہ بھی جانتا تھا۔ پر یہ خواب کیسے سچا ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

تاجور اس دن مراد کے لیے ناشتے کی میز سجا کر بیٹھی رہی تھی اور وہ کمرے سے ہی نہیں نکلا تھا۔ وہ بھوک برداشت نہیں کر سکتا تھا اور تاجور کو یہ خیال ہی نہیں گزرا تھا کہ وہ کھانا چھوڑ دے گا۔ کئی بار ملازم بھیجنے کے بعد بھی جب وہ ناشتہ کرنے نہیں آیا تو تاجور خود اس کے کمرے میں چلی گئی تھی۔ وہ بستر پر چت لیٹا ہوا تھا۔ ماں کو دیکھا تو اُٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔
"کیا ہوا بیٹا! تم ناشتے کے لیے نہیں آ رہے میں انتظار میں بیٹھی ہوں۔" تاجور نے اپنا لہجہ حتی المقدور نارمل رکھتے ہوئے کہا تھا یوں جیسے کل کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔
"ناشتہ نہیں کرنا مجھے۔" اس نے جواباً بے حد سرد مہری کے ساتھ ماں سے کہا۔
"کیوں؟" تاجور نے جانتے بوجھتے انجان بننے کی کوشش کی۔
"میں اب تب تک اس گھر سے کچھ بھی نہیں کھاؤں گا جب تک آپ اپنی ضد چھوڑ نہیں دیتیں۔" مراد نے

کسی لگی لپٹی کے بغیر ماں سے کہا تھا اور تاجور اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی تھی۔

"میں ضد چھوڑ دوں پر تو ضد پڑ ڈٹا رہے اور میری ضد کی تو پرواہی نہ کر تو۔ میں نے کہا تو ہے تجھ سے میں زہر کھالیتی ہوں۔ تو جا کر بیاہ لا اُسے۔"

اس نے مراد سے اسی سرد مہری سے بات کرنا شروع کر دی تھی جو اس کے لہجے میں تھی۔ وہ جواباً ماں کا چہرہ دیکھتا رہا۔ جانتا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی کرنے کی ہمت رکھتی تھی۔ تاجور بھی اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ یوں جیسے اس کے چہرے پر کسی بے چینی، کسی اضطراب کو کھوجنے کی کوشش کر رہی ہو چند لمحے اُسے اسی طرح دیکھنے کے بعد مراد نے اپنے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کی دراز کھولی تھی اور اس میں سے ایک ریوالور نکال کر سائیڈ ٹیبل کے اوپر رکھ دیا۔

تاجور کی جان جیسے ہوا ہوئی تھی۔

"میں آپ کو موتیا سے شادی پر مجبور کروں گا تو آپ زہر کھالیں گی۔ آپ مجھے ماہ نور سے شادی پر مجبور کریں گی تو میں خود کو گولی مار لوں گا۔" تاجور ضدی تھی پر ماں تھی۔ وہ تڑپ اُٹھی تھی۔

"تو میرا اکلوتا بیٹا ہے مراد! کتنی منتوں و مرادوں اور چاؤ والا...... تو ایک لڑکی کے لیے ماں کی نافرمانی کر رہا ہے۔" تاجور نہ چاہتے ہوئے بھی رو پڑی تھی۔

"اس میں آخر ایسی کیا چیز ہے کہ یوں پاگل ہو گیا ہے تو؟"

"پتا نہیں میں نے کبھی بیٹھ کر یہ نہیں سوچا کہ اس میں ایسی کیا خاص بات ہے۔ یہ سوچئے آپ بیٹھی ہوں گی...... میں نے تو بس ایک فیصلہ کیا ہے اور آپ کو بتا دیا ہے۔ نہ میں موتیا سے شادی کروں گا نہ کسی اور سے۔ آپ کی نسل مجھ سے شروع ہو کر مجھ پر ہی ختم ہو جائے گی۔ پر کم از کم آپ کی نافرمانی تو نہیں ہو گی اور نہ میں پیار میں جھوٹا پڑوں گا۔"

وہ تاجور سے کہہ کر وہاں رُکا نہیں تھا، نکل گیا تھا اور جاتے ہوئے وہ ریوالور بھی ساتھ لے گیا تھا۔ تاجور برف کا بت بنی تھی اور بنی ہی رہی تھی۔ اس نے مراد کو پیدا کرتے ہوئے اتنی تکلیف نہیں اٹھائی تھی جتنی تکلیف مراد کا یہ انداز دے رہا تھا۔

☆☆☆

بتول کو لگ رہا تھا یا وہ پاگل ہے یا پھر موتیا جسے وہ پچھلے آدھ گھنٹے سے حویلی میں ہونے والے واقعات سنا رہی تھی اور وہ جواباً ہوں ہاں کرتے ہوئے گود میں دوپٹے کے دامن سے بیر اُٹھا اُٹھا کر کھا رہی تھی جنہیں وہ چُن لائی تھی۔ بتول نے ایک بار بھی اس کے چہرے اور آنکھوں میں کوئی تشویش، کوئی پریشانی نہیں دیکھی تھی۔ نہ اس نے ماہ نور کے بارے میں پوچھا تھا نہ شگن کے بارے میں کریدا تھا۔

"موتیا! تو سمجھ رہی ہے کہ میں جھوٹی ہوں جو تجھے مراد اور ماہ نور کی بات طے ہو جانے کے بارے میں بتا رہی ہوں اور تو کان تک نہیں دھر رہی۔" بتول نے بالآخر جیسے زچ ہو کر کہا تھا۔ موتیا نے اس کی بات پر پہلی بار سر اٹھا کر دیکھا پھر ایک بیر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"بات سن بتول! مراد مجھ سے کہہ کر گیا ہے کہ وہ رشتہ بھیجے گا تو وہ بھیجے گا اور میں نے تو خواب میں بھی چوہدرائن کو گھر آتے دیکھا ہے تو مجھے کوئی فکر نہیں تو بیر کھا۔" اس کے انداز میں اتنا اطمینان تھا کہ بتول جھلس کر رہ گئی تھی۔

"کتنے دن ہوئے ہیں تجھے مراد سے ملے کہ ایسا اندھا اعتماد ہو گیا ہے۔ لوگ سالوں محبت کرتے ہیں، تب بھی وہمی رہتے ہیں۔ یہ تیری محبت ہے کیا موتیا؟" بتول واقعی کچھ سمجھ نہیں پائی تھی اس نے اس کے خوابوں کی بات نہیں کی تھی کیونکہ وہ اس کے خوابوں کو کبھی جھوٹا نہیں کہہ سکتی تھی۔

موتیا نے جو ہنسنا شروع کیا تھا اس کی بات پر تو بس ہنستی ہی چلی گئی تھی اور اتنا ہنسی تھی کہ بتول کو بھی ہنسی آنے لگی تھی۔

"تجھ سے کس نے کہہ دیا بتول کہ محبت کو دہائیاں چاہئیں سچا اور پکا ہونے کے لیے؟ محبت کا دھاگا تو رب ڈالتا ہے دو دلوں میں اور رب ہی نکالتا ہے، مراد نے دھوکا دینا ہوتا تو بس پھر دھوکا ہی دیتا پیار تھوڑی کرتا مجھ سے۔" بتول اس کی شکل دیکھ کر رہ گئی تھی۔

"اور اگر وہ تیرا نہ ہوا تو پھر؟" اس نے موتیا سے پوچھا تھا۔

"میرا نہ ہوا تو پھر کسی کا بھی نہیں رہنا اس نے بتول۔ اس لیے تو رب سے دُعا کیا کر کہ وہ مجھے مل جائے۔"

موتیا نے عجیب سے لہجے میں کہہ کر پیر کھال کے چلتے ہوئے پانی میں اُچھال دیے تھے۔ بتول اس جملے کو بھی سمجھ نہیں پائی تھی اُسے کئی باتیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں اور کئی باتیں بعد میں سمجھ میں آتی تھیں۔ گاموا اور اللہ وسائی کی اس اکلوتی بیٹی کی زبان میں کچھ تھا جو چونکاتا بھی تھا اور ڈراتا بھی تھا اور آس بھی دلاتا تھا۔ بتول ہمیشہ کی طرح اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

"سن پرویز! تجھ سے کام ہے ایک۔" چوہدری شجاع نے اگلے دن پرویز کو بلایا تھا۔ جس کا خاندان اس کے گاؤں کے قدرے خوش حال گھرانوں میں سے ایک تھا۔

"چوہدری صاحب! آپ حکم کریں۔" پرویز تو چوہدری شجاع کی بات سن کر جیسے پریشان ہی ہو گیا تھا۔ وہ گاؤں کا چوہدری تھا۔ اُس نے کبھی کسی کو بلا کر یہ نہیں کہا تھا کہ اُسے کسی سے کام تھا پر انسان اپنی اولاد کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا، کسی بھی حد تک جا سکتا تھا۔

"تم گامو کے گھر اُس کی بیٹی موتیا کے لیے اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر جاؤ۔" اُس کے اگلے جملے نے پرویز کو جیسے حیران ہی کر دیا تھا۔

"گامو کے گھر؟" وہ اٹکا تھا۔

"تجھے اعتراض ہے کوئی؟" چوہدری شجاع نے اس بار بارعب آواز میں کہا تھا اور پرویز کو پتا چل گیا تھا کہ اسے یہ کام کرنا پڑے گا۔

"نہیں نہیں چوہدری صاحب! آپ کا حکم ہے مجھے کیا اعتراض ہوگا؟ میں چلا جاتا ہوں کل ہی۔" پرویز نے فوراً سے پیشتر ہامی بھری تھی۔

"اور شادی کے انتظامات کی فکر نہ کرنا، وہ سب میں دیکھوں گا۔ تمہیں گامو کی حیثیت کے مطابق جہیز نہیں ملے گا۔ چوہدری! تمہاری اپنی حیثیت کے مطابق جہیز ملے گا۔" چوہدری شجاع نے جیسے اس کے سارے اندیشوں اور اعتراضات کو پھونک مار کر اڑا دیا تھا۔ اسے پتا تھا پرویز لالچی ہے۔ وہ کسی صاحب حیثیت خاندان میں ہی بیٹا بیاہے گا۔

"چوہدری صاحب آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ آپ نے کہہ دیا تو بس اب پرویز آنکھیں بند کر کے عمل کرے گا۔" چوہدری شجاع کے وعدے پر چوہدری پرویز کی رال بہنے لگی تھی۔ وہ کچھ دیر بیٹھ کر چلا گیا تھا اور چوہدری شجاع نے جیسے سکھ کا سانس لیا تھا۔ اسے یقین تھا، گاموا آنکھیں بند کر کے خوشی خوشی اس رشتہ پر تیار ہو جائے گا۔ وہ گاؤں کا سب سے اچھا اور صاحب حیثیت لڑکا تھا جو تھوڑا بہت پڑھا لکھا بھی تھا۔ چوہدری شجاع کا خیال تھا، موتیا کے ماں باپ اگر خود ہی اس کا رشتہ کہیں طے کر دیتے تو مراد مجبور ہو جاتا۔ سانپ کو مارنے کے لیے تاجور کی طرح لاٹھی توڑنے کے علاوہ بھی بڑے طریقے ہوتے ہیں۔ اور شجاع ایسا ہی ایک طریقہ استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا

تھا۔ اُس کے گھر میں موتیا کی وجہ سے مراد اور تاجور میں جو سرد جنگ شروع ہوگئی تھی وہ اس کے لیے اعصاب شکن ثابت ہورہی تھی اور تاجور کے لیے بھی۔ اور کچھ بھی تھا، چوہدری شجاع بیوی کی محبت میں گرفتار تھا وہ اُسے اس مشکل سے نکالنے کے لیے سب کچھ کرسکتا تھا۔

☆☆☆

پرویز کا بس چلتا تو وہ اسی دن جا کر گامو سے موتیا کا رشتہ مانگ لیتا۔ اسے چوہدری شجاع کو خوش کرنے کی اتنی ہی جلدی تھی۔ پر حویلی سے واپسی پر وہ اپنے ایک پرانے دوست سے مشورہ کرنے رُک گیا تھا جس کے انکشاف نے پرویز کو پہلی بار وہم میں ڈالا۔

"میرا مشورہ مان تو اس سارے پھڈے میں نہ پڑ۔ گاؤں میں چوہدری مراد اور موتیا کے بارے میں باتیں ہورہی ہیں اور تو اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر چل پڑا ہے گامو کے گھر۔" پرویز کا منہ اس انکشاف پر کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔

"تجھے کس نے بتایا ہے حمید؟"

"لے مجھے کس نے بتانا تھا..... پنڈ میں باتیں ہورہی ہیں دونوں کے بارے میں...... وہ ولایت سے بیرسٹر بن رہا ہے۔ یہ شہر سے ڈاکٹر بن رہی ہے، جوڑ تو اچھا ہے دونوں کا...... اور آگ بھی عشق کی ہے تو کیوں اپنے بیٹے کو مروا رہا ہے چوہدری مراد کی پسند کے سامنے لا کر۔" حمید نے اُسے سمجھایا تھا۔

"پر چوہدری شجاع نے تو مجھے کہا ہے کہ میں اپنے بیٹے کا رشتہ کروں گامو کے گھر کیا اُسے پتا نہیں ہے چوہدری مراد کی مرضی کا؟" پرویز الجھا تھا۔

"پتا ہوگا اور اسی لیے تو تجھے ڈال رہا ہے اس سارے سیاپے میں، پر تو بہانا بنا کر نکل جا اس سب میں سے۔" حمید نے اسے عقل کی بات سمجھائی تھی پر پرویز نے کان بند کرلیے تھے۔ وہ چوہدریوں سے بگاڑ نہیں سکتا تھا نہ اب اُسے جا کر انکار کرسکتا تھا۔ پر بیٹے سے بات کرنی اس نے ضروری سمجھی تھی حالانکہ اسے پتا تھا اس کا بیٹا کھلو گھوڑا تھا۔ جہاں اس کی مرضی ہوتی وہ چل پڑتا۔

☆☆☆

"سن بتول! ابا کل گامو کے گھر میرا رشتہ مانگنے جارہا ہے۔ تو موتیا سے کہہ، وہ انکار کردے۔"

سعید نے اسی شام کو بتول کے گھر جا کر اسے اپنے باپ کے ارادے کے بارے میں بتا دیا تھا اور بتول کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا تھا۔

"چاچا میرے بجائے تیرا رشتہ موتیا کے لیے لے کر جائے گا اسے شرم نہیں آتی۔" وہ یک دم آگ بگولہ ہوکر سعید پر اُلٹ پڑی تھی۔

"وہ مجبور ہے۔ اسے چوہدری شجاع نے بلا کر رشتہ بھیجنے کے لیے کہا ہے۔" سعید نے باپ کا دفاع کرنے کی کوشش کی تھی اور بتول کو اس کی بات پر جیسے یقین ہی نہیں آیا تھا۔

"چوہدری صاحب اور چوہدرائن کیسے یہ کرسکتے ہیں۔ چوہدرائن کو تو پتا ہے میری ماں تجھ سے میرا رشتہ کروانے کے لیے کیسے تیرے گھر کے چکر کاٹ رہی ہے اتنے سالوں سے۔ وہ کیسے یہ کرسکتی ہے۔"

بتول بڑبڑا رہی تھی اور صحن میں چکر کاٹ رہی تھی۔ اس کی ماں ابھی تک حویلی سے نہیں آئی تھی۔ سعید بے حد فکرمند اس کے سامنے صحن میں پڑی چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔

"تو چاچا کو صاف صاف انکار کرتا۔ بتا دیتا اُسے کہ تجھے نہیں کرنی میرے علاوہ کسی سے شادی۔" بتول نے یک دم اُس سے کہا تھا۔

"تجھے پتا ہے ابا میری نہیں سنتا۔ وہ میری ٹانگیں توڑ دیتا۔" سعید نے سر جھکا کر کہا اور بتول جیسے غصے میں بے قابو ہو گئی۔

"تو کویت میں کام کرتا ہے۔ ہزاروں کماتا ہے اور تو چاچے کے سامنے بیں من من کرکے آ گیا، اس ڈر سے کہ وہ تیری ٹانگیں توڑ دے گا اور اُدھر ایک چوہدری مراد ہے جس نے ماں کو خودکشی کی دھمکی دی ہے کہ موتیا کے علاوہ وہ کسی سے شادی نہیں کرے گا۔ اس کو کہتے ہیں پیار سعید...... اس کو کہتے ہیں ہمت، جرأت...... اس کو کہتے ہیں مرد۔" وہ دھاڑ دھاڑ بولتی ہی چلی گئی۔ سعید عجیب سی نظروں سے اُسے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔

"جب موتیا کو بیاہ کر حویلی لے جائے مراد تو مجھے سنانا اور بتانا کہ اسے کہتے ہیں مرد...... ابھی تو اس کا باپ مجھ سے کروانا چاہتا ہے تیرے اس مرد کے بچے کی محبوبہ کی شادی۔ تجھے بتانے آیا ہوں کہ موتیا کو کہہ انکار کر دے، میں نہیں کر سکوں گا۔"

وہ بے حد ناراض رُکے بغیر کہہ کر چلا گیا تھا۔ اُسے بتول کا مراد کے ساتھ اپنا موازنہ اچھا نہیں لگا تھا کیونکہ اُس موازنے میں وہ کہیں ٹھہر ہی نہیں پا رہا تھا۔ یہ بتول جانتی تھی پھر بھی آج وہ غصے میں خود پر قابو نہیں رکھ پائی تھی۔ پتا نہیں غصہ تھا کہ بے بسی۔ وہ بلا جو موتیا اور مراد کی زندگی میں آئی تھی۔ وہ اُن کے ساتھ ساتھ بتول اور سعید کی زندگی اُجاڑنے بھی آ گئی تھی اور یہ بتول نے کبھی مر کے بھی نہیں سوچا تھا۔

بتول ماں کے انتظار میں اُس دن بھوکی شیرنی کی طرح پھرتی رہی تھی۔ اُس کی ماں تاجور کے ساتھ جہیز میں آئی تھی اور اُس نے تاجور کو اپنی زندگی دے دی تھی اور زندگی بھر کی خدمت کا صلہ اُسے یہ ملنے والا تھا کہ وہ اپنے گھر کی مصیبت کی بھینٹ اُس کا پیار چڑھا دیتے۔

شکوراں نے گھر کی دہلیز ابھی پار ہی کی تھی جب بتول نے انتظار کیے بغیر اُسے سارا واقعہ سُنا دیا تھا اور شکوراں اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی تھی۔

"یہ مجھے کیا سُنا رہی ہے بتول! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ چوہدرائن جی نے ایسا کچھ سوچا ہوتا تو مجھ سے پوچھتیں۔ مجھے بتاتیں۔ اُنہیں تو پتا تھا کہ تو پسند کرتی ہے سعید کو۔" شکوراں کو یقین نہیں آیا۔

"چوہدرائن کو صرف اپنی زندگی اور خوشیوں کی پروا ہے۔ موتیا کی طرح ہم بھی تو کمین ہیں اُس کے لیے جنہیں جب چاہے وہ روند دے۔" بتول کا بس نہیں چلتا تو وہ تاجور اور چوہدری شجاع دونوں کا گلا دبا دیتی۔

"نہ نہ بتول تو ایسا نہ سوچ، میں بات کروں گی صبح چوہدرائن جی سے..... سعید کسی اور کا نہیں ہو سکتا اور اپنے چاچے کو بھی دیکھ نا، کتنی بے شرمی اور بدلحاظی ہے اُس میں کہ وہ تیار ہو گیا چوہدری جی کے کہنے پر۔ اُس کو بولنا چاہیے تھا...... اُس کو کہنا چاہیے تھا کہ اُس نے رشتہ طے کر دیا ہے۔ وہ سولا رنے مجھے دیتا ہے اور پھر پیچھے چوہدری جی کے کہنے پر گاموں کے گھر بھی چل پڑتا ہے۔" شکوراں اپنے دیور کو کوسنے بیٹھ گئی تھی۔

"اماں! تو نے بات نہ کی نا چوہدرائن سے تو پھر میں بات کروں گی اور میں تو پھر سیدھا چوہدری مراد سے ہی کروں گی بات۔ میری طرف سے بھاڑ میں جائیں باقی سب لوگ اور سارے ادب لحاظ۔"

بتول، ماں کو کھری کھری سُناتے ہوئے اندر کمرے میں چلی گئی تھی اور شکوراں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اندر کیسے جائے۔ اُس کا دل چاہا تھا۔ وہ اُلٹے قدموں حویلی جاتی اور تاجور سے پوچھتی یہ سب ہوا کیسے پر رات ہو گئی تھی اور گاؤں کی اندھیری گلیوں اور آوارہ پھرتے کتوں سے اُس کو اُتنا ڈر نہیں تھا جتنا حویلی کے بند دروازوں کا لحاظ تھا وہ رات گئے شکوراں کے لیے کہاں کھلنے تھے۔

☆☆☆

موتیا فجر کی اذان پر اُٹھ کر وضو کرنے باہر صحن میں آئی تھی جب اُس نے اللہ وسائی کو مشک اُٹھاتے دیکھا۔

"امّاں! آج آپ کیوں اُٹھا رہی ہیں مشک؟ وہ حیران ہوئی تھی۔
"تیرے ابا کو بڑا تیز بخار ہے پھر بھی کہہ رہا تھا۔ میں جاتا ہوں پانی بھرنے۔ میں نے کہا، لیٹا رہ میں دے آتی ہوں حویلی میں۔ پنڈ والوں کی خیر ہے۔" اللہ وسائی نے اسے بتایا موتیا نے اُس کے ہاتھ سے مشک لے لی۔
"میں بھرتی ہوں مشک اور دے آتی ہوں پانی۔"
"ارے تو کہاں کرے گی اتنا سخت کام۔ تجھ سے کہاں اُٹھایا جانا ہے اتنا وزن۔ مجھے پکڑا۔" اللہ وسائی نے اُس سے مشک واپس لینے کی کوشش کی پر موتیا نہیں مانی تھی۔
"اُٹھانے دے امّاں! وزن۔ اتنا نازک نہ بنا مجھے۔" وہ کہہ کر گھر سے نکل گئی تھی اور اللہ وسائی بڑبڑاتی ہی رہ گئی۔
"مجال ہے، ماں کی سُن لے...... ارے اس لیے تھوڑا ڈاکٹرنی بنا رہے ہیں کہ تو پانی کی مشکیں ڈھوتی پھیرے۔"
وہ اُس کے پیچھے گھر کے دروازے میں کھڑی آوازیں لگاتی رہی تھی پر موتیا نے مڑ کر نہیں دیکھا۔
☆☆☆
کنویں میں مشک گرا کر وہ بڑے انہماک سے چرخی لپیٹ رہی تھی جب کسی نے اُس کے عقب میں یک دم کہا تھا۔
"اتنے نازک ہاتھ اور اتنی بھاری مشک...... کلائیوں میں موچ آ گئی تو کیا ہو گا؟" وہ ٹھٹکی تھی مگر پھر پلٹے بغیر ہنس دی۔ وہ مراد تھا۔
"اتنی نازک کلائیاں نہیں ہیں۔ کئی بار بھری ہے یہ مشک۔"
موتیا نے بغیر دیکھے کہا تھا۔ پیچھے مُڑے بغیر بھی گھوڑے کی ہنہناہٹ سے اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اپنے گھوڑے پر تھا مگر کنویں تک آتے ہوئے موتیا نے ہلکی سی چاپ بھی نہیں سنی تھی گھوڑے کے قدموں کی۔
"پلٹ کر نہیں دیکھو گی...... اتنا غرور ہے؟" مراد نے اُسے چھیڑا تھا۔
"ہاں ہے! کر لو جو کرنا ہے۔" موتیا نے اس بار بھی پلٹے بغیر مشک کا منہ بند کرتے ہوئے کہا تھا۔
"مراد نے کیا کرنا ہے، وہ تو غلام ہے تمہارا۔"
موتیا نے اس بار پلٹ کر اُسے دیکھا تھا۔ سورج نکلنے والا تھا اور وہ اس طرح دلیری سے وہاں کھڑا تھا جیسے اُسے پرواہ نہیں تھی کہ کوئی اُسے وہاں دیکھ لے گا تو کیا کہے گا۔ وہ بس پلکیں جھپکے بغیر دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے کہا۔
"آج سورج نہ بھی نکلا تو کوئی بات نہیں۔ میری صبح روشن ہو گئی ہے۔ پانی پلا دو مجھے۔"
وہ اب گھوڑے سے اُتر گیا تھا۔ موتیا کا چہرہ لال ہوا، پر اُس نے کچھ کہا نہیں۔ وہ اُس کے سامنے جھکا اور اُس نے ہاتھوں کی اوک بنائی۔ موتیا مشک پکڑے اُس کی اوک میں پانی گرانے لگی۔ مراد پانی پیتا رہا اور جب اُس نے پانی پی لیا تو اُس نے موتیا سے سیدھا ہوتے ہوئے کہا۔
"تمہارے ایک کان میں موتیا کا پھول ہے دوسرا گر گیا ہے۔"
موتیا نے بے اختیار اپنے کان کی لو باری باری چھوئی پھر اُس نے کہا۔
"کہیں گر گیا ہو گا۔" وہ اُس کے اتنے قریب کھڑا تھا کہ موتیا نے دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا تھا۔
"یہ مت پہنا کرو۔" مراد نے عجیب سے انداز میں کہا، اُس نے سوچا تھا موتیا اب اُس سے پوچھے گی کہ کیوں لیکن اُس نے کچھ بھی کہے بغیر اپنے کان کی لو سے موتیا کا وہ پھول نکال کر پھینک دیا تھا۔ مراد گنگ ہوا تھا۔

''تم کو نظر لگ جائے گی، اس لیے کہہ رہا تھا۔'' اُس نے عجیب مجرمانہ انداز میں موتیا کو وضاحت دی۔ وہ مسکرائی تھی اور مشک اُٹھا کر چلنے لگی

اور مراد نے سوچا وہ کس کس چیز سے منع کرے اُسے نظر سے بچنے کے لیے...... آنکھیں کھولنے سے منع کرے جن میں ہیرے کی کنیاں چمکتی تھیں اور دیکھنے والے کا قرار لوٹ لیتی تھیں یا پلکیں جھکانے سے منع کرے جن کی جھالریں اُس کے گالوں پر جیسے سایہ کر دیتی تھیں مسکرانے سے منع کرے جس سے بہار آتی تھی یا ہنسنے سے جس سے وقت تھمنے لگتا تھا۔

وہ اُس کے پاس سے مشک لے کر چلی گئی تھی اور وہ کھڑا مسحورزدہ سوچتا ہی رہ گیا تھا۔

''سُنو مراد! میرے لیے کبھی اپنی جان نہ دینا۔'' وہ کرنٹ کھا کر پلٹا تھا۔ وہ اب اُس سے دور گاؤں جانے والی پگڈنڈی پر کھڑی تھی۔

''بتول نے مجھے بتایا ہے کہ ماہ نور سے شادی کرنا چاہتی ہیں تمہاری چوہدرائن جی اور تم نے اُنہیں اپنے آپ کو مار دینے کی دھمکی دی ہے...... ایسا مت کرنا۔''

مراد کچھ بول ہی نہیں سکا۔ اُسے شرم آئی کہ اُس کے گھر ہونے والی بات موتیا تک پہنچی تھی۔

''خود کو کچھ نہ کروں اور تمہارے بغیر زندہ رہ لوں...... تم رہ لوگی؟'' مراد نے عجیب سے انداز میں اُس سے کہا۔ موتیا بول نہیں سکی۔ وہ اُسے دیکھتی رہی پھر اُس نے کہا۔

''تمہارے بغیر رہ لوں گی، تمہیں کچھ ہو گیا تو نہیں رہ سکوں گی۔''

مراد مذاق اُڑانے والے انداز میں ہنسا تھا۔

''پھر پیار کھوٹا ہے تمہارا اگر میرے بغیر رہ سکتی ہو تو...... میں تو نہیں رہ سکتا اور نہ ہی رہوں گا اور یہ نہ سوچنا کہ میری ماں مجھے ماہ نور کا کرنا چاہتی ہے تو میں ہو جاؤں گا۔ میں نے تمہیں زبان دی ہے موتیا میں اس جہان میں بھی تمہارا ہوں، اگلے میں بھی تمہارا ہی رہوں گا۔''

اُس نے موتیا سے کہا تھا اور پھر وہاں رُکا نہیں گھوڑے پر چڑھا اور وہاں سے گھوڑا دوڑاتا ہوا چلا گیا۔ موتیا اُس کو تب تک جاتا دیکھتی رہی جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا تھا اور جہاں وہ اوجھل ہوا تھا وہاں موتیا نے اُس دن سورج طلوع ہوتے دیکھا تھا۔

☆☆☆

شکوراں صبح سویرے ہی بتول کو ساتھ لیے تاجور کے پاس پہنچ گئی تھی۔ وہ فجر کے بعد ہی ہر روز تاجور کے پاس آتی تھی، بتول بعد میں آتی تھی مگر آج بتول بھی اس کے ساتھ تھی۔ فجر کی نماز پڑھ کر تاجور کسی پیتی تھی اور شکوراں کسی تانبے کے گلاس میں ڈال کر بتول کے ساتھ اسے برآمدے میں دینے گئی تھی جہاں بیٹھ کر وہ تسبیح کرتی تھی۔

''آج بتول کیسے آ گئی اتنی صبح؟'' تاجور نے گلاس لیتے ہوئے کچھ حیرانی سے بتول کو دیکھا تھا جس نے اُسے کچھ نروس انداز میں سلام کیا تھا۔

''بس چوہدرائن جی! ایک بری خبر سن لی ہے تو بس ساری رات سو نہیں سکے میں اور میری بیٹی۔''

شکوراں نے بات کا آغاز کیا تھا، اسے خدشہ تھا وہ خاموش رہی تو بتول خود بات شروع نہ کر دے۔ تاجور نے منہ سے گلاس لگاتے لگاتے گلاس ہٹا لیا۔

''خیر تو ہے، کیسی بری خبر؟'' تاجور کو جو بھی اندیشہ لاحق ہوا تھا، موتیا کے حوالے سے ہوا تھا۔

''پرویز کو چوہدری صاحب نے سعید کے لیے موتیا کا رشتہ مانگنے کے لیے کہا ہے۔'' تاجور نے شکوراں کا

جملہ سنا۔ بتول اور شکوراں کے چہرے دیکھے اور پھر دوبارہ لسی کا گلاس منہ سے لگالیا۔ شکوراں اور بتول نے بے قراری سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

''ہاں۔'' لسی کا گلاس ختم کر کے رکھنے کے بعد تاجور نے بے حد مختصر جواب دیا اور ان دونوں کے پیروں کے نیچے جو باقی ماندہ زمین تھی وہ بھی نکل گئی تھی۔

''چوہدرائن جی! آپ کو تو بتایا تھا میں نے سعید اور بتول کے رشتے کی بات تو کب سے چل رہی ہے...... اب تو رشتہ تقریباً طے ہونے والا تھا اور سعید تو بتول کو بڑا پسند کرتا ہے...... میری بتول کی بھی وہیں مرضی ہے۔'' شکوراں نے اٹک اٹک کر اپنا کیس پیش کیا تھا اور تاجور نے دو جملوں میں نپٹا دیا تھا۔

''بتول کا رشتہ میں کسی بڑی اچھی جگہ کرواؤں گی۔ ابھی تو حویلی کو مسئلہ پڑا ہے، وہ حل ہونے دو۔ پرویز کی مرضی نہ ہوتی تو وہ کہہ دیتا کہ اس نے بتول کے ساتھ بیاہنا ہے بیٹا پر اس نے تو کچھ کہا ہی نہیں۔ بس آج ان شاء اللہ جائے گا۔ گاموں کے گھر اور بات طے ہو جائے گی۔ یہ اندر رکھو گلاس۔''

تاجور نے آخری جملہ عجیب سے انداز میں کہا۔ اس نے حویلی کے دروازے سے موتیا کو مشک کے ساتھ آتے دیکھا تھا اور اُسے بتول اور شکوراں بھول گئی تھیں۔ وہ اُٹھ کر صحن میں چلی گئی تھی اور بتول نے بے حد خفگی سے دبی آواز میں ماں سے احتجاج کیا تھا۔

''اماں! تو نے میرے لیے بس اتنا ہی کہنا تھا؟''

شکوراں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر جیسے اُسے چپ رہنے کا اشارہ کیا تھا۔ اُن دونوں نے موتیا کو نہیں دیکھا تھا۔ بتول پاؤں پٹختے ہوئے بڑی ناراضی سے اندر چلی گئی تھی اور شکوراں وہیں کھڑی رہی تھی، اس کا خیال تھا کہ وہ چوہدرائن سے اکیلے میں ایک بار پھر بات کرے گی اور تب ہی اس نے بھی موتیا کو حویلی کے صحن میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔ تاجور تب تک موتیا کے قریب پہنچ چکی تھی۔

''السلام علیکم چوہدرائن جی!'' اس نے تاجور کو دیکھتے ہی کہا تھا۔

''تو یہاں کیا لینے آئی ہے؟'' تاجور نے کسی چوٹ کھائے سانپ کی طرح پھنکارتے ہوئے اس سے کہا تھا۔

''ابا کو بخار ہے۔ وہ آج پانی دینے نہیں آسکتے تھے۔ اس لیے میں آئی ہوں پانی ڈالنے۔''

موتیا نے تاجور سے نظر نہیں ملائی تھی۔ اس کو اب احساس ہوا تھا کہ وہ اگر اس سے ناراض تھی تو کس وجہ سے ناراض تھی۔

''گاموں سے کہنا، چوہدرائن نے اس کی مشک کا پانی پینا چھوڑ دیا۔ اب نہ وہ یہاں کبھی پانی لے کر آئے نہ تیری ماں یہاں سے دانے لینے آئے۔'' موتیا ہل نہیں سکی۔

ہتک کا عجیب سا احساس تھا جو چوہدرائن کے لفظوں نے اُسے دیا تھا۔

''تو نے سنا نہیں، میں کیا کہہ رہی ہوں؟'' تاجور اس کے ساکت ہونے پر دھاڑی تھی۔

''جا یہاں سے اور اب دوبارہ کبھی اپنی شکل نہ دکھانا۔''

تاجور کی آواز اتنی بلند تھی کہ حویلی میں کام کرتے کئی ملازم متوجہ ہوئے تھے۔ موتیا کے ہاتھ اور پاؤں کپکپانے لگے تھے۔ اس سے پہلے اس نے کبھی ایسی بے عزتی نہیں دیکھی تھی۔ اس نے محبت، چاہت، قدر اور عزت کے علاوہ بچپن سے آج تک کچھ دیکھا ہی نہیں تھا۔ نفرت کا چہرہ اس نے آج دیکھا تھا اور اس کی ہیبت سے وہ وحشت زدہ ہو گئی تھی۔ اس نے بمشکل سانس لیا اور پلٹ کر جانے لگی جب تاجور نے کہا۔

''باپ ماشکی، دادا ماشکی، سات نسلیں ماشکی...... پانی بھرنے والے...... اور خواب دیکھ رہے ہیں زمینوں

کے مالک بننے کے...... دانے اُگانے کے...... حویلی والے کہلانے کے۔" موتیا کے قدموں کو جیسے اس کے جملوں نے زنجیر ڈال دی تھی۔

اس نے پلٹ کر تاجور کو دیکھا۔ وہ حویلی کے صحن کے بیچوں بیچ کسی سلطنت کی بے رحم ملکہ کی طرح کھڑی تھی، پورے کروفر اور جاہ وجلال کے ساتھ۔

"پانی بھی اُس کا...... دانہ بھی اُس کا...... وہ چاہے تو پانی والوں کو دانے والا کردے اور چاہے تو دانے والوں کو پانی کے لیے ترسادے۔" موتیا کی آواز اونچی تھی نہ لہجہ سخت پر ان جملوں نے تاجور کو ہولایا تھا اور پھر غضب ناک کیا تھا۔ وہ آگے بڑھی اور اس نے کھینچ کر موتیا کے گال پر چانٹا مارا۔

"یہ ہے تیری اس بات کا جواب پیراں دی...... آج جا کر ماں باپ سے پوچھنا کس کی دُعاؤں کے طفیل آئی ہے تو اس دنیا میں اور کس کے احسانوں پر پلی ہے تو۔"

موتیا کے گال پر تاجور کی پانچ انگلیوں کے نشان تھے پر اس نے گال پر ہاتھ نہیں رکھا تھا۔ نہ اس چانٹے کے درد سے آنکھوں میں آجانے والے آنسوؤں کو پیا تھا۔ وہ بس تاجور کو دیکھتی رہی، پلٹی اور پھر تقریباً بھاگتے ہوئے حویلی سے نکل گئی تھی۔ اس حویلی سے نکلتے ہوئے موتیا نے ایک بار پھر سورج کو غروب ہوتے دیکھا۔ وہ سب جیسے زوال کے وقت ہوا تھا اور پتا نہیں وہ کس کا زوال تھا۔

☆☆☆

"تیری عقل بھی کبھی کبھی گھاس ہی چرنے چلی جاتی ہے اللہ وسائی! موتیا کو کیوں بھیجا ہے تو نے حویلی میں پانی دینے؟ اتنا وزن اُٹھا کے کیسے اتنا چلے گی میری دھی اور پھر حویلی والے کیا سوچیں گے کہ ڈاکٹر بیٹی کو کن کاموں میں لگایا ہوا ہے گامو اور اللہ وسائی نے۔"

گامو نے بہت ناراضی سے اللہ وسائی کو کہنا شروع کیا تھا۔ جو اس کے لیے دلیہ بنا کر لائی تھی اور ناشتہ کرنے کے لیے اس نے اسے نیند سے جگایا تھا اور گامو نے اُٹھتے ہی سب سے پہلے موتیا کا پوچھا تھا اور اب وہ ناشتہ بھول بھال کے پریشان ہو رہا تھا۔

"میں نے تو روکا تھا گامو! پر تجھے موتیا کا پتا تو ہے۔ ضد کرنے لگی کہ بس میں ہی دے کے آؤں گی اور ابا کے جاگنے تک آجاؤں گی پھر ابا کو دوائی دوں گی تو یخنی بنا ابا کے لیے۔ وہ بخار میں ہمیشہ یخنی پیتا ہے۔" اللہ وسائی نے گامو سے کہا تھا۔ اس سے پہلے کہ گامو کچھ کہتا باہر کا دروازہ کسی نے زور سے بجایا تھا۔

"دیکھ، کتنی لمبی عمر ہے، ابھی نام لیا۔ ابھی آ بھی گئی۔" اللہ وسائی نے مطمئن سے انداز میں کہا اور باہر جانے لگی تو گامو نے اُسے روک دیا۔

"میں دیکھتا ہوں اسے جا کر۔ طبیعت ٹھیک ہے اب میری۔" وہ کہتے ہوئے اٹھ کر باہر نکلا اور اس نے دروازہ کھول دیا۔

موتیا کے بجائے دروازے پر پرویز کو کھڑا دیکھ کے وہ حیران رہ گیا تھا۔

"سلام گامو......" پرویز بڑی گرم جوشی سے اس سے ملا تھا اور گامو بڑی حیرانی سے۔

"تجھ سے کچھ بات کرنی ہے۔ اندر چل کے بیٹھتے ہیں۔" پرویز کی اگلی بات پر وہ جیسے اور حیران ہوا تھا۔

"ہاں ہاں پرویز بھائی! آجائیں اندر۔"

وہ کہتے ہوئے اسے لے کر اندر آگیا تھا۔ صحن میں پڑی چارپائی کو سیدھا کر کے وہیں ڈالتے ہوئے گامو نے اللہ وسائی کو آواز دی اور لسی لانے کے لیے کہا۔

"نہ نہ گامو! میں ناشتہ کر کے آیا ہوں اور لسی بھی پی کر آیا ہوں۔ بس تو بیٹھ کر بات سن لے میری۔" پرویز

نے فوراً سے پیشتر اسے منع کرتے ہوئے کہا تھا۔
"ہاں ہاں پرویز بھائی! تو کر بات۔" گامو نے چارپائی پر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔
"چوہدری شجاع نے مجھے بھیجا ہے تمہارے گھر۔ سعید اور موتیا کے رشتے کے لئے۔ میں تو جی جان سے راضی ہوں۔ تو بتا تیری کیا مرضی ہے؟ بیٹا میرا گبھرو جوان ہے۔ پڑھا لکھا بھی ہے تھوڑا بہت اور اتنی بڑی کمپنی میں کام کرتا ہے کویت میں۔ تیری دھی کو بڑا خوش رکھے گا۔"
پرویز بولتا ہی چلا گیا تھا۔ اس نے گامو کے چہرے کے تاثرات دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ یوں جیسے اُسے یقین تھا کہ گامو خوشی خوشی فوراً سے پہلے اسی بات پر ہاں کر دے گا۔ پر گامو گم صم اسے نہیں دروازے کی دہلیز پر کھڑی موتیا کو دیکھ رہا تھا جو بالکل اُس ہی وقت گھر میں داخل ہوئی تھی اور اس نے دہلیز پر کھڑے کھڑے پرویز کی ساری باتیں سنی تھیں اور وہ جیسے ہل ہی نہیں پا رہی تھی اور کچھ یہی حال اللہ وسائی کا بھی تھا۔ جو برآمدے میں کھڑی تھی۔ پرویز نے بھی بالکل اُسی وقت موتیا کو دیکھ لیا تھا اور اس نے بڑی خوش دلی سے ہنستے ہوئے کہا تھا۔
"لو موتیا بھی آ گئی۔ ماشاء اللہ میں نے تو آج بڑے سالوں بعد دیکھا ہے۔ ٹھیک کہہ رہی تھی تیری بھرجائی کہ ماشاء اللہ بڑے رنگ روپ والی ہے۔ میرے سعید کے ساتھ اس کی جوڑی بڑی سجے گی۔"
پرویز ہنسا تھا۔ موتیا دہلیز سے اندر آ گئی اور گامو کے کچھ کہنے سے پہلے اس نے پرویز سے کہا تھا۔
"چاچا! میں نے سعید سے شادی نہیں کرنی۔" پرویز اس کے جملے پر جیسے حیران ہوا تھا۔ اس نے گامو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔
"رشتوں کی باتوں میں دھیاں نہیں بولتیں موتیا۔ میرا تو سعید بھی چپ بیٹھا رہا۔ میری بات سن کر۔" پرویز نے جیسے گامو کو کچھ کہنے کے لیے اُکسانے کی کوشش کی تھی۔
"سعید کا رشتہ بتول سے کر دیں آپ کیونکہ وہ بتول کو پسند کرتا ہے۔" موتیا نے ایک بار پھر گامو کے کچھ کہنے سے پہلے پرویز سے کہا تھا اور پرویز کو جیسے مرچیں لگ گئی تھیں۔
"تیرے مشورے کی ضرورت نہیں ہے مجھے۔ میرا بیٹا ہے اور فرماں بردار بیٹا جہاں دل کرے گا اس کی شادی کروں گا میں۔ اور گامو تو بھی منہ سے کچھ پھوٹ یا ساری باتیں تیری بیٹی ہی کرے گی مجھ سے۔" پرویز اب تپا ہوا تھا۔
"میرا بھی وہی جواب ہے جو موتیا کا ہے پرویز۔"
پرویز کو کم از کم گامو سے یہ جملہ سننے کی توقع نہیں تھی جو اس نے سنا تھا۔ اس کا خیال تھا، بیٹی کچھ بھی کہہ رہی ہو، کم از کم گامو سوچنے کے لیے وقت ضرور مانگے گا۔
"اور چوہدری صاحب! ان کو کیا کہوں جا کے؟" پرویز بھی یک دم ہتھے سے اکھڑا تھا۔
"ان کو بھی جا کے میرا انکار پہنچا دے اور تو کیوں جائے گا، میں خود بات کرلوں گا ان سے۔" گامو نے کہا تھا اور پرویز ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔
"مجھے بھی کوئی شوق نہیں تیری عیبوں والی بیٹی کو ڈھکنے کا جس پر پورا گاؤں تھو تھو کر رہا ہے۔ یہ تو میں چوہدری صاحب کے کہنے پر لحاظ میں آ گیا تھا۔ حالانکہ تیری بیٹی اور چوہدری مراد کا نام تو گاؤں کے بچے بچے کی زبان پر ہے۔"
پرویز نے بے حد حقارت سے اگلے جملے بولے تھے اور اس سے پہلے کہ گامو یا اللہ وسائی کچھ کہتے، وہ ان کے گھر سے نکل گیا تھا مگر اس کے الفاظ پگھلے ہوئے سیسے کی طرح موتیا کے کانوں میں اترے تھے اور اس کے ماں باپ کی سماعتوں میں بھی۔

اس نے ساری عمر ماں باپ کو ہر ایک کے سامنے اپنی وجہ سے سر اٹھاتے ہی دیکھا تھا اور آج پہلی بار کوئی اس کے کردار پر انگلی اٹھا کر گیا تھا۔ موتیا کا دل پہلی بار ڈوب کے مرجانے کو چاہا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ سے نظریں نہیں ملا پا رہی تھی جو اسی کی طرح گم صم کھڑے تھے۔ وہ جملے ان پر بھی قیامت کی طرح بھاری تھے پر اس سے بڑا غم انہیں یہ تھا کہ وہ سب موتیا نے بھی سن لیا تھا۔

موتیا سر جھکائے اگلے کئی لمحے اسی طرح کھڑی رہی اور پھر اسی طرح سر جھکائے ہوئے وہ اندر کمرے میں چلی گئی تھی۔ اس نے مشک اپنی پشت سے اتار کر وہیں رکھ دی تھی جہاں وہ کھڑی تھی۔ یک دم ہی وہ مشک اُسے منوں بھاری لگنے لگی تھی۔ گاموا ور اللہ وسائی اُسے اندر جانے سے روک نہیں سکے تھے۔ جب وہ اندر چلی گئی تو گامو نے بیوی سے کہا۔

''تجھے کہا تھا نا، میں نے کہ چوہدرائن نہیں لائے گی رشتہ۔ پر موتیا کو جا کر کہہ دے کہ روئے نہ غم نہ کرے۔ اس کو کہنا اس کا باپ لا کر دے گا اسے وہ چیز جس سے وہ پیار کر بیٹھی ہے...... چاہے وہ چوہدری مراد ہی کیوں نہ ہو۔ بس وہ روئے نہ۔ چوہدری شجاع نے مجھ سے کہا تھا تیرا ایک احسان ہے مجھ پر گامو تو نے چوہدری مراد کی جان بچائی ہے۔ جب بھی اس احسان کی قیمت لینی ہو تو آجانا۔ تو جو مانگے گا میں دوں گا۔ آج جاؤں گا چوہدری شجاع کے سامنے اپنی جھولی پھیلا کے...... مانگوں گا اس سے اسی احسان کی قیمت۔''

گامو نے اللہ وسائی سے کہا تھا اور پھر وہاں رُکے بغیر باہر نکل گیا تھا۔ اللہ وسائی نے ایک نظر باہر جاتے ہوئے گامو کو دیکھا، ایک نظر اندر اُس کمرے کے دروازے کو جہاں سے موتیا گئی تھی اور اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ کیا کرے۔ گامو کا انتظار کرے یا موتیا کو جا کر روتا ہوا دیکھے۔ دونوں ہی کام مشکل تھے۔ دونوں ہی کام جان جوکھوں والے تھے۔

☆☆☆

موتیا کے گال پر پڑتا ہوا تھپڑ شکوراں نے دیکھا تھا اور جیسے اُسی لمحے اُس نے سعید کے لیے دوبارہ بات کرنے کا ارادہ چھوڑ دیا تھا۔ بتول اندر باورچی خانے میں ایک پیڑھی پر اس کے انتظار میں بیٹھی تھی اور جب شکوراں اندر آئی تو اس نے ماں کو دیکھا تھا۔

''دیکھ بتول! جانے دے سعید کو...... میں تیرا رشتہ کسی بہت اچھی جگہ کرواؤں گی۔ سعید کی تو کوئی اوقات ہی نہیں ہے۔'' اس نے دوسری پیڑھی پر بتول کے پاس بیٹھ کر اسے مدھم آواز میں پچکارتے ہوئے سمجھانا شروع کیا تھا اور بتول نے اس کی بات بیچ میں ہی کاٹ دی تھی۔

''یعنی چوہدرائن نے پھر انکار کر دیا ہے؟'' شکوراں نے اس کا چہرہ دیکھا پھر کچھ شکست خوردہ انداز میں کہا۔

''میں نے بات ہی نہیں کی دوبارہ ان کے ساتھ وہ بڑے غصے میں ہیں۔'' بتول نے یک دم ماں سے کہا۔

''ٹھیک ہے اماں تو پھر اس مسئلے کو بتول کو حل کرنے دے۔ تیری بزدلی اور لحاظ مجھے ڈبو دے گا۔'' وہ کہہ کر وہاں سے جانے لگی تھی۔

''نہ نہ بتول! چوہدرائن سے بات نہ کرنا۔ انہوں نے تو ابھی موتیا کے چہرے پر تھپڑ مارا ہے۔ وہ تم سے بھی بدتمیزی کریں گی۔'' شکوراں کی جان نکل گئی تھی۔

''اماں! میں چوہدرائن کے پاس نہیں جا رہی۔ اس مسئلے کا حل ان کے پاس نہیں ہے چوہدری مراد کے پاس ہے۔'' اس نے دروازے میں کھڑے ہو کر کہا تھا اور پھر برق رفتاری سے وہاں سے چلی گئی تھی۔ شکوراں کو لگا تھا حویلی کی چھت بس اب اس کے سر پر گرنے ہی والی تھی۔

☆☆☆

''چوہدری صاحب میں تو آپ کے حکم پر سر کے بل دوڑتا ہوا گیا تھا گامو کے گھر...... پر اس کا اور اس کی

بیٹی کا دماغ بڑا خراب ہے۔''

پرویز گامو کے گھر سے سیدھا حویلی آیا تھا اور اس نے چوہدری شجاع سے اکیلے میں ملنے کی درخواست کی تھی اور اب وہ اسے سب کچھ سنا رہا تھا۔

''صاف انکار کر دیا دونوں نے اور گامو نے تو مجھ سے یہ بھی کہا کہ میں اس کا انکار آپ تک بھی پہنچاؤں۔ میں تو اس کی کمین کے تیور دیکھ کے حیران ہوا ہوں چوہدری صاحب۔ گامو ایسے بھی بات کر سکتا ہے میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔''

پرویز، چوہدری شجاع سے کہہ رہا تھا اور چوہدری شجاع حقہ کی نے ہونٹوں سے لگائے ہوئے اس کی باتوں پر کچھ سوچتے ہوئے حقے کے کش لگاتے رہے۔ انہوں نے اس مسئلے کا ضرورت سے زیادہ آسان اور سیدھا حل ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔ چوہدری شجاع نے دل ہی دل میں اعتراف کیا تھا۔

''چوہدری صاحب! وہ گامو آیا ہے کہہ رہا ہے آپ سے ملنا ہے۔''

بالکل اُسی لمحے ملازم نے اندر آ کر چوہدری صاحب کو گامو کے آنے کی اطلاع دی تھی اور چوہدری شجاع اور پرویز دونوں چونکے تھے۔

''ٹھیک ہے، بلاؤ اُسے اندر اور پرویز تو اب جا...... تجھ سے میں بعد میں بات کروں گا۔'' چوہدری شجاع نے ساتھ ہی پرویز کو جانے کا اشارہ بھی کر دیا تھا۔

''چوہدری صاحب! آپ نے رکھ کے اس کی بے عزتی کرنی ہے۔ اس نے اپنے آپ کو سمجھ کیا لیا ہے؟''

پرویز نے اٹھتے ہوئے جیسے چوہدری شجاع کو اکسایا۔ وہ حقے کی نے ہونٹوں میں دبائے اُسی طرح بیٹھے رہے انہوں نے پرویز کی بات پر نہ ہوں کی تھی نہ ہاں۔

اندر آتے ہوئے گامو اور پرویز کا آمنا سامنا دروازے پر ہوا تھا۔ پرویز نے اُسے تنفر سے دیکھا تھا اور گامو نے اُسے دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

وہ سیدھا آگے آیا تھا اور چوہدری شجاع کے پیروں میں ان کے پیر پکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔

''ایک بار چوہدری مراد کی جان بچائی تھی میں نے اور آپ نے کہا تھا، بڑا احسان کیا ہے میں نے آپ پر اور جب چاہوں اُس احسان کا بدلہ مانگنے آ سکتا ہوں اور جو بھی مانگوں گا آپ انکار نہیں کریں گے تو آج اسی احسان کا بدلہ مانگنے آیا ہے گامو۔ موتیا کو اپنی بیٹی بنا لیں چوہدری مراد کے ساتھ اس کی شادی کر دیں۔''

گامو نے چوہدری شجاع کے پیروں میں بیٹھ کر روتے ہوئے جو کہا تھا۔ اُس نے چوہدری شجاع کو باندھ کر رکھ دیا تھا۔ وہ سارے جملے اور لفظ بھک سے ان کے دماغ سے غائب ہو گئے تھے جو انہوں نے گامو کو سمجھانے کے لیے سوچ کر رکھے ہوئے تھے۔

حقے کی نے گڑگڑاتے ہوئے ۔ چوہدری شجاع جیسے کوئی جواب ڈھونڈنے کی کوشش کرنے میں لگے رہے اور اپنے پیروں پر وہ گامو کے آنسوؤں کی نمی محسوس کرتے رہے۔

ایک لمبی خاموشی کے بعد چوہدری شجاع نے حقے کی نے ہونٹوں سے ہٹائی تھی۔

''ٹھیک ہے گامو! تجھ کو جو زبان دی تھی اس سے پھروں گا نہیں میں۔ آئیں گے موتیا کا رشتہ لینے اور بس دنوں میں شادی کر کے لے جائیں گے۔''

گامو نے سر اٹھا کر چوہدری شجاع کا چہرہ دیکھا تھا اور اس پر جیسے شادی مرگ طاری ہو گئی تھی۔ وہ کچھ بولنا چاہتا تھا اس سے بولا نہیں گیا۔ ہنسنا چاہتا تھا۔ ہنسا نہیں گیا۔ رونا چاہتا تھا رویا بھی نہیں گیا۔ چوہدری شجاع شاید اس کی کیفیت جان گئے تھے وہ نرمی سے اُسے تھپک کر اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

☆☆☆

مراد کو بتول کی بات سمجھ میں ہی نہیں آئی تھی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ کس کا رشتہ گیا ہے موتیا کے لیے؟"

وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے باہر سے اپنے کمرے میں آیا تھا جب بتول اس کے کمرے کا دروازہ بجا کر اندر آ گئی تھی اور مراد حیران ہوا تھا۔ حویلی میں کسی مرد کی موجودگی میں کوئی بھی ملازمہ اس کے کمرے میں نہیں جاتی تھی...... اور یہاں وہ دن دہاڑے آ کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی تھی اور پھر اس نے چوہدری مراد کو جو بتانا شروع کیا تھا اس نے اسے کنفیوز کر دیا تھا۔

"چوہدرائن اور چوہدری صاحب نے میرے چاچے کے بیٹے کا رشتہ موتیا کے گھر بھیجا ہے۔ سعید سے میں پیار کرتی ہوں، چوہدری جی اور بچپن سے کرتی ہوں۔ میرے ساتھ ظلم نہ ہونے دیں۔"

وہ بتول کا چہرہ دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔

"کچھ نہیں ہوگا۔ تو جا یہاں سے۔" بتول نے آس کے ساتھ مراد کو دیکھا تھا۔

"آپ مجھے زبان دے رہے ہیں نا چوہدری جی؟"

"ہاں۔ زبان دے رہا ہوں۔ تیرے چاچے کے بیٹے کے ساتھ نہیں ہوگا موتیا کا رشتہ۔ تیرے ساتھ ہی ہوگا۔" بتول کو لگا جیسے کسی نے اس کے سینے سے ایک پتھر ہٹا لیا تھا پر اسے اندازہ نہیں تھا وہ پتھر اب مراد کے سینے پر آ گیا تھا۔ وہ بتول کے جانے کے بعد سیدھا تاجور کے کمرے میں پہنچ گیا تھا۔

"آپ نے سعید کا رشتہ موتیا کے گھر بھیجا ہے؟" اس نے آتے ہی ماں سے کہا جو اپنی الماری کھولے اپنے کپڑے نکال رہی تھی۔ تاجور نے پلٹ کر بیٹے کو دیکھا پھر بڑے اطمینان سے اپنا کام جاری رکھتے ہوئے اس نے کہا۔

"تجھے کس نے بتایا؟"

"مجھے بتول نے بتایا ہے۔ وہ سعید سے پیار کرتی ہے اور آپ نے سعید کا رشتہ موتیا کے لیے بھجوا دیا۔" وہ بے حد خفگی سے تاجور سے بات کر رہا تھا اور تاجور بڑے اطمینان کے ساتھ اپنا کام کرتے ہوئے اس کی بات سنتی رہی جب اس نے اپنی بات مکمل کر لی تو اس نے کہا۔

"تجھے بتول نے کہا کہ سعید کا رشتہ ہم نے بھجوایا ہے تو تو ماں سے پوچھنے آ کھڑا ہوا ہے حالانکہ یہ سوال تجھے موتیا سے کرنا چاہیے تھا۔" مراد ماں کی بات اور انداز پر الجھا تھا۔

"اس سے پوچھنا چاہیے تھا کہ تیرے ساتھ چکر چلا کر وہ سعید کے رشتے پر غور کیوں کر رہی ہے؟"

"امی! میں سمجھ نہیں پا رہا آپ کی بات کو۔" مراد کی سمجھ میں نہیں آیا تھا وہ تاجور سے کیا پوچھے۔

"جب بتول سعید سے پیار کرتی ہے تو موتیا کو بھی پتا ہوگا پھر اس نے کیوں آنے دیا سعید کے ماں باپ کو اپنے گھر۔" تاجور نے تیکھے انداز میں اس سے کہا۔

"آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟"

"میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ موتیا تجھے بے وقوف بنا سکتی ہے کیا سعید کو نہیں بنا سکتی؟ اختر کو نہیں بنا سکتی؟ شریف کو نہیں بنا سکتی؟" ایک لمحے کے لیے ان جملوں پر مراد بول ہی نہیں سکا۔

"اماں! آپ موتیا کے کردار پر کیچڑ اچھال رہی ہیں۔ ایسا مت کریں۔" اس نے ماں کو سختی سے ٹوکا تھا اور اس کی ماں ہنسی تھی۔

"مجھے کیا ضرورت ہے موتیا پر کیچڑ اچھالنے کی۔ اس کام کے لیے وہ خود کافی ہے۔ چار دنوں میں تجھے پاگل کر دیا۔ لندن میں پڑھنے لکھنے والے بیرسٹر کو۔ تو سوچ گاؤں کے سیدھے سادھے لڑکے تو اس کے سامنے

پانی بھرتے ہوں گے۔ اور میں نہیں کہتی کہ بس موتیا ہی خراب ہے۔ گاؤں کی کمی کمینوں کی لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں مراد۔ درجنوں لڑکوں کے ساتھ تعلق ہوتا ہے ان کا، اسی لیے تو دو منٹ لگتے ہیں انہیں کسی بھی لڑکے کو پھنسانے کے لیے۔ تو جا کر موتیا سے پوچھ کہ سعید کون ہے اور اُسے کیسے جرأت ہوئی اس کے لیے رشتہ بھیجنے کی۔ اور بتول کو تو پتا ہی اب چلا ہوگا کہ اس کی سہیلی اسے بھی دھوکا دے رہی تھی۔"

تاجور کو بیٹے کے چہرے پر کئی رنگ آتے نظر آئے تھے اور جب اُس کی خاموشی سے اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ اس کی باتوں میں آ گیا تھا تب مراد نے کہا تھا۔

"اماں ساری دُنیا کی لڑکیوں کا کردار ایک طرف...... موتیا ایک طرف...... آپ میری ماں نہ ہوتیں تو میں یہ سب کہنے والے کی زبان کھینچ لیتا یا دوبارہ اس کی شکل ہی نہ دیکھتا۔ پر آپ ماں ہیں، آپ کے سامنے میں صرف ہاتھ جوڑ سکتا ہوں کہ آپ یہ نہ کہیں۔ آپ جو بھی کہہ لیں۔ جو بھی کر لیں وہ میرے دل سے نہیں نکلے گی۔"

تاجور کو لگا وہ اس وقت ریت کے مجسمے کی طرح بھربھرا کر بکھری تھی۔ کیا تھی یہ موتیا کہ اس کا بیٹا ماں کو جھوٹا کہہ رہا تھا۔ کسی ثبوت اور گواہی کے بغیر بھی موتیا کو سچا مان رہا تھا۔

تاجور کا بس چلتا تو وہ اس لمحے کسی جن کی طرح موتیا کو مکھی بنا دیتی اور مکھی بنا کر بھی دیوار سے نہ چپکاتی، اسے اپنے پاؤں کے نیچے مسلتی۔

"آپ کہہ رہی ہیں کہ آپ نے سعید کا رشتہ نہیں بھجوایا تو میں مان لیتا ہوں لیکن میں خود بات کروں گا سعید اور سعید کے باپ سے کہ وہ کیوں گئے ہیں موتیا کے گھر؟"

وہ کہہ کر وہاں سے نکل گیا تھا۔ اور تاجور کا دل چاہا، وہ اس الماری کا ہر کپڑا نکال کر دوبارہ کھول کھول کر پھینکے جنہیں اس نے ابھی تہہ کر کر کے رکھا تھا۔ وہ اس کی اکلوتی اولاد تھا اور وہ اس کے سامنے موتیا کا کلمہ پڑھ کے گیا تھا۔

☆☆☆

اللہ وسائی بڑی ہمت کر کے موتیا کے کمرے میں آئی تھی اتنے سالوں میں بیٹی کی آنکھ میں آنسو اس نے کبھی آنے ہی نہیں دیے تھے اور اب جس وجہ سے وہ آ رہے تھے۔ اللہ وسائی کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

موتیا نے ماں کو چوکھٹ میں کھڑے دیکھا تو اس نے دوپٹے سے اپنا چہرہ رگڑ کر صاف کیا تھا۔ اللہ وسائی پاس آ کر بیٹھ گئی۔

"گامو کہہ کر گیا ہے تو رومت وہ چوہدری کو منا لے گا۔" موتیا نے اپنی سادہ لوح اور سادہ دل ماں کو دیکھا جو پہاڑ سے نہر نکالنے کا خواب دکھا رہی تھی اُسے۔

"میں اس لیے نہیں رو رہی اماں! میں اس لیے رو رہی ہوں کہ میری وجہ سے گاؤں میں آپ دونوں کا سر نیچا ہوا۔ عزت پر حرف آیا۔ موتیا مر جاتی تو یہ نہ ہوتا۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی اور اللہ وسائی تڑپ اُٹھی تھی۔

"لے بھلا یہ کیا کہہ رہی ہے تو؟ تو تو ہماری سوہنی دھی ہے۔ اللہ نہ کرے تجھے کبھی کچھ ہو۔ تجھے تو ہماری حیاتی لگ جائے۔ ارے جھلیے...... کوئی گناہ تھوڑی کر دیا ہے تو نے۔" اللہ وسائی الفاظ ڈھونڈ ڈھونڈ کر موتیا کو تسلی دے رہی تھی اُس کا دل بہلا رہی تھی آنسو خشک کرنے کی کوشش کر رہی تھی بالکل اسی طرح جس طرح وہ بچپن میں اُسے لوریاں دیا کرتی تھی اور لوریاں سن کر وہ یا ہنسنے لگتی یا سو جاتی پر اب وہ بس ماں کا چہرہ ہی دیکھتی رہی تھی۔

"تو نے کیا سر نیچا کرنا ہے ہمارا موتیا...... تو تو وہ وجہ ہے جو ہمارے جینے کا آسرا بنی ہے۔ تجھے سو غلطیاں سو خون سو گناہ معاف کر سکتے ہیں۔ میں اور تیرا ابا۔ تیرے لیے اللہ نے ہمارے سینوں میں دل نہیں سمندر ڈال دیا ہے۔"

وہ اسے ساتھ لگا کر جیسے لوری دینے لگی تھی اور موتیا بچپن ہی کی طرح سنبھل رہی تھی بہل رہی تھی اس کے

آنسو تھمنے لگے تھے۔

"اماں! میں اب کبھی مراد کا نام نہیں لوں گی۔"

اس نے اپنے آنسو پونچھنے کے بعد جیسے ماں کو حلف دیا تھا بالکل اس طرح جس طرح بچپن میں مراد کا اسکول چھٹنے کے بعد اس نے دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ اللہ وسائی کچھ کہتی، باہر سے گامو کی اونچی اونچی آوازیں آنے لگی تھیں۔ وہ دونوں کو پکار رہا تھا اور پکارتا ہی جا رہا تھا۔ اللہ وسائی کچھ گھبرائی ہوئی اُٹھ کر باہر بھاگی تھی اور موتیا بھی اس کے پیچھے لپکتی ہوئی گئی۔

"چوہدری صاحب مان گئے ہیں۔ کہہ رہے ہیں رشتہ لے کر آئیں گے چوہدرائن کے ساتھ اور بس پھر دنوں میں لے جائیں گے موتیا کو مراد کی دُلہن بنا کر۔"

گامو نے اللہ وسائی کو دیکھتے ہی ایک ہی سانس میں اُسے جو خوشخبری سنائی تھی۔ اللہ وسائی کو اس پر یقین آیا تھا نہ موتیا کو۔ جس نے دم سادھے گامو کو دیکھا تھا۔ جواب صحن میں ناچتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"ڈھولک رکھ اللہ وسائی...... مٹھائی منگوا...... لوگوں کو بلا...... دیکھ، ہمارے گھر خوشیاں آ رہی ہیں۔ شہزادہ آ رہا ہے ہماری پریوں جیسی بیٹی کو بیاہ کر لے جانے کے لیے۔"

گامو ناچتا جا رہا تھا اور کہتا جا رہا تھا۔ اور اللہ وسائی اور موتیا ایک دوسرے کا چہرہ دیکھ رہی تھیں...... بے یقینی کے ساتھ...... یہ ہو گیا تھا تو کیسے ہو گیا تھا۔

☆☆☆

چوہدری شجاع کی بات پر تاجور کا دماغ جیسے گھوم کر رہ گیا تھا۔

"آپ نے گامو کو کہہ دیا کہ ہم رشتہ لے کر آئیں گے۔ چوہدری صاحب! آپ مذاق کر رہے ہیں۔"

تاجور کو یقین تھا یہ مذاق کے علاوہ کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ وہ تو ابھی کل تک اس کے ساتھ مل کر سعید سے موتیا کا رشتہ کروانے کے چکروں میں تھے اور اب انہیں راتوں رات کیا ہو گیا تھا۔

"گامو نے مراد کی جان بچائی تھی اور میں نے تب زبان دی تھی اُسے کہ وہ اس احسان کا بدلہ جو بھی مانگے گا، میں دوں گا اُسے اور آج وہ۔ اسی احسان کا بدلہ مانگنے آیا تھا اور میں نہ نہیں کر سکا۔ نہ کر دیتا تو پھر دوبارہ کوئی چوہدریوں کی زبان پر اعتبار نہ کرتا۔"

چوہدری شجاع نے اپنا کھسہ اُتارتے ہوئے اُسے بتایا تھا۔ وہ گھر میں کھانا کھا کر آرام کرنے آئے تھے جب انہوں نے تاجور پر یہ قیامت توڑی تھی۔

"آپ کی زبان ایک ماں کی مرضی سے زیادہ بڑی ہو گئی؟" تاجور نے صدمے کی کیفیت میں کہا تھا۔

"ہاں تاجور زبان ہر چیز سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ تو اب بیٹے کی مرضی کے سامنے سر جھکا دے۔"

"وہ تو میں مر کر بھی نہ کروں۔ زبان آپ نے دی ہو گی میں نے نہیں۔" تاجور نے اُکھڑے ہوئے لہجے میں چوہدری شجاع سے کہا تھا۔

"میں دو چار دن میں اس کا رشتہ مانگنے جا رہا ہوں۔ مراد کو بتا دیا ہے میں نے۔ تو نے ساتھ چلنا ہے تو چل نہیں تو میں خود ہی اکیلا سب طے کر آؤں گا۔ اب تو زہر کھایا نہ کھا، دس تاریخ کو مراد کی بارات لے جاؤں گا میں موتیا کے گھر۔"

چوہدری شجاع نے دوٹوک انداز میں کہا اور چلے گئے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



شازیہ الطاف ہاشمی

احساس

سکینہ انتہائی حساس تھی۔ اپنا احساس کرنا ہمیشہ بھول جاتی۔ آج بڑی عید تھی گائے کے گوشت کی بڑی پلیٹ اس کے سامنے رکھی تھی۔ اختر عباس افسردہ کھڑا تھا اکثر ہی شکوے کرتا رہتا۔

"حسنین نے اس دفعہ گائے میں حصہ ڈالا ہے، عابد پوری گائے خرید لایا ہے اور محمود علی اس نے چار چار چھتروں کی قربانی کی اور میں ایسا بدنصیب کہ کبھی حصے کی بھی جرات نہ کرسکا۔"

باورچی خانے کے بیچوں بیچ بیٹھی سکینہ نے خواہ مخواہ ہی ڈبے الٹ پلٹ کے رکھنا شروع کر دیے۔

یقیناً اسی کا قصور نکلے گا۔

جب جیب میں پیسے آیا کرتے تھے تب اختر کی آنکھیں اسے کسی اجنبی کی آنکھیں لگا کرتی تھیں اس کے اندر اس کے سوا کسی کے لیے کوئی گنجائش نہ رہی تھی کبھی اپنے لیے سوچنا، اپنوں کے لیے ہی چاہتے رہنا۔

اس اپنے پن میں کم از کم سکینہ کا کوئی حصہ نہیں تھا تو اس کے ساتھ رہنے کا کیا فائدہ، جب دل ہی کہیں اور اٹکا رہتا ہو۔ اسے کسی اور سے محبت رہی ہو یا نہ رہی ہو مگر وہ اندر اپنے خاندان، اپنے ہی بہن بھائیوں کی محفلیں سجائے رکھتا تھا۔

اماں کو مرے ایک عمر گزر گئی۔ ایک ایک کر کے کتنے لوگ گزر گئے مگر اختر عباس اپنے ماضی سے کبھی لوٹ ہی نہ سکا تھا ایسی ہی پکاروں میں گھرا رہا کرتا۔ پکارتا تو اسے اب کوئی بھی نہ تھا۔ مرے ہوئے لوگ کسی کو بھی نہیں پکارا کرتے۔ ایسے ہی سکینہ نے بھی اختر عباس کو پکارنا چھوڑ رکھا تھا جہاں کہیں وہ محفل سجا کر بیٹھا ہوتا۔ سکینہ منظر سے ہٹ جاتی۔ بھلا ماضی میں رہنے والا انسان ناکام نہ ہو تو اور کیا ہو، ہر وقت سود و زیاں کا حساب رکھنے والا زندگی کیا خاک جیے گا۔

کچھ لوگوں کو ماضی میں رہنے کی عادت ہوتی ہے۔ ماضی کو اپنے لیے سزا بنا لیتے ہیں اور کڑی سے کڑی سزا خود کو دیتے رہنے میں سکون محسوس کرتے ہیں۔

اختر عباس بھی ان ہی لوگوں میں سے تھا اور ناشکرا بھی تھا۔ ڈبے الٹتے پلٹتے وہ نمک گرا بیٹھی تھی۔ جواب آہستہ آہستہ سمیٹ رہی تھی جب روپیہ ہاتھ لگے تب ہی تو وہ بھی کچھ بچا کر دکھائے، اتنی سگھڑ تو وہ بھی تھی کہ کم از کم آٹھ ہزار کا چھوٹا حصہ تو ڈال کر دکھا دے۔ اختر عباس پیسے سے بہت محبت کرتا تھا مگر روپیہ اس سے محبت نہیں کرتا تھا جبھی تو ہر وقت الجھا ہی رہتا۔ ہزار روپے لگ گئے۔ دو ہزار لگ گئے اگر جو بھی پیسے سکینہ کے ہاتھ لگیں قسم جیسی بات ہے کہ وہ دو ہزار کی جگہ ہزار میں گزارا کر کے دکھائے یہ نفیس مہنگے کپڑے اور جوتے جو اختر خرید کر لاتا ہے، وہ بھی نہ خریدے۔

اس سے محبت نہ کرنے کے باوجود نجانے کیوں اس کی ہر بات پہ یہ دل دعا ضرور کرتا کہ اللہ تو اختر عباس کے لیے بھی کشادگی اور آسائش لکھ دے۔ اسے بھی ناشکرے پن سے بچا لے۔

سکینہ بہت کم پڑھی لکھی تھی مگر دنیا کے سارے سبق بچپن کی یتیمی نے سکھا دیے۔ ماں کی شکل اس نے کبھی دیکھی نہیں اور باپ بھی جلد ہی دنیا چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ چاچی اچھی تھی مگر غریبی نے اسے اچھا کب رہنے دیا تھا اس کے پاس اگر اتنا دھن دولت ہو تو وہ کیونکر خرچ نہ کرتی، غریب یتیم کی بددعائیں لیتی۔ کوئی بھی اپنے جی سے کسی کی بددعا نہیں لیتا۔ کچھ لے لیتے ہیں جان بوجھ کر کیونکہ ان کا ٹھکانہ جلتی آگ ہے۔" سکینہ کے اندر غریبوں والی کمینگی بھی نہ تھی۔ کم پا کر بھی وہ بہت زیادہ شکر ادا کیا کرتی تھی مگر ایک مرد کے ساتھ گزارہ کرتے وہ اکیلی ہی نباہ رہی تھی۔ خاندان والے اس نے دیکھے نہ تھے اور جس نے دیکھے تھے وہ پیچھے مڑ کر دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

"اتنے سارے کپڑے خرید کر لے گیا تھا۔ ساجد، اپنے بیوی کے، بچے کے اور میں مہینہ تک رہا تھا اس کا۔ دس ہزار روپے۔ اتنی ساری رقم اس... نے بچا کیسے لی آخر؟"

"تم اگر مجھے تھوڑے پیسے دیتے، میں بھی بچا لیتی۔"

گھٹے گھٹے کنویں سے آواز بالآخر نکل ہی آئی تھی۔

"سبزی کے پندرہ سو دے سکتا ہوں اتنی ہی میری گنجائش ہے۔"

پورا سیب کا سیزن گزرا اس نے سیب کی شکل تک نہ دیکھی تھی پھر انگور آئے، ایک آدھ دانہ چکھ بھی لیا تو نہ چکھنے جیسا۔ کچے پکے امرود، مالٹے وہ بس تھوڑا سا

تھوڑا لیتی رہی۔ اتنا کہ بس چار چھ پھانکیں تھوڑا سا نمک۔ اپنا دل مارنا مشکل ہوا کرتا ہے مگر کسی کے لیے یہ دل مر بھی سکتا ہے اور جی بھی اٹھتا ہے محبت کرنا آسان ہے مگر نبھانا پل صراط سے کہاں کم ہے۔

تھوڑا سا سالن اور ایک روٹی ہی اس کے نمکین حلق سے گزر سکی باقی بچوں کو ہی کھلایا تھا اور اسے پتا تھا کہ اختر یہ سالن نہیں کھائے گا پھر بھی دیر تک ڈونگے میں ڈھک کر بیٹھی رہی تھی، وہ باہر سے کھا کر آیا تھا۔ جب ہی بستر پہ کروٹ بدلے بنا سو چکا تھا اور ایک فیصلہ سکینہ نے بھی سوتے وقت کر لیا تھا۔

"آلو اور دال کے پکوڑے تو تیل ہی مانگتے ہیں اس نے تھوڑے سے تیل میں تھوڑے سے ہی پکوڑے تلے اور خود ایک آدھ پہ ہی گزارا کر لیا تھا۔ کھا بھی لیے تو کون سا منہ پر پکوڑے کھا کر آنے کا لیبل لگ جاتا ہے اور نہ بھی کھائے تو کوئی یہ نہیں کہتا کہ سکینہ تم نے پکوڑے کیوں نہ کھائے، پلو سے منہ پونچھ کر کھڑکی کے ساتھ والے بستر پہ آ بیٹھی تھی۔

گرم رضائی اسی کی منتظر تھی۔ کتنے ساون آئے گزر گئے کڑک سردیاں آئیں۔ گرمیاں چلچلاتی آئیں دس ہزار سات سو بارہ روپے چاولوں کی پرانی بوری کے پیچھے پڑے دوپٹے میں رقم جمع ہو گئی تھی اس نے اختر عباس کے دیے دس بیس بھی خرچ نہ کیے تھے۔"

وہ بھی پیسے بچا سکتی تھی بلکہ بچا چکی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں اس ہلکے اندھیرے میں بھی کانپ اٹھے تھے اس نے جو سوچا تھا کر دکھایا تھا ساتھ لیٹی چھوٹی بیٹی سو چکی تھی، بندے ہی کتنے تھے منال اختر اور خود وہ۔

صبح اختر کو ناشتہ پانی دے کر آخر میں اس کے لیے اور اپنے لیے چائے بنائی اور گرم کپ لبوں سے لگا کر چپکے چپکے اسے دیکھنے لگی تھی۔

جواباً اس نے اسی روپے جیب سے نکال کر چھوٹی ٹرے میں رکھ کر کپ واپس لوٹا دیا تھا اب سکینہ کرائے کے خرچ سے بھی بچ گئی تھی۔

جب دودھ والے نے گیٹ بجا کر ڈول لانے کا کہا تب تک وہ بھی چادر سر پر اوڑھ کر گھر سے جانے کے لیے تیار تھی۔ اختر کار شوروم میں ملازم تھا وہ شام سے پہلے کبھی گھر نہیں آیا کرتا تھا اور اب سکینہ کھل کر شاپنگ وغیرہ کر سکتی تھی۔

بھرے بازار سے ریڑھی پر بکنے والے سوٹ ایک اختر کا اور ایک اپنا لے لیا تھا۔ دو منال کی فراک اور آخر میں گرما گرم جلیبی لینا بھی وہ نہیں بھولی تھی اختر کو پسند جو تھی۔ زندگی بہت خوب صورت ہے مگر ناشکرے حاسد لوگ اسے اپنے لیے جہنم بنا لیتے ہیں۔ کپڑے خریدنا، جوتے لینا کوئی مشکل کام نہیں ہے اگر طریقے سلیقے سے کام کیا جائے، بچایا اور کھایا جائے۔ سکینہ کے پاس اتنے سارے کھڑکھڑاتے شاپر جمع ہو گئے تھے۔ من پسند جوتے اور نئے سوٹ! سکینہ جیسی ساری عورتیں سب کچھ کر سکتی ہیں اگر وہ کرنا چاہیں پکی مصروف سڑک پر سکینہ بے انتہا خوش چلی جا رہی تھی آج وہ حیران ہو جائے گا۔

"دیکھا تم نے جب روپیہ اجاڑو تو ایسا ہی ہوتا ہے جیسے پہلے ہوتا رہا ہے اس گھر میں۔ اب روپے کی قدر جاننا شروع کی ہے تم نے۔" گائے میں حصہ ڈال کر نئے کپڑے پہن کر اس کی یہ تعریف کر رہا تھا۔ تو بچا کر بھی دکھا دیا۔" اختر نے ہمیشہ کی طرح اس کے جذبے کی قدر نہیں کی اس کی آنکھیں کہتی تھیں روپیہ تو میرا تھا تم نے جوڑ کر کون سا تیر مار لیا۔

وہ اس کے سامنے اس کے ہزار بار منع کرنے کے باوجود اس کے دوپٹے سے اپنے جوتے صاف کر رہا تھا۔

"کاش میں اپنے لیے نئی چادر ہی خرید لیتی۔ کتنی پرانی ہو گئی ہے یہ۔" ایک بار پھر اپنا احساس کرنا بھول جو گئی تھی تو دوسرا کوئی کیسے کر سکتا ہے بھلا!

حمیرا شفیع

صبحِ عید

"آخر کرتی کیا رہی ہو سارا دن......؟"

ہادیہ کے میاں صاحب دفتر سے تشریف لائے اور گرد و پیش کا طائرانہ جائزہ لیتے ہوئے وہی متنازعہ سوال پوچھا جو شوہروں کی اکثریت کا پسندیدہ ہوتا ہے اور گھر کے بکھیڑوں میں گھن چکر بنی بیویوں کو تازیانے کی مانند لگتا ہے۔

کوئی اور موقع ہوتا تو ہادیہ بھی تڑپ اٹھتی اور وہ سب کام گنوانے شروع کر دیتی جو اس نے صبح سے کیے تھے مگر آج گنوانے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں کیونکہ حقیقت میں اس نے کچھ کیا ہی نہیں تھا سوائے مختلف رشتے داروں کے اسٹیٹس پر لگی ان کے قربانی کے جانوروں کی تصویریں دیکھنے کے۔ اس لیے خاموش ہی رہی اور میاں صاحب کو خشمگیں نظروں سے گھورتی رہی۔

میاں جی جو آگے سے بیوی کے بھڑک اٹھنے کے منتظر تھے۔ اس قدر خاموشی پر حیرت زدہ رہ گئے۔

"کیوں بھئی؟ خیریت ہے...... بیگم......؟؟"

آج کیا چپ کا روزہ رکھ لیا ہے۔ روزے تو ویسے کب کے گزر گئے ہیں اب تو بڑی عید آ رہی ہے۔"

"جی ہاں! مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ بڑی عید آ رہی ہے بس آپ ہی بھولے ہوئے ہیں۔" اب مزید چپ رہنا ممکن نہیں تھا۔

"سب ہی رشتے داروں نے قربانی کے لیے کوئی نہ کوئی جانور خرید لیا ہے۔ بس ہمارے ہاں ہی اب تک کوئی آثار نظر نہیں آ رہے۔" وہ بدستور روٹھے لہجے میں بولی۔

"اچھا تو یہ بات ہے۔ عجیب ناشکری عورت ہو۔ پچھلے سال اگر مہینہ ڈیڑھ مہینہ پہلے جانور گھر آ گیا تو سب سے زیادہ اعتراض بھی تمہیں تھا کہ گندگی صاف کرنی پڑتی ہے۔ شور مچاتا ہے۔ رات کو نیند نہیں آئی وغیرہ......" وہ اپنے جوتے اتارتے ہوئے بولے۔

"مگر اب تو بہت ہی کم دن رہ گئے ہیں...... اب تک تو کچھ نہ کچھ آ ہی جانا چاہیے تھا۔" وہ فکرمندی سے گویا ہوئی۔

"فکر نہ کرو بیگم! اس بار بڑا جانور خریدنے کا ارادہ ہے۔ ڈیٹو چاچا سے کہہ رکھا ہے جونہی کوئی مناسب داموں ملا وہ خرید لیں گے۔"

"ہیں بڑا جانور......؟ کیا واقعی......؟"

"جی ہاں! واقعی......!!"

وہ اپنے کپڑے اٹھا کر واش روم میں گھس گئے جبکہ وہ سرشاری باورچی خانے میں ان کے لیے کھانا لینے چل دی۔

☆☆☆

وہ دوپہر کے کھانے کے لیے سبزی بنا رہی تھی جب پاس رکھا موبائل تھرتھرا اٹھا۔ بڑی بھابھی کا فون تھا۔

اس نے بٹن دبا کر کان سے لگایا تو ان کی کھنکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"ہیلو! چندا کیا ہو رہا ہے......؟"

"کچھ نہیں بھابھی! بس دوپہر کی ہانڈی روٹی کی تیاری کر رہی تھی۔"

اس نے بھی خوش دلی سے جواب دیا۔

تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے پوچھنے لگیں۔

"سنو چندا! تمہیں ہماری سندری کیسی لگی......؟"

''ہیں......وہ کون محترمہ ہیں بھابھی......؟''
''بھئی سندری...... ہماری گائے اور کون......؟''
''پرسوں بچوں نے اسٹیٹس لگایا تو تھا۔ کیا تم نے نہیں دیکھا......؟''
''ہاں بھابھی...... دیکھا تھا میں نے...... بہت خوب صورت ہے ماشا اللہ سے......آپ کو مبارک ہو......''
''دراصل سب ہی کے کمنٹس مل گئے تھے۔ صرف تمہاری جانب ہی خاموشی تھی۔ میں نے سوچا خیریت معلوم کرلوں......''
''وہ بھابھی......دراصل...... میں کچھ مصروف تھی۔ اس لیے فون کرنے کا وقت نہیں نکال پائی۔ معذرت خواہ ہوں۔ اور ہاں ہم بھی اس بار بڑا جانور



ہی خرید رہے ہیں۔ ان شاء اللہ ایک دو روز تک آجائے گا۔''

''ہیں..... کیا واقعی.....؟ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' اس کے ساتھ ہی انہوں نے کھٹ سے فون بند کر دیا۔

اب وہ خوش ہوئی تھیں یا پھر جل گئی تھیں۔ وہ ان کے لہجے سے کچھ بھی اندازہ نہ کر پائی اور سر جھٹک کر دوبارہ کام میں مصروف ہوگئی۔

یوں فون پر وہ آدھے سے زیادہ رشتے داروں کو تو بتا بلکہ ایک طرح سے جلا چکی تھی کہ اس بار ان کے ہاں بھی بڑا جانور آرہا تھا مگر دن گزرتے جارہے تھے اور جانور کے کوئی آثار ہی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ گھبرا کر میاں سے استفسار کرتی تو وہ لاپروائی سے کہہ دیتے۔

''بھئی کہہ تو رکھا ہے دینو چاچا سے۔''

دینو چاچا ان کے دور کے رشتے تھے۔ مویشی منڈی میں کام کرتے تھے اور ہر سال قربانی کا جانور وہ انہی کے توسط سے خریدتے تھے۔

جب چند دن مزید سرکے تو اس نے میاں صاحب کی ڈائری سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر دینو چاچا کا نمبر نکالا اور انہیں خود فون کھڑکا دیا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد جب قربانی کے جانور کی بابت دریافت کیا تو وہ ہوں ہاں کر کے ٹال گئے۔ لہجہ بھی کچھ بجھا ہوا تھا۔ وہ حیرت زدہ رہ گئی کہ آخر وہ آنا کانی کیوں کر رہے تھے جبکہ میاں صاحب نے ان کو ایڈوانس رقم بھی کب کی دے رکھی تھی۔

☆☆☆

سارا دن وہ اسی ادھیڑ بن میں رہی۔ شام کو مقررہ وقت سے پہلے ہی میاں چلے آئے۔ سخت پریشان دکھ رہے تھے۔ وہ اپنا غم بھول بھال کر ان کی خیریت معلوم کرنے لگی تو رنجیدگی سے بولے۔

''آج دفتر میں دینو چاچا آئے تھے۔ بہت پریشان حال تھے۔ ان کے ساتھ بہت برا ہوا۔ وہ ان کا سوتیلا بیٹا نہیں تھا۔ کیا نام تھا اس ناخلف کا.....''

''کاشان.....'' اس نے یاد دلایا۔

''ہاں وہی نانہجار..... گھر سے اکثر غائب رہتا تھا۔ اب بھی دو مہینوں بعد نجانے کہاں سے آوارہ گردی کر کے لوٹا تھا سیدھے سادے دینو چاچا کو اس کے ارادوں کی کیا خبر رات ٹھہرا اور جاتے جاتے الماری توڑ کر نقدی لے اڑا۔

مجھ سمیت ایک دو اور لوگوں نے بھی انہیں قربانی کے جانور کے لیے پیسے دے رکھے تھے۔ سب گئے۔ باقیوں کا تو انہوں نے جیسے تیسے نقصان پورا کر ہی دیا ہے مگر میں نے چونکہ بڑا جانور خریدنے کے حساب سے زیادہ رقم دے رکھی تھی تو فی الحال اس کا بندوبست نہیں ہو رہا ہے۔

عید کے فوراً بعد ان کی بیٹی کی بھی شادی طے تھی اسے بھی ملتوی کرنے کا سوچ رہے ہیں وہ مگر میں نے اپنے پیسوں کے لیے تو منع کر دیا ہے.....''

''ہیں کیوں منع کر دیا ہے آپ نے.....؟'' وہ تڑپ اٹھی۔

''بھئی وہ اپنی بچی کی شادی کے اخراجات کی مد میں رکھے پیسے دے رہے تھے۔ وہ بھی شادی فی الحال کینسل کر کے، مجھے اچھا نہیں لگا تو میں نے منع کر دیا۔''

''مگر آخر ہم کہاں جائیں گے؟ قربانی کیسے کریں گے؟ لوگ کیا کہیں گے.....؟''

''کیوں کیا ہم لوگوں کے لیے قربانی کرتے ہیں؟'' ان کا لہجہ اک دم تیز ہوا۔

''مگر پھر بھی ہم اس معاشرے میں رہتے ہیں۔ بہت کچھ فیس کرنا پڑتا ہے۔ لوگ کیا کہیں گے کہ سارا سال برانڈڈ کپڑے پہننے والے اور عمدہ کھانے پینے والے اب قربانی کے نام پر بغلیں بجا رہے ہیں۔''

''ہاں تو پھر کس نے کہا تھا گھڑی گھڑی ہر پہنے اوڑھنے اور کھانے پینے کی چیزوں کا اسٹیٹس لگانے کا

اگر سارا سال یہ نمود و نمائش نہ کی ہوتی تو آج کسی بھی وضاحت کی ضرورت نہ رہتی۔ صاف کہہ دیتے کہ استطاعت نہیں تھی تو قربانی نہیں کی۔"

وہ ہاتھ جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے جبکہ وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ بچت کے نام پر ایک دھیلا نہ تھا۔ سب ہی پیسے بچوں اور اپنے عید کے برانڈڈ کپڑوں جوتوں پر اڑا دیے تھے۔ اس بار تو مزید پیسے ڈال کر جھمکے بھی نئے بنوائے تھے۔

شام کو وہی میاں کے سامنے پھینک کر کہا۔

"ان کو بیچ کر چھوٹا موٹا جانور خرید لیں۔"

"جانوروں کی قیمتیں آسمانوں سے باتیں کر رہی ہیں۔ جیولر کاٹ پیٹ کر جتنے پیسے دے گا تو ان سے بکری کا چھوٹا سا بچہ بھی نہیں آئے گا۔"

انہوں نے جھمکے دوبارہ اسے تھما دیے۔

☆☆☆

ایسے ہی بے کیف اور بوجھل بوجھل سے دن گزر رہے تھے جب عید سے عین چار دن پہلے امریکا سے ماموں میاں اچانک تشریف لے آئے۔

"بھئی بچوں! آپا اتنے دن سے خواب میں آ رہی تھیں۔ دل بڑا اداس تھا۔ میں نے اپنے لڑکوں سے کہہ دیا کہ میری کسی بھی فلائٹ سے سیٹ بک کروا دو۔ میں تو اس بار عید اپنے وطن میں کروں گا اور اپنے پیاروں کی قبر پر فاتحہ خوانی بھی کروں گا۔"

(ساس صاحبہ چونکہ اس کے ساتھ رہائش پذیر تھیں اور ان کا جنازہ بھی ان کے ہاں سے ہی اٹھا تھا اس لیے وہ سیدھے ان ہی کے ہاں تشریف لائے تھے)

اگلے دن وہ میاں کے ساتھ مویشی منڈی جا کر ایک خوب صورت کٹا اور دو بکرے بھی خرید لائے۔ بچوں کی خوشی دیدنی تھی۔ چھوٹا سا صحن قربانی کے جانوروں سے بھر گیا تھا۔

☆☆☆

آج عیدالاضحیٰ کی حسین صبح تھی۔ وہ سب نہا دھو کر نئے کپڑے زیب تن کیے صحن میں بیٹھے قصاب کا انتظار کر رہے تھے۔ اس کے دونوں چھوٹے ماموں میاں کے دائیں بائیں ان سے لپٹے ہوئے تھے۔

"نانا ابو! اپنا موبائل تو دیں۔"

اچانک دائیں طرف بیٹھے چھوٹے نے فرمائش داغی۔

"یہ لو بھئی۔"

انہوں نے اپنی جیب سے سادہ سا موبائل نکال کر بچے کی جانب بڑھایا۔ اس نے موبائل الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر مایوسی سے بولا۔

"یہ والا نہیں دوسرا والا دیں۔"

"نانا ابو! یہ واٹس ایپ والا مانگ رہا ہے۔ اس نے جانوروں کی تصویریں اسٹیٹس پر لگانی ہیں۔"

دوسرا والا بولا۔

"اف......" اس نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ اتنا اہم کام تو وہ بھول ہی گئی تھی۔ ابھی جانور ذبح ہو جانے تھے۔ شکر تھا کہ بچے کو بروقت یاد آ گیا۔

"بیٹا! میرے پاس تو یہی سادہ سا ہی ہے۔ اسی سے ہی اچھا خاصا گزارا ہو جاتا ہے۔"

"پھر بچو! تصویر لگانی کوئی ضروری تو نہیں قربانی تو ہم اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر کر رہے ہیں تو پھر خوامخواہ تشہیر کیوں کریں۔"

"دیکھو بچو! نعمت کا شکر ادا کرتے ہیں۔ اس کی نمائش نہیں کرتے۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی استطاعت نہ رکھنے والا حسرت میں مبتلا ہو جائے۔"

"وہ سادگی سے بچوں کو سمجھا رہے تھے۔ اور وہ حیران ہو رہی تھی کہ دنیا کے ترقی یافتہ ملک کے رہائشی، خاندان کے امیر ترین فرد کتنے سادہ دل تھے۔ تصنع اور بناوٹ سے کوسوں دور اور عید کی اس مبارک صبح وہ ان سب کو بھی سادگی، عاجزی اور منکسر المزاجی کا بہترین سبق پڑھا رہے تھے۔ کچھ بھی جتائے بغیر۔

اور وہ عقیدت سے ان کے پرنور چہرے کی جانب دیکھتی رہی اس عزم کے ساتھ کہ وہ بھی اپنے اہل خانہ کے ہمراہ اس سبق کو یاد رکھے گی۔

☆

آسیہ رئیس خان

اظہار

"نئی دلہن کا دل سسرال میں قدم رکھتے ہوئے ایسے ہی دھڑکتا ہوگا۔" گلی میں داخل ہوتے ہی مجھے خیال آیا اور اگلے ہی لمحے اس بے تکے تقابل پر میں نے لاحول پڑھی۔

"محبوب کی گلیاں شاید یونہی بے ربط اور عجیب و غریب احساسات اور خیالات جنم دینے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔" یہ خیال اول الذکر سے بھی بے تکا تھا اور اس امر کا ثبوت کہ اس وقت میں پہلے اور انوکھے تجربے سے گزر رہا تھا۔ کچھ بھی سوچے جا رہا تھا۔

یہ وہ شہر تھا جہاں میں نے اپنی ستائیس سالہ زندگی کے محض پانچ سال گزارے تھے۔ ابا کی سرکاری نوکری میں ہوئے تبادلوں نے یوں تو ہمیں بنجاروں کی طرح شہر شہر بھٹکایا تھا لیکن میرے لیے اس شہر جتنا اہم اور عزیز کوئی دوسرا نہیں بن سکا تھا۔ اس کا نام، اس کا ذکر سنتے ہی میرے اندر سب کچھ 'اٹینشن' والی حالت میں تبدیل ہو جاتا تھا کہ اس نام سے وہ چہرہ جڑا تھا جو میرے خواب اور خواہشوں کا مرکز اور محور تھا۔

اتنے برسوں میں کئی تبدیلیاں آئی تھیں۔ جن میں سب سے واضح ہمارے کھیلنے کودنے کے میدان میں اب بڑا سا کمرشیل کامپلیکس کھڑا تھا۔ راستے کے دونوں سمت کھڑی گاڑیوں نے چوڑی سڑک کو تنگ کر دیا تھا۔ جو قدرے کھلی سی گلی ہماری کرکٹ کی پچ ہوا کرتی تھی اب دونوں سمت ایستادہ دو اور تین منزلہ عمارتوں سے بند تھی۔ ترقی اور خوش حالی کی ان نشانیوں نے گزرے دنوں کے مناظر اور یادوں کو مزید قیمتی بنا دیا تھا۔

امی اور صبا مجھ سے آگے چل رہی تھیں۔ وہ دونوں دائیں طرف کے اس مکان کو دیکھ رہی تھیں جو یہاں قیام کے دوران ہمارا گھر ہوا کرتا تھا اور میں بائیں طرف کے مکان کو جو میرے ذہن و دل میں آباد تھا، میری بچپن کی، پہلی اور اکلوتی محبت کا مسکن جواب بھی اس کا گھر تھا اور جہاں میرا بڑا قیمتی اثاثہ چھوٹ گیا تھا۔ ہم تینوں اس دروازے کے قریب پہنچے ہی تھے کہ دروازہ کھول کر کامران باہر نکلا اور ہمیں دیکھتے ہی پیچھے مڑ کر آواز لگائی۔

"افضل چاچا کی فیملی آگئی۔"

اس پکار کے سنتے ہی شادی والے گھر میں سب سے آخر میں وارد ہوئے، مہمانوں کی آمد پر گویا چھوٹا سا زلزلہ آگیا۔

امی کو سلام کرنے کے بعد وہ مجھ سے بغل گیر ہوا۔

"تیری شادی میں بھی عین وقت پر ہی آؤں گا۔" اس نے بدلے کا اعلان کیا۔

"تمہارے کہیں آنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔" میں نے مسکراتے ہوئے دل میں سوچا۔

اگر اسے میری شرکت کی اصل وجہ کی خبر ہو جاتی تو شاید وہ 'آج سے دوستی ختم' اعلان کے ساتھ مجھے لات مار کے گھر سے ہی نکال دیتا۔

سب عین وقت پر آنے کی شکایت کر رہے تھے اور ہر شکایت پر امی اور صبا میری جانب انگلی اٹھا دیتیں کہ اس کی وجہ سے لیٹ ہوئے ہیں۔ ہم دونوں تو ہفتہ بھر سے بیگ بھر کے بیٹھی تھیں۔

اب یہ تو میں ہی جانتا تھا کہ اپنی نوکری داؤ پر لگا کر یہ تین دن کی چھٹی مجھے کس مشکل سے ملی تھی۔ ابا کسی وجہ سے شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لیے یہ ذمہ داری مجھے سونپ دی تھی اور میں مشکل سے ہاتھ آیا یہ موقع کسی قیمت پر گنوانا نہیں چاہتا تھا۔

"ماشا اللہ......" دادی نے میرے جھکے سر پر ہاتھ رکھا۔

"اس کے سر پر سہرا کب سجا رہی ہو سعدیہ؟" انھوں نے امی سے پوچھا۔

"بہت جلد ان شاء اللہ۔" امی کے جواب پر میں نے اپنی طرف سے اضافے کے بعد دل میں آمین کہا۔

وہاں موجود مہمانوں سے ہمارا تعارف کروایا جا رہا تھا مگر میری نظر جس کی متلاشی تھی، وہ ابھی تک نظر نہیں آئی تھی۔

"چاچی اقصیٰ! کہاں ہے؟" میرے دل کے سوال کو صبا نے آواز دی۔

"میری بچی کے پیچھے دنیا کے کام ہیں......"

دادی کے اس لاڈ بھرے لہجے پر مجھے جھٹکا لگا۔ وہ اکلوتی بہن ہونے کی ذمہ داریاں نبھاتی اقصیٰ کی تعریفیں کر رہی تھیں اور میں اس کایا پلٹ پر حیران تھا۔

دادی اور اقصیٰ کے تعلقات ہمیشہ نارتھ کوریا اور امریکہ والے تھے۔ ایک طرف سے ہمیشہ دھمکیاں اور پابندیاں اور دوسری جانب ہٹ دھرمی اور ضد۔ اقصیٰ اور دادی کی جنگل بندیاں مجھے آج بھی یاد تھیں۔ وہ ٹام بوائے قسم کی لڑکی تھی اور دادی کو اس کی ہر بات پر اعتراض ہوتا تھا۔

"اررررر...... آہستہ چلا کرو۔" اس کی دوڑ دیکھ کر دادی کو اختلاج ہونے لگتا۔

"آہستہ چلو تو وقت برباد ہوتا ہے۔" وہ جواب دیتی۔

"ارے لڑکی! دوپٹا کمر کے گرد لپیٹنے کے لیے نہیں ہوتا ہے۔" دادی کا ایک اور اعتراض جو مجھے



یاد تھا۔

''ہاں تو میں پسینہ پونچھنے کے لیے ساتھ رکھتی ہوں۔'' اور دادی اسے مارنے کے لیے کچھ ڈھونڈنے لگتیں۔

وہ تین بھائیوں کی سب سے چھوٹی بہن تھی۔ بھائیوں کے ساتھ رہ کر اس کا مزاج اور انداز بھائیوں جیسا ہی ہو گیا تھا۔ کامران بھائیوں میں سب سے چھوٹا اور میرا ہم جماعت تھا اور ہمارے خاندان اچھے تعلقات والے پڑوسی تھے یعنی ہمارے ابا دوست، امیاں اور بہنیں سہیلیاں تھیں۔ یہاں رہتے ہوئے میں اس 'ٹام بوائے' سے ہمیشہ خائف ہی رہتا تھا۔ یہ ہی وجہ تھی شاید کہ میرے جذبات اور دل نے بھی ساری بہادری اس سے دور جانے کے بعد دکھائی۔ پندرہ برس کی عمر میں یہاں سے جانے کے بعد مجھے کامران سے زیادہ اس کی بہن کی یاد آنے لگی۔ کئی چویشنز میں، میں یہ سوچ کر مسکرا دیتا کہ اس بات پر اقصیٰ کا ردعمل یوں ہوتا۔ میں حیران ہوتا کہ کیسے مجھے اس کی ہر بات، ہر انداز یاد ہے۔ رفتہ رفتہ یہ یادیں خوابوں اور خواہشوں میں ڈھلتی گئیں۔

میری اور کامران کی طرح صبا اور اقصیٰ نے بھی رابطہ قائم رکھا تھا۔ اب تو انجان بن کر صبا سے اس کی باتیں سنتا اور ان کی ویڈیو کال کے دوران انجان بننے کی اداکاری کرتے ہوئے اس کی جھلک پانے کی ناکام کوششیں جیسی 'لوفرانہ اور عاشقانہ' حرکتیں کرنے کے بعد خود کو کوستے اور ڈانٹتے رہنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ شکر تھا کہ صبا کی وجہ سے مجھے اس کی تصویریں نظر آتی رہتی تھیں۔ ساتھ ہی کالج پڑھائی وغیرہ کا علم بھی تھا۔ وہ اور امی اس کے بارے میں باتیں کرتیں اور اس گفتگو میں ان دونوں سے زیادہ توجہ اور دھیان میرا لگا رہتا۔

امی اور صبا، کامران کے بھائیوں کی شادی میں شریک ہوئی تھیں۔ ستم یہ کہ میں منتظر رہا لیکن مجھے کسی نے چلنے کو کہا ہی نہیں۔ ہمارے یہاں یہ رائے عام ہے کہ انجینئرنگ کرنے والے پڑھاکو بچے 'ان سب' سے دور رہتے ہیں۔ میں خود سے کیا کہتا، کچھ ابا محترم سے بھی ڈر لگتا تھا کہ خدانخواستہ رزلٹ خراب آیا تو ساری عمر طعنہ دیں گے '' اور اٹینڈ کرو شادیاں۔''

آج کل میری شادی کو لے کر امی کا اصرار اپنے نقطہ عروج پر تھا۔ اپنے جذبات کی شدت کے احساس کے ساتھ ہی میں آج بھی اس کے مزاج سے خائف تھا۔ اکثر اس کے ہاتھوں کامران اور اپنے دوستوں کی درگت بنتے دیکھی تھی۔

ایک دفعہ گلی کے کسی لڑکے نے اسے ایک 'رقعہ' تھما دیا اور کچھ دیر بعد وہ اس کے دروازے پر پہنچ گئی۔ دروازہ مجنوں صاحب کے والد محترم نے کھولا۔

''یہ کیا لکھا ہے میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' اقصیٰ نے سرخ ہارٹ شیپ سے بھرا گلابی کاغذ کھول کر والد محترم کو تھمایا۔

''اتنی گندی ہینڈ رائٹنگ...... سلیم سے کہیں، وہ ہی پڑھ کے سنا دے۔'' والد محترم قابل شخصیت تھے جنھیں گندی ہینڈ رائٹنگ پڑھنے پر ملکہ حاصل تھا۔ بس پھر انارکلی اور شہزادہ سلیم پر جو ستم ہونے سے رہ گئے تھے، وہ اس سلیم پر ڈھا دیے گیے۔

میں جب بھی سوچتا امی سے اقصیٰ کے متعلق کہوں، دوٹوک بات کرنے والی لڑکی کے ہاتھوں اپنی متوقع درگت کا منظر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا۔ مجھے یہ خبط لاحق تھا کہ پہلے اس کی مرضی معلوم کروں پھر امی سے اس خواہش کا اظہار کروں گا کہ اس طرح درگت یعنی انکار کا موقع آیا بھی تو کم از کم سلیم جیسی شہرت سے تو بچ جانے کا امکان باقی رہتا تھا۔

''صبا! بھائی کو واش روم بتا دو۔'' میری بے چینی سے امی نے جو نتیجہ اخذ کیا اس پر میں پانی پانی ہو گیا۔

''امی! متوقع سسرال ہے میرا۔'' میں نے دل

میں احتجاج بلند کیا اور کھسیانا سا وہاں سے چلا گیا۔
کچھ دیر بعد میں ہال میں آیا تو وہ صبا کے ساتھ نظر آئی۔ میں ادھر جاتا اس سے پہلے اسی محلے کا دوست ابرار مجھ تک پہنچ گیا۔

"کیسے ہو یار؟ شکر ہے کامران کی شادی تمہیں یہاں کھینچ لائی ورنہ تو تمہاری شکل بھولنے لگا تھا میں۔" اس کی بات شروع ہوئی تو ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

"بھائی! آپ اقصیٰ سے ملیں؟" ذرا دیر بعد صبا اس کا ہاتھ تھامے میرے پاس آئی۔ شاید میری بے قراری اور بے تابی اس تک پہنچ گئی تھی۔

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس نے سلام کر دیا۔

"وعلیکم السلام، کیسی ہو؟" میں نے بردباری سے پوچھا جبکہ دل دعا کر رہا تھا۔

کاش! اس وقت سب کہیں غائب ہو جائیں اور میں اسے حالِ دل سناؤں۔""

"ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں؟" اس نے بھی رسم نبھائی۔ میں نے مسکرا کر سر خم کرتے ہوئے اپنی خیریت جتائی۔

ابھی میں بات بڑھاتا، اس سے پہلے کسی نے پکارا اور وہ معذرت کرتی صبا کو لیے چلی گئی۔

"جلد ہی پھر یہاں کا چکر لگانا ہے تمہیں۔" ابرار کی نظر دور جاتی اقصیٰ کی پشت پر تھی۔

"کامران کے ولیمے کے بعد امی بات کرنے والی ہیں۔"

"آں......؟" ابرار کی بات میرے سر سے گزر گئی۔"

"اقصیٰ کے لیے میرا پرپوزل۔" وہ صحن میں دادی سے بات کرتی اقصیٰ کو دیکھ کر کہہ رہا تھا اور میں اس تازہ رقیب کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک اسے دھکا دے کر دور کرنے کی خواہش پر میں نے خود کو مشکل سے عمل درآمد کرنے سے روکا۔

ابرار ہمارے گروپ کا حصہ نہیں تھا۔ وہ بچپن میں امی کے پلو سے بندھا رہنے والا صحت مند بچہ تھا۔ ہر جگہ ان کے ساتھ لگا رہتا۔ ہم سب اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ اس کی امی جب بھی ہمیں کھیلتے دیکھتیں تو اسے ساتھ کھلانے کو کہتیں اور وہ ان کے پیچھے چھپتا جاتا۔ وہ کھیل کود سے کوسوں اتنا ہی دور اور کھانے سے اتنا ہی قریب تھا۔

اس دن کرکٹ میچ کے دوران بریک میں کامران اور میں اس کے گھر آئے تھے۔ وہ واش روم میں چلا گیا اور میں فریج سے پانی کی بوتل لینے باورچی خانے میں آیا اور وہاں اقصیٰ کو دیکھ کر دروازے میں ہی رک گیا۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے بوتل سے گلاس میں کوئی مشروب انڈیل رہی تھی۔

"مہمان والے مینرز تو ہیں ہی نہیں۔ چپس بسکٹ کیک اور ٹینگ پینے کے بعد اسے اب مازا چاہیے، پیٹ ہے یا کنواں......" گلاس بھرنے کے بعد اس نے سامنے شیلف سے ایک ڈبہ اٹھایا اور اس میں موجود سفید چیز دو تین چمچ بھر کر گلاس میں ڈال دی۔

"اور یہ ہماری دادی اماں، مجھے تو ایک گلاس بھی سکون سے پینے نہیں دیتیں اور اس موٹو کو ایک اور گلاس بنا دو اقصیٰ......" اس نے آخر میں دادی کی نقل اتاری۔

گلاس میں خوب چمچہ ہلا کر پلٹی، مجھے دیکھ کر چونکی، پھر بے نیازی میرے پاس سے نکل گئی۔ میں فریج سے بوتل لے کر باہر آیا ہی تھا کہ ہال سے آتی آوازوں پر ادھر بھاگا۔ وہاں ابرار گلاس ہاتھ میں پکڑے الٹی کیے جا رہا تھا۔ اس کی امی شرمندہ سی اسے سنبھالتے ہوئے ڈانٹ رہی تھیں۔

"اتنا زیادہ کھاؤ گے تو یونہی ہوگا، جگہ بھی تو ہونا چاہیے پیٹ میں......" پیٹھ سہلاتے ہوئے ان کے ہاتھ بڑی زور سے پڑ رہے تھے۔

وہ اپنی بدتر ہوتی حالت کے بیچ کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ سننے کے موڈ میں نہیں تھیں۔
میں نے سینے پر ہاتھ باندھ کر کھڑی اقصیٰ کو دیکھا،

اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے دھمکی دی۔
"خبردار!"
"ارے کوئی بات نہیں۔ ہو جاتا ہے۔" اقصیٰ کی امی یقیناً فرش دیکھے بنا ہی اندر کسمسا رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ اسے کوئی کام کہا جاتا، اقصیٰ وہاں سے بھاگتے ہوئے گھر سے باہر چلی گئی تھی۔
وہ سفید چیز یقیناً نمک تھی۔ وہ ابرار سے چڑتی بہت تھی۔ ہر وقت کھاتے رہنے کی عادت پر اسے پیٹو کہتی تھی۔
اس کے بعد ان کے گھر کھاتے ہوئے میں ہمیشہ ڈرتا اور جھجکتا تھا خاص طور پر جب وہ کچھ پیش کرتی۔ میرا یہ ڈر اس نے بھی محسوس کر ہی لیا تب ہی ایک دن کہا۔
"بے فکر رہو، تم مجھے برے نہیں لگتے۔"
ہائے! اس کے یہ ہی الفاظ میں نے تصور میں کہاں کہاں فٹ کر کے کیسے کیسے خواب دیکھے تھے اور اب مجھے ڈر تھا اسے یہ سب سنانے کی آرزو کہیں حسرت ہی نہ رہ جائے۔
"میں نے دیر کر دی۔"
میرا دل ڈوبنے لگا۔ کتنی ہی فلمیں اور سیریل یاد آ گئے جن میں بچپن کی ان بن اور کھٹ پٹ جوان ہوتے ہی محبت میں ڈھل گئی تھی۔ ابرار اسی محلے میں، اس کے قریب تھا، وہ اب موٹو اور پیٹو نہیں اچھا خاصا ہینڈسم بندہ تھا۔ ایسا ہونا ناممکن نہ تھا۔
مہمانوں اور دوستوں کے بیچ میں خود کو کوس کوس کر بھی تھک گیا تھا۔ اپنی بزدلی پر غصہ آ رہا تھا کہ میری بزدلی نے یہ دن دکھایا تھا۔ یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی اگر میں پہلے ہی اپنی پسند امی یا صبا کو بتا دیتا۔
نکاح اگلے دن صبح دس بجے تھا۔ بارات اسی شہر میں جانا تھی۔ میرا دل کر رہا تھا ابھی واپس چلا جاؤں مگر میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔
"بھائی!" صبا کی آواز پر میں چونکا۔
"آپ جتنا اقصیٰ کو گھور رہے ہیں ناں مجھے ہی نہیں آدھے مہمانوں کو علم ہو گیا ہوگا۔" بے خیالی میں شاید میری نگاہیں اسی کا طواف کر رہی تھیں۔
"تمہیں اس نے کچھ کہا......؟" میرے بے قرار سے سوال پر صبا نے ایسے گھورا کہ میں شرمندہ ہو گیا۔
"سوری۔" مجھے تو اپنے دل سے بھی اب تا عمر سوری ہی کرنا تھی۔
"آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا مجھے؟" اس کے سوال پر ڈولتا دل بیٹھ ہی گیا یعنی اب دیر ہو گئی ہے۔ میں کچھ کہہ نہیں پایا۔
"میں امی سے بات کرتی ہوں، آپ خود کو کنٹرول کریں۔" مجھے صبا پر بڑا پیار آیا۔ وہ بہن اور سہیلی دونوں کا کردار بخوبی نبھا رہی تھی۔
"امی سے پہلے......" سامنے سے اقصیٰ چائے کی ٹرے لیے اندر آئی اور میرا فقرہ ادھورا رہ گیا۔ صبا نے میری نظر کے تعاقب میں مڑ کر دیکھا۔
"بھائی! شرمندہ نہ کریں مجھے۔" وہ مجھے کہہ کر اقصیٰ کے قریب چلی گئی۔
خود کو سرزنش کرتے ہوئے میں نے سر جھکا لیا۔ اقصیٰ سب کو چائے دینے کے بعد آخر میں میرے پاس آئی، ٹرے میں رکھا کپ اٹھا کر میرے سامنے رکھا اور میرے شکریہ کہنے سے پہلے ہی چلی گئی۔ ظاہر ہے وہ کیوں یوں گھورے جانا برداشت کرتی۔
بے دلی سے چائے کا کپ اٹھا کر میں نے پہلا گھونٹ بھرا اور نظر پھر سامنے اٹھ گئی۔ وہ جو صبا کے پیچھے سے جھانکتی مجھے ہی دیکھ رہی تھی، فوراً چھپ گئی۔ میں نے کپ واپس رکھ دیا۔ ٹام بوائے قسم کی لڑکی نے میری مشکل آسان کر دی تھی۔ وہ اظہار میں سبقت لے گئی تھی۔
میں مسکرا کر کھڑا ہوا۔ چائے کی نہیں مجھے ابھی اسی وقت امی سے بات کرنے کی ضرورت تھی۔ ویسے بھی کپ میں چائے ایک گھونٹ ہی تھی، باقی کپ چینی سے بھرا تھا۔

☆

نعیمہ ناز

روشنی سا سحر

شادی، شادی، شادی پچھلے ڈھائی سال سے شور مچا ہوا تھا جب سے عائلہ کی منگنی ہوئی تھی اور تب یہ منگنی بھی اتنی دھوم دھام اور عالیشان انداز میں ہوئی تھی کہ بیشتر افراد کا خیال تھا کہ اسی تقریب میں نکاح کر کے رخصتی بھی کر دیتے، کیونکہ بس ایک یہی کسر رہ گئی تھی۔ باقی تو سب لوازمات اور سارے اہتمام شادی جیسے ہی تھے۔ لوگوں کے تبصرے اور مشورے پہ فرید خان نے شان بے نیازی سے اپنی مونچھ مروڑتے ہوئے جواب دیا تھا۔

''پہلی بیٹی کی شادی کوئی پانچ لاکھ میں کروں گا؟ ایسی شادی ہوگی کہ برادری دیکھتی رہ جائے گی۔''

''اچھا ہوا کہ دنیا کا نام نہیں لیا ورنہ تو بہت بڑا دعوا ہو جاتا۔'' بڑی خالہ نے اپنا غصہ ضبط کرتے اور جھینپ مٹاتے ہوئے کہا کیونکہ یہ مشورہ نما تبصرہ ان ہی کا تھا۔

''یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے آپا، اچھی طرح جانتا ہوں کیا کہنا ہے، کیا کرنا ہے؟'' فرید خان نے پھر عادتاً مونچھ مروڑی تھی۔

ڈھائی سال شادی کی تیاریاں کرتے رہے، جہیز کی ہر شے ایک سے بڑھ کر ایک اعلا اور بیش قیمت، دولہا کا سامان بھی کسی چھوٹے موٹے جہیز سے کم نہیں تھا۔ پھر ایک ماہ تک ہونے والے لگاتار فنکشن، ڈھولکی، مایوں، مہندی، نکاح، بارات اور تو اور عائلہ نے ''برائیڈل شاور'' کا فنکشن بھی کروایا، نہ کرواتی تو کزنز اور سہیلیوں کے درمیان اس کی ناک اور باپ کی مونچھ نیچی نہ ہو جاتی!



مکمل ناول



دلہن کی جو تیاریاں تھیں وہ تو تھیں ہی اپنی جگہ، مگر باقی فیملی ممبران، اماں باوا، تینوں بھائی اور چھوٹی بہن سب پر جو اخراجات آئے، وہ بھی ہوش اڑا دینے والے تھے، مگر دوسروں کے فرید خان کے نہیں، کیونکہ وہ ان اخراجات کو با آسانی افورڈ کر رہے تھے۔

اچھا بھلا چلتا ہوا کاروبار تھا۔ آری اور زری کے کام کے اپنے کارخانے تھے۔ ہنر مندوں کو سستی اجرت دے کر ملبوسات تیار کرواتے اور انہیں اپنے اسٹور پہ بیچتے، شہر کی مصروف اور مہنگی مارکیٹ میں اپنی دکان تھی۔ ایک ایک جوڑا مہنگے داموں فروخت کرنا کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا اور پھر جب وہ کسی مشہور ڈیزائنر کا ریپلیکا (نقل) ہو، اس کے منہ مانگے دام مل جاتے۔

فرید خان میں کاروباری سوجھ بوجھ بہت تھی اوپر سے میٹھی زبان، گاہک ایک بار دکان پہ آ جائے پھر اس کا کچھ خریدے بغیر واپس جانا ناممکن تھا۔ پچھلے بیس برسوں سے اپنے کاروبار کو، بہت محنت اور کامیابی سے آگے بڑھا چکے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنا بینک بیلنس بھی، جس کا منہ اپنی بیٹی کی شادی کے موقع پہ کھول دیا تھا۔

☆☆☆

ثاقب نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر کوٹ کے بٹن لگائے اور اپنا جائزہ لیا۔ خوش شکل تھا۔ درمیانہ قد و قامت اور اسمارٹ چہرے پہ خود اعتمادی تھی۔ کچھ قدرت کی دین تھی، کچھ پیسے کی فراوانی، خوش حالی اور بے فکری، زندگی کی دین تھی۔ باپ کو شوق تھا کہ بیٹا اعلا تعلیم حاصل کرے، بیٹا بالکل نکما تو نہیں تھا مگر اتنا محنتی بھی نہیں تھا کہ ڈاکٹر یا انجینئر بنے یا کوئی اعلیٰ ڈگری لے۔

کامرس پڑھتے ہوئے یونی ورسٹی پہنچ ہی گیا۔ ایم کام کا فائنل تھا۔ اوسط درجے کا تھا پڑھائی میں، ویسی ہی جی پی تھی، مگر بہر حال باپ خوش تھا کیونکہ انہوں نے تو میٹرک بھی نہیں کیا تھا اور بیٹا سولہ جماعتیں پاس کرنے والا تھا۔ ان کے اپنے اور بیوی کے خاندان میں ان کا بیٹا اندھوں میں کانا راجا تھا۔

یہ راجا آج اپنی بہن کے ولیمے کے لیے، تیار ہوا تھا اور ایسا تیار ہوا تھا کہ دوست احباب چھیڑ رہے تھے کہ بہن کا ولیمہ ہے یا اپنا؟

''اپنے ولیمے پہ نقل نہیں، اصلی ڈیزائنر سوٹ پہنوں گا۔'' پیارے ثاقب نے اپنے کف لنکس درست کر کے دوست کو تفاخر سے دیکھا۔ ولیمہ ایک مہنگے ہال میں تھا۔ سجاوٹ، کھانا، انتظامات سب اپنے منہ سے بول رہے تھے کہ ان پہ کتنا خرچا کیا گیا ہے۔

ثاقب کی امی، ابو اور بہن بھائیوں کی سج دھج بھی دیکھنے کے قابل تھی۔ آج وہ لوگ دولہا دلہن کے لیے بیش قیمت تحائف لے گئے تھے۔ عائلہ ولیمے کی دلہن کے روپ میں بے حد حسین لگ رہی تھی، شاہانہ اخراجات کے معاملے میں، دولہا والے بھی ان کی ٹکر کے تھے۔

باربی کیو کی، اشتہا انگیز مہک نے دھیمے دھیمے جاگتی بھوک کو اور بھڑکا دیا تھا۔ مہمان بے صبری سے انتظار کر رہے تھے کہ کب کھانا کھلے، وہ کھائیں اور واپس جائیں۔

شادی بیاہ کے طویل پروگرام، گھر والوں کے لیے ہی خوشی اور شادمانی کا سبب ہوتے ہیں۔ دوسرے مہمانوں کے لیے اتنی زیادہ دیر، انتہائی کوفت کا باعث بن جاتی ہے۔

اسٹیج پر دولہا دلہن کا رشتہ داروں اور گھر والوں کے ساتھ فوٹو شوٹ اللہ اللہ کر کے ختم ہوا یا درمیان میں وقفہ لیا تھا۔ پورے ہال کی لائٹس بند ہو گئیں، صرف اسٹیج پر روشنی تھی۔ دولہا، دلہن کے رومانوی رقص کی عکس بندی کی جا رہی تھی۔ بے چارے مہمانوں نے ایک آہ بھری، اس کا مطلب تھا کہ کھانا مزید ایک گھنٹے بعد ملے گا۔ ثاقب کا موبائل بج رہا تھا۔ وہ باہر آ گیا۔

''کیسی ہو؟ کہاں ہو؟ کب سے ویٹ کر رہا

ہوں تمہارا، کتنی بار کال کر چکا ہوں۔"

"آ رہے ہیں نا، تھوڑا صبر اور کرو۔" صوفیہ ہنسی۔

"اور کتنا صبر، کتنا انتظار کرواؤ گی؟ آدھی تقریب تو گزر گئی۔" ثاقب کا لہجہ شکوہ کناں ہوا۔

"آدھی گزری ہے نا، پوری تو نہیں، ہم بس پہنچنے والے ہیں، تمہیں بتایا تو تھا کہ میری ایک کزن کی آج بارات ہے۔ وہاں جانا بھی ضروری تھا۔ وہاں سے ہو کر اب تمہاری طرف آ رہے ہیں۔" صوفیہ نے رسان سے وضاحت کی۔

"میری فون کالز کا ریلائی بھی نہیں دیا؟"

"چارجنگ ختم ہو گئی تھی۔ اب چارج کر کے، تمہیں کال کی ہے۔"

"کتنی دیر میں پہنچو گے تم لوگ؟"

"یہ لو پہنچ گئے۔" ثاقب نے سامنے دیکھا جہاں کار آ کر رکی تھی، دروازے کھلے اور سوار اترنے لگے۔

ثاقب کا چہرہ کھل اٹھا، اس نے فون آف کر کے جیب میں رکھا اور مہمانوں کی طرف بڑھ گیا۔

سب سے علیک سلیک کر کے اس نے صوفیہ پہ نگاہ ڈالی، بلیک شیفون کی اسٹائلش میکسی میں اس کی گوری رنگت دمک رہی تھی اور متناسب سراپا، نمایاں ہو کر اور بھی پرکشش لگ رہا تھا۔ میک اپ اور دیگر لوازمات نے اس کے حسن میں کئی چاند لگا دیے تھے۔

ان کے ہمراہ چلتا ہوا وہ ہال میں اندر آ گیا۔

☆☆☆

عائلہ کی چوتھی، چالے کی تقاریب فائیو اسٹار ہوٹل میں منعقد کی گئی تھیں۔ قریبی رشتے دار تھے، اس میں بھی اچھے خاصے مہمان ہو گئے تھے۔ بوفے میں درجنوں پکوان تھے ایک ایک ڈش چکھنے چکھنے میں ہی پیٹ بھر جائے۔ عائلہ کا عالی شان جوڑا، زیور، تیاریاں اور دولہا کا لباس و دیگر لوازمات، آج سارا اہتمام میکے کی طرف سے تھا اور پچھلی دونوں تقاریب کی طرح آج کی تقریب پر بھی پیسے کو پانی کی طرح بہایا تھا۔ نہیں پانی تو وہ ہر مہینے ہزاروں روپے خرچ کر کے ٹینکر منگواتے تھے۔ اور اسے احتیاط سے خرچ کرتے تھے۔ تقاریب پر جو پیسہ لٹایا، بڑی بے دردی سے لٹایا تھا۔

فرید احمد کا قول تھا کہ خرچ کرنے میں کنجوسی نہ کرو۔ محنت کریں گے۔ اس سے زیادہ کما لیں گے۔" اور واقعی محنت کرنے میں تو انہیں بالکل بھی آلکسی نہیں تھی۔

بیٹی کی چوتھی، چالے ختم ہوئے تو وہ شوہر کے ساتھ ماہ عسل (ہنی مون) منانے ملک سے باہر چلی گئی۔ پیچھے امی نے اخراجات کا حساب کتاب لگایا اور پہلی بار متفکر ہوئیں۔

"بات سنیں۔" انہوں نے شوہر کو مخاطب کیا۔ جو آئینے میں دیکھتے ہوئے بالوں میں ڈائی لگا رہے تھے۔

"سناؤ۔" انہوں نے کنپٹی کے پاس احتیاط سے برش کا اسٹروک لگایا۔

"شادی پہ بہت زیادہ ہی خرچا ہو گیا ہے۔ اب ذرا ہاتھ کھینچ کر چلیں۔"

وہ یہ بات اس لیے کہہ رہی تھیں کہ سسرال میں بہت قریبی تین شادیاں آ رہی تھیں اور فرید احمد عادت کے مطابق شاہ خرچ اور دریا لو بن جاتے۔

"ہم ابھی بیٹھے ہیں بیگم، اور جب تک ہیں ہم، نہ کر میری جان کوئی غم۔" انہوں نے مزاحیہ انداز اختیار کیا۔

"بڑی پھپھو کے گھر جو شادیاں ہیں، ان میں زیادہ شو بازی مت دکھایئے گا۔ بس ایک حساب سے لینا دینا کیجیے گا۔ آپ کی تو عادت ہے، کوئی، جھوٹے منہ مرغی مانگے تو آپ پورا ہاتھی بخش دیتے ہیں۔" بیگم صاحبہ نے چبھتی ہوئی آواز میں تنبیہہ کی۔

"ننھی منی سی مرغی کس کو نظر آتی ہے؟ ہاتھی تو کسی کی نگاہ سے بچ ہی نہیں سکتا، الگ ہی کھڑا دکھائی

دیتا ہے۔"

فرید احمد نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ شکل و صورت اور وضع قطع کے معاملات میں اللہ کی خاص مہربانی تھی اس پر، اپنی عمر سے ذرا کم ہی دکھائی دیتے تھے، اس عمر کے عام مردوں کے برعکس نہ تو سر میں تنج تھا نہ ہی توند نکلی تھی۔ کوئی ایسی بیماری بھی نہیں تھی، پھر بھی نہ جانے کیا ہوا؟

بیٹی داماد سیر و تفریح کرکے جس دن واپس آئے، اس کے اگلے روز ہی فرید احمد کی قضا آ گئی۔ بہانہ بنا ہارٹ اٹیک کا، دل دھڑکتے دھڑکتے رک گیا۔ گھر کے سربراہ کی اس اچانک موت نے گھر والوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور باہر والوں کو چونکا دیا تھا۔ حالانکہ آئے دن کسی نہ کسی گھر میں عزرائیل کی کارفرمائی دیکھتے تھے پھر بھی احباب حیران تھے۔

"اچھا بھلا تھا۔ باتیں کرتے کرتے گر پڑا اور بس ذرا دیر میں ختم ہوگیا۔ ہائے ہائے میرا شہزادوں سا بھائی، کیسے چٹ پٹ ہوگیا۔"

بڑی آپا سوئم والے روز بھی بین کر رہی تھیں۔ لاؤنج کے کونے میں بیٹھی سفید دوپٹہ اوڑھے بھاوج نے گم سم ہو کر انہیں دیکھا، آج تیسرا روز تھا، انہیں ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا۔

عائلہ ان کے پاس بیٹھی سپارہ پڑھ رہی تھی۔ چھوٹی حدیقہ ذرا دور چھوٹی پھپھو کے پاس بیٹھی تھی۔ ثاقب سمیت تینوں بھائی مختلف مصروفیات کے سلسلے میں اندر باہر کے چکر لگا رہے تھے۔ گھر کے باہر بڑا سا پنڈال لگا تھا جو ڈھیرے رشتے داروں، محلے دار اور دوست احباب سے بھرتا جا رہا تھا۔

ہلکے سے رنگ کے سادہ شلوار قمیص میں ثاقب کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ آنکھیں اور چہرہ ستے ہوئے تھے۔ دو تین روز میں ہی وہ یکا یک بہت بڑا اور بہت ذمے دار ہوگیا تھا۔ باپ کی موت والے روز اسے عملی تجربہ ہوا تھا کہ آج کے دور میں اس شہر نا پرساں میں جینا اگر مشکل تھا تو مرنا بھی آسان نہ تھا۔ جانے والا چلا جاتا ہے اور پیچھے لواحقین کا امتحان شروع ہو جاتا ہے۔

قبرستان اپنے مکینوں سے بھرے پڑے تھے۔ نئے مہمان کی گنجائش نکالنا بہت ہی مشکل ہو جاتا، ہر شے کی طرح آخری آرام گاہ کے ریٹ بھی آسمان کو چھو رہے تھے۔ تدفین کے مراحل میں ہی پچاس ہزار سے اوپر رقم خرچ ہوگئی تھی۔ پھر کڑوی روٹی! جو مرغن غذا میں تبدیل ہوگئی تھی۔ اگرچہ تعزیت کے احکامات میں تو یہ شامل ہے کہ میت کے گھر میں زیادہ دیر نہ ٹھہرا جائے۔ تعزیت اور دعا کرکے کچھ دیر ٹھہر کر واپس ہو جائیں۔ مگر آج کے رسم و رواج کے مطابق میت کے لواحقین کو تدفین کے ساتھ ساتھ آنے والوں کی، تواضع کے لیے دیگیں کھڑکانے کی فکر بھی تھی۔

اگرچہ کسی عقل مند نے، یہ رواج قائم کر دیا تھا کہ کڑوی روٹی کی ذمے داری بہو کے میکے پر ڈال دی تھی۔ اب سمدھیانے میں فوتگی ہو جائے تو بہو کے میکے والے، جاتے والے انسان پہ بھی افسوس کرتے ہیں اور اس رقم کا صدمہ بھی اٹھاتے ہیں جو اس ناگہانی میں، ناگہانی طور پہ ان کی جیب سے نکلی ہے۔ کڑوی روٹی کی جگہ بریانی، قورمے کی دیگیں کھڑکنے لگی ہیں اور جہاں برادری سسٹم ہے۔ وہاں دو چار دیگیں تو اونٹ کے منہ میں زیرہ ثابت ہوتی ہیں۔

فرید احمد کی بہو تو ابھی آئی نہیں تھی۔ ثاقب اور صوفیہ کے رشتے کی بات بڑوں کے درمیان ہو چکی تھی۔ باقاعدہ منگنی ویسی ہی دھوم دھام سے ہونی تھی جیسے کہ عائلہ کی ہوئی تھی۔

عائلہ کی شادی سے فارغ ہو کر، وہ سب اب یہی پلان کرتے رہتے تھے کہ اتنے اہم موقع کو کیا کیا جتن کرکے یادگار بنایا جائے۔ فرید خان بیٹے کی خوشی کے لیے بہت پرجوش تھے مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا، ان کی سناؤنی آ گئی اور اپنے سارے ارمان، ارادے اور خواہشات لیے وہ قبر میں جا سوئے۔

ان کی تدفین کے انتظامات کے ساتھ ساتھ ثاقب نے بریانی کی کئی دیگوں کا آرڈر بھی دیا کہ برادری، رشتے داروں، محلے داروں کے علاوہ دوست احباب اور شناساؤں کی ایک بڑی تعداد بھی جو میت میں موجود تھی۔ رواج کے مطابق سب کو کھانا کھلانا تھا۔

سوئم کے روز بھی لوگوں کی ایک بڑی تعداد تھی۔ آج کے روز کا بندوبست بڑے پیمانے پر تھا۔ بریانی اور زردے کی تین دیگیں قریبی مدرسے میں بھی پہنچائیں اور کئی دیگوں سے لوگوں کی خاطر کی۔

باہر وسیع پنڈال کے ایک حصے میں مردوں کے لیے بندوبست تھا۔ باقی پورا پنڈال عورتوں، بچوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

دعا کے بعد، دسترخوان بچھا اور خلقت کھانے پر ٹوٹ پڑی۔

شافعہ بھابھی کی پلیٹ لبالب بوٹیوں سے بھری ہوئی تھی، ایک کے بعد ایک، جلدی جلدی نوالے پلیٹ سے معدے میں منتقل کرتے ہوئے انہیں اچھو لگ گیا۔

''ارے بھابھی آرام سے۔'' برابر بیٹھی دیورانی نے جلدی سے انہیں پانی دیا اور ان کی کمر سہلائی۔

''اُفوہ.....!'' شافعہ بھابھی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، پانی پی کر انہوں نے گلاس رکھا۔ ''بریانی تو کولڈ رنک کے بغیر کھائی ہی نہیں جاتی۔''

''سوئم ہے بھابھی! اب اتنے اہتمام کون کرے۔'' دیورانی نے انہیں یاد دلایا۔

''تو کیا ہوا، جب سوئم میں زردہ بن سکتا ہے تو کولڈ رنک بھی رکھی جا سکتی ہے۔''

''راستے میں کہیں ٹھہر کر پی لیں گے'' دیورانی کی ساری توجہ ڈش کی طرف تھی جو آتے ہی خالی ہو رہی تھی، چاول تو یونہی رہ جاتے، لوگ چمچے چلا چلا کر بوٹیاں نکال کر پہلے سے بھری پلیٹوں کو بھر رہے تھے۔

''بریانی بھی بیف کی بنوائی ہے، اللہ بخشے فرید چچا زندہ ہوتے تو مٹن کی دیگیں بنواتے اور کولڈ ڈرنک تو ہر فلیور کی ہوتی۔'' شافعہ بھابھی اپنی رو میں بولتے بولتے لطیفہ ہی بول گئیں۔

''بھابھی! آپ بھی بس.....'' دیورانی نے بمشکل اپنے بے ساختہ قہقہہ کا گلا گھونٹا۔

مہمانوں کے جانے کے بعد بھی کاموں کا ایک ڈھیر تھا جو ثاقب کا منتظر تھا۔ کیٹرنگ والوں کا حساب کتاب، سارا پھیلاوا سمیٹنے کا بندوبست، فارغ ہوتے ہوتے رات کے ڈھائی بج گئے اندر آ کر وہ لاؤنج میں صوفے پر ہی آڑا ترچھا ڈھیر ہو گیا۔

صبح بمشکل نو بجے تھے کہ اس کا موبائل چنگھاڑنے لگا۔

''ہیلو!'' نیند سے بوجھل آنکھوں کو بمشکل کھولتے ہوئے اس نے فون اٹینڈ کیا۔



''ثاقب میاں! میں بول رہا ہوں کریم ماموں۔''

''جی ماموں!'' ثاقب نے ایک جماہی لی۔

''بیٹا! آج دکان پہ آنا ہے تمہیں، مارکیٹ کمیٹی کی طرف سے قرآن خوانی اور دعا ہے، فرید خان کے لیے، پھر دکان کے معاملات بھی دیکھنے ہیں۔''

''ٹھیک ہے ماموں! میں آجاؤں گا۔'' ثاقب نے ہامی بھری اور فون آف کر کے پھر سے آنکھیں موند لیں۔

پچھلے تین روز سے گھن چکر بنا ہوا تھا۔ تھکن کے مارے برا حال تھا۔ اگر کریم ماموں کی کال نہ آتی اور گھر میں کوئی اسے نہیں اٹھاتا تو وہ شاید شام تک ہی سوتا رہتا مگر بہر حال اب اٹھنا ہی تھا۔ گیارہ بجے تک اٹھ کر وہ نہا دھو کر فریش ہوا اور مارکیٹ آ گیا۔

کریم ماموں ملازم لڑکے کے ہمراہ دکان کھول چکے تھے۔ اگر چہ ابھی پوری مارکیٹ تقریباً بند ہی تھی۔ چند دکانیں ہی کھلی تھیں۔ مگر کریم ماموں ابتدا سے ہی اس وقت تک دکان کھول لیتے تھے چاہے پورا بازار بند ہو، وہ پچھلے کئی برسوں سے فرید خان کے پاس ملازم تھے اور دکان کے مالی و انتظامی معاملات میں ان کے مددگار تھے۔ جگت ماموں تھے۔ پوری مارکیٹ انہیں اسی رشتے سے پکارتی تھی۔ حتیٰ کہ ان سے بڑی عمر کے لوگ بھی انہیں ماموں کہتے تھے۔ مہربان اور نیک دل انسان تھے۔ فرید خان آنکھیں بند کر کے ان پہ بھروسا کرتے تھے۔

شام ڈھلے ثاقب گھر واپس آیا تو خاندان کے کچھ افراد آئے بیٹھے تھے۔ جب تک امی عدت میں تھیں۔ ان سب کا آنا جانا لگا ہی رہتا تھا۔

☆☆☆

باپ چھپر چھاؤں ہوتا ہے۔ فرید خان کے جانے کے بعد اس کا شدت سے احساس ہوا۔ ثاقب سمیت سب نے خود کو کڑی دھوپ تلے پایا۔

باپ کا چھوڑا ہوا کاروبار، دکان، انتظامات، سب کچھ اکیلے سنبھالنا، ثاقب کے بس کی بات نہیں تھی۔ اسکول، کالج اور یونی ورسٹی کے بعد کبھی کبھی دکان پہ چلا جاتا تھا مگر باقاعدگی اور سنجیدگی کے ساتھ اس نے باپ کو کبھی جوائن نہیں کیا تھا۔ اب فرید خان کے بعد، گھر میں بڑا ہونے کے ناتے، اس کی ذمے داری تھی گھر چلانا اور گھر والوں کو سنبھالنا۔

یک دم ہی سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا تھا۔ ثاقب کا آخری سمسٹر تھا۔ جیسے تیسے کر کے اس نے امتحان دے ہی دیا۔ ساتھ ساتھ کاروبار بھی دیکھ رہا تھا اور سیکھ رہا تھا۔ چھوٹے تینوں بہن بھائی زیر تعلیم تھے۔ یہ نیا گھر جس میں وہ لوگ رہائش پذیر تھے، پچھلے سال ہی شفٹ ہوئے تھے۔ اس پر لون تھا۔ ہر ماہ بنک میں قسط جاتی تھی۔ پھر گھر کے ماہانہ اخراجات، باپ کی زندگی میں تو سب کے شاہانہ خرچے تھے اور بڑے للے تللے تھے۔ مگر اب بہت سنبھل کر چلنا تھا۔

چالیسویں کے بعد ثاقب نے بیٹھ کر حساب لگایا تو فرید خان کی وفات سے لے کر چالیسویں تک تقریباً چار لاکھ سے زائد اخراجات ہو چکے تھے۔ عائلہ کی شادی کے بعد بینک بیلنس ویسے بھی معمولی سا ہی رہ گیا تھا، اب سارا انحصار کاروبار پر تھا۔ جس کا تجربہ اسے نہ ہونے کے برابر تھا۔ اگر چہ کریم ماموں نے بہت سارا بوجھ اپنے کاندھوں پہ لے رکھا تھا اور اسے بھی گائیڈ کرتے رہتے۔

ایک دو ماہ بعد ہی سب سے پہلے تو وہ بلوں سے گھبرا گیا۔ بجلی، گیس، پانی، تینوں میں سے کوئی بھی سہولت باقاعدگی سے گھر میں نہیں آتی تھی۔ ہر شے کا ناغہ، کمیابی اور عدم دستیابی تھی۔ پھر بھی بل ہر ماہ پہلے سے بھی بڑھ کر آتا تھا۔ ہفتے میں دو بار پانی کا ٹینکر آتا تھا۔ لوڈشیڈنگ معمول کے مطابق اپنے عروج پر تھی۔ اس کے تدارک کے لیے گھر میں جنریٹر کے ساتھ ساتھ سولر سسٹم بھی تھا۔ چولہوں میں اکثر گیس بھی غائب ہو جاتی تھی اس کی وجہ سے گیس سلنڈر بھی اضافی رکھا جاتا تھا۔

بجلی، پانی، گیس کا آدھے سے زیادہ

بندوبست ہم خود کریں اور بل بھی تگڑے تگڑے بھریں۔ ثاقب دوسرے ماہ ہی جھلا گیا۔ اور حقیقت یہ تھی کہ زندگی کا یہ نیا روپ دیکھ کر گھبرا بھی گیا تھا۔

اب تک کی زندگی لاپروائی، بے فکری عیش و آرام سے عبارت تھی، مست خرامی سے ٹہلتے ٹہلتے اس نے اچانک خود کو اور فیملی کو بند گلی میں پایا تو پریشان ہونا فطری امر تھا۔

امی عدت میں تھیں۔ شریک سفر کی یوں اچانک جدائی کا صدمہ، اپنی جگہ اور زندگی کے تلخ حقائق اپنی جگہ منہ پھاڑے ہوئے تھے، جنہیں وہ حق دق دیکھ رہی تھیں۔ باقی بچوں کا بھی یہی حال تھا۔ عائلہ تو خیر اپنے گھر کی تھی، یہاں کے مسئلے مسائل، الجھنیں اور پریشانیاں وہ براہ راست خود تو نہیں جھیل رہی تھی مگر فکر مند تو تھی، رہے حدیقہ، بلال اور انس دھچکا انہیں بھی لگا تھا مگر جو ذمے داریاں ثاقب پر پڑی تھیں۔ یہ تینوں ان سے ذرا آزاد اور دور تھے۔ حدیقہ ابھی سیکنڈ ایئر میں تھی اور چھوٹے دونوں بھائی میٹرک میں۔

یہ تینوں ماں اور ثاقب کی چھاؤں میں آ گئے تھے۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ کڑی دھوپ میں کھڑا ہونا، جھلسنا کیا ہوتا ہے اور کیسا ہوتا ہے، ان کی بے فکری اور لاپروائی ہنوز اپنی جگہ قائم تھی۔

☆☆☆

رات کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ آسمان کی مخملیں نیلی چادر بھی سیاہی مائل ہو چکی تھی مگر اس پر ٹنکے تارے خوب روشن تھے اور یہ مزید چمکیلے دکھائی دے سکتے تھے اگر جو اس غریب پرور شہر کی فضا اتنی آلودہ نہ ہوتی تو آسمان تک جاتی نگاہوں کو نظر آتے مناظر اور اجلے ہوتے۔

ثاقب نے گھر کے اندر داخل ہوتے ہوئے ایک بار پھر آسمان پہ نگاہ دوڑائی، پورے راستے چاندنی اس کے ہمراہ سفر کرتی ہوئی آئی تھی اور اب اسے دیکھ کر، مسکائی اور چپکے سے بادلوں کی اوٹ میں سرک گئی۔

ثاقب نے بھرپور شاور لیا۔ فریش ہو کر باہر نکلا تو حدیقہ کھانا لگا رہی تھی۔ بلال اور انس کو اپنی مدد کے لیے لگایا ہوا تھا۔

ثاقب امی کے کمرے میں گیا، حدیقہ، بلال اور انس کے بیڈ رومز کے دروازے کھلے ہوئے تھے اور فل اے سی چل رہے تھے۔

''افوہ'' ثاقب بھنا گیا۔ دونوں کمروں کے اے سی بند کیے پہلے ان تینوں کو ڈانٹا، روزانہ کی ہدایت اور نصیحت دہرائی کہ کمروں سے باہر نکلتے وقت بجلی کی ہر شے بند کر دیں۔

''ہزاروں روپے کا بل آتا ہے یار! تم لوگ بچے تو نہیں ہو کہ بار بار بتانے اور سمجھانے پر بھی سمجھتے نہیں ہو۔'' ڈانٹ ڈپٹ کر کے امی کے پاس آیا وہ نماز پڑھ چکی تھیں۔ دعا مانگ رہی تھیں۔

ثاقب واپس لاؤنج میں آ گیا میز پہ برتن لگے ہوئے تھے۔ کھانا نہیں نکالا تھا۔ امی کا انتظار ہو رہا تھا۔

''کیا پکایا ہے؟'' ثاقب نے کرسی گھسیٹی۔

''آپا رضیہ کوفتے بنا کر گئی ہیں۔'' حدیقہ نے جواب دیا۔ رضیہ بہت پرانی ملازمہ تھی۔ کھانا پکانے سمیت گھر کے بیشتر کام اس کے ذمے تھے۔

''سوئٹ ڈش نہیں بنائی؟'' انس نے فریج کھولا۔

''بھول جاؤ، روز روز سوئٹ ڈش کھانا۔'' حدیقہ نے لاپروائی سے ہاتھ ہلایا۔

''کیا کیا بھول جائیں؟ کتنے دن ہو گئے، باہر کھانا نہیں کھایا کے ایف سی نہ میک ڈونلڈز، نہ آن لائن کوئی آرڈر، روزانہ گھر کا پکا ہوا کھانا پڑتا ہے۔ بلال نے بھی منہ بسورا۔

''جو مل رہا ہے شکر کر کے کھاؤ'' ثاقب نے امی کو آتے ہوئے دیکھا تو اٹھ کھڑا ہوا کرسی پیچھے کر کے انہیں بٹھایا۔

''بھائی! کسی دن تو باہر کھانا کھلا دیں، کھلی فضا میں۔'' انس نے فرمائش کی۔

''حدیقہ! کل کا کھانا لان میں لگانا، باہر کھلی فضا

میں۔" ثاقب نے بشاشت سے بہن کو مخاطب کیا جو سالن کا ڈونگا لا کر میز پر رکھ رہی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے فرماں برداری سے جواب دیا۔

"بھائی......!" انس نے احتجاجاً اسے دیکھا۔

ثاقب اس سے بے نیاز موبائل سے صوفیہ کو میسج کر رہا تھا۔ چند منٹ پہلے اس کی کال آئی تھی۔

"کھانا کھا کر تمہیں کال کرتا ہوں۔" ثاقب نے میسج بھیج کر فون آف کیا اور کھانا نکالنے لگا۔

صوفیہ نے پہلی ہی بیل پہ کال اٹینڈ کی۔ ثاقب تو حال احوال پوچھ رہا تھا مگر صوفیہ کے سوالات ذرا الگ اور تابڑ توڑ قسم کے تھے۔

"تم نے گاڑی بیچ دی؟ پچھلے سال ہی تو نیا ماڈل خریدا تھا کیا نئے ماڈل کی خریدو گے؟"

"نئے ماڈل کی؟" ثاقب مسکرا دیا۔

"وہ جو سیل کی ہے، ضرورت کے تحت ہے، نئی کہاں سے خریدوں گا۔ ابھی تو بزنس کو اور خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہے ہیں ہم۔" وہ سنجیدہ ہوا۔

"کیا بات ہے، کچھ پریشان لگ رہے ہو۔ سب خیریت تو ہے؟"

صوفیہ سے اپنے مسائل، اس نے کبھی ڈسکس نہیں کیے تھے اور ویسے بھی جب سے والد کا انتقال ہوا تھا، صوفیہ سے رابطہ بہت ہی کم ہو گیا تھا، اپنی مصروفیات اور مسائل میں گھرا ہوا تھا۔ ان الجھنوں کو سلجھانے میں صوفیہ سے بات کرنے کا وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ آج بہت دنوں بعد وہ ذرا فراغت سے بات کر رہا تھا۔

"بس ابو کے بعد سارے حالات اور معاملات الٹ پلٹ ہو گئے ہیں انہیں ہی دیکھ رہا ہوں۔"

"اچھا بڑے سیریس ہو گئے ہو پہلے تو اتنی دیر میں، چار بار مذاق کر لیتے تھے اور آٹھ بار ہنس لیتے تھے۔"

"زندگی سیریس ہو گئی ہمارے ساتھ، تو ہم بھی ہو گئے، ویسے مذاق اور ہنسنے ہنسانے کی فکر مت کرو۔ کہو تو دو چار لطیفے سنا دوں؟"

"لطیفے سنانے کی کیا ضرورت ہے؟ تمہاری باتیں لطیفے سے کم نہیں ہوتیں۔"

"شکر ہے تم نے چہرہ نہیں کہا۔" ثاقب کی برجستگی پہ وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

"دیکھو، میں نے ہنسا دیا تمہیں۔"

"جوکر ہو نا، وہی ہنساتا ہے لوگوں کو۔"

"جی نہیں، صرف جوکر نہیں، ہنساتا وہ بھی ہے جو آپ کو بہت خاص، بہت اہم سمجھتا ہے۔" ثاقب کی آواز جذبات سے بوجھل ہو گئی۔

"اوہو ایموشنل!" صوفیہ نے اسے چھیڑا۔

"تمہارے لیے بالکل اور بہت۔" ثاقب صرف آج ہی نہیں پہلے بھی کئی بار اپنے جذبوں کا اسی طرح اظہار کر چکا تھا۔

"تم بھی تو کچھ کہو۔" صوفیہ کی خاموشی پہ ثاقب نے اصرار کیا۔

"خاموشی میں بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔" وہ ہولے سے بولی۔

"مثلاً؟"

"مثلاً ایسا کچھ، جو تمہاری فیلنگز اور ایموشنز سے بڑھ کر ہو۔"

"چاہت کے سفر میں مجھ سے آگے ہونے کا دعویٰ کر رہی ہو؟" ثاقب مسکرایا۔

"دعویٰ نہیں حقیقت ہے۔"

"اوہو، یہ تو اور بھی بڑا دعویٰ ہو گیا۔" ثاقب اور بھی کھل کر ہنس پڑا۔

"تم مذاق اڑا رہے ہو!"

"میری یہ مجال، ایسی جرات کر سکتا ہوں؟"

"کرنی بھی نہیں چاہیے۔"

"اچھا بابا! یہ بتاؤ، ہمارے گھر کب آؤ گی؟ یا میں آ جاؤں؟"

"نہ میں آ رہی ہوں، نہ تم آؤ گے، تھوڑا صبر کرو اور انتظار۔"

"وہ تو کر ہی رہے ہیں۔"

ثاقب نے آنکھیں بند کر کے، صوفیہ کا تصور کیا اور پھر یونہی آنکھیں بند کیے اسے سنتا رہا۔ جو عادت کے مطابق بے تحاشا بولتی ہی جا رہی تھی۔

☆☆☆

چوتھی منزل پہ بنا کمرہ اچھا خاصا بڑا تھا۔ سو گز کے اس گھر کے آدھے حصے پر وہ ہال نما کمرہ بنا ہوا تھا۔ جس میں اٹیچڈ باتھ تھا اور ایک کونے میں چھوٹا سا کچن۔

کمرے میں زیادہ ساز و سامان نہیں تھا، اور جو تھا وہ بھی معمولی قیمت کا تھا۔ ایک پرانے وقتوں کی مسہری، ایک لکڑی کی اور ایک لوہے کی الماری، پلاسٹک کی چار کرسیاں جو دیوار کے سہارے ایک کے اوپر ایک رکھی آرام کر رہی تھیں۔

دیگر چھوٹے موٹے سامان کے علاوہ، کچن میں بھی یہی عالم تھا، کچھ برتن اور ضروری سامان و مسالہ جات۔

کمرے کی کھڑکی کے نیچے ایک تخت رکھا تھا۔ عموماً اس پر ہلکی سی بچھونی اور کروشیے کی جھالر والی سفید چادر بچھی ہوتی تھی اور ایک دو گاؤ تکیے، مگر جب شدید گرمی ہو جاتی تو، سارا اس معمولی تام جھام کو لپیٹ کر ایک طرف کر دیتی اور خالی سخت لکڑی پہ لیٹتی بیٹھتی۔

اس وقت بھی اس نے، اس جلے بھنے موسم کے آگ اگلتے تیور دیکھ کر تخت خالی رکھا تھا۔ سر جھکائے وہ دونوں جوڑوں کو پلاسٹک کے بیگ میں ڈال رہی تھی۔

زپ بند کر کے اس نے ایک بڑے شاپر میں دونوں جوڑے ڈالے اور کھڑی ہو گئی۔ گاؤن اور اسکارف پہن کر اس نے چپل پیروں میں ڈالی اور چھوٹی بہن کا انتظار کرنے لگی۔ جو آئینے کے سامنے کھڑی اپنے اسکارف میں درجن بھر پنیں لگا کر اسے سیٹ کر رہی تھی۔

''اچھا دادو، ہم جا رہے ہیں۔'' سارا نے دادی کو مخاطب کیا جو پیالے میں مہندی گھول رہی تھیں۔

''اللہ کے حوالے بیٹا! اللہ خیریت کے ساتھ لے جائے، خیریت کے ساتھ واپس لائے۔'' انہوں نے مہندی کا پیالہ ایک طرف رکھا اور سنک میں ہاتھ دھونے لگیں۔

''گھر سے نکل کر بازار میں داخل ہونے تک بارہ، پندرہ منٹ ہی لگے تھے۔ مطلوبہ دکان پہنچ کر اس نے سکون کی سانس لی اور دکان دار کو جوڑے دکھانے لگی۔ شیفون کے کھلتے ہوئے رنگوں پہ گوٹے کا کام تھا جو ہاتھ سے بنا تھا۔

''تھری تھاؤزنڈ۔'' کپڑوں کا بغور جائزہ لینے کے بعد اس نے آفر کی تو سارا کے تن بدن میں آگ ہی لگ گئی، جو اس کے چہرے سے عیاں بھی ہو رہی تھی۔

''چوری کا مال نہیں ہے خود بنایا ہے، ہاتھ کی محنت ہے۔'' اس نے سامنے پڑا، جوڑا اٹھایا اور تہہ کرنے لگی اور ساتھ ساتھ بولتی بھی رہی۔

''ایک ایک ٹانکا ہاتھ سے لگایا ہے، ایک ستارہ، ایک موتی بھی گلو سے نہیں چپکایا، آپ نے تو گدھے گھوڑے برابر کر دیئے۔'' سارا نے ڈسپلے پہ لگے سوٹ کی جانب اشارہ کیا، جس میں کچھ کام ہاتھ کا تھا اور کچھ ستارے موتی، بٹن اوپر سے چپکے ہوئے تھے۔

''اور یہ جوڑا آپ پچیس ہزار کا بتا کر اٹھارہ بیس میں سیل کرتے ہیں، میرا سوٹ تو اس سے کہیں زیادہ نفیس اور خوب صورت ہے۔''

سارا لگاتار بنا رکے، بول رہی تھی اور لہجے میں تفاخر کے ساتھ طنز کے رنگ بھی نمایاں تھے۔

ثاقب بار بار کچھ کہنے کے لیے منہ کھولتا اور پھر بند کر لیتا، اتنے میں کریم ماموں آگئے جو کام کے سلسلے میں ہی بازار کے اندر تھے۔

''آ گئیں سارا بیٹی؟ کیسی ہو؟'' سارہ کے سلام کے جواب میں انہوں نے شفقت اور خوش دلی کا مظاہرہ کیا۔

''اس نئے لڑکے نے تین ہزار لگائے ہیں، میں

چھ ہزار سے ایک پیسہ کم نہیں لوں گی۔" وہ قطعیت کے ساتھ، کریم ماموں سے مخاطب تھی اور ثاقب اس کے انداز گفتگو، اور لفظوں کے انتخاب پہ جز بز ہو رہا تھا۔

"نیا لڑکا؟"

"میں آنر ہوں یہاں کا۔" بالآخر ثاقب سے ضبط نہیں ہوا، وہ بول ہی پڑا۔

"آنر ہونے میں اور بزنس مین ہونے میں فرق ہوتا ہے۔ آپ کے والد بہت اچھے بزنس مین تھے، وہ ہمارا تیار کردہ مال کسی دوسری دکان پہ نہیں جانے دیتے تھے۔ یہ جوڑے یوں فٹافٹ ہاتھوں ہاتھ بک جاتے ہیں۔ آپ کو نہیں لینا، نہ لیں، میں شیخ برادرز کو دکھا دیتی ہوں وہ تو کئی بار ڈیمانڈ کر چکے ہیں۔" دھمکی آمیز لہجے میں بولتے ہوئے سارا نے دونوں جوڑے تھیلے میں ڈالے اور کھڑی ہو گئی۔

"بیٹھ جاؤ سارا بیٹی! لاؤ یہ جوڑے مجھے دو، میں کرتا ہوں حساب کتاب۔" کریم ماموں نے تھوڑی دیر کی بحث کے بعد دس ہزار میں دونوں کا سودا کر لیا۔

ثاقب خاموش تماشائی بنا دیکھ رہا تھا مگر سارا کے جانے کے بعد وہ بولے بغیر نہ رہ سکا۔

"اپنا مال بیچنے آئی تھی یا لڑنے اور باتیں سنانے؟"

"بس بیٹا! حالات بھی کبھی کبھی انسان کو تلخ کر دیتے ہیں ورنہ تو بڑی خوش مزاج اور ہنسنے ہنسانے والی بچی تھی۔ ماں باپ کیا فوت ہوئے بچے عرش سے فرش پہ آ گئے۔ دادی کی چھپر چھاؤں میں رہتے ہیں۔"

"اچھا!" ثاقب نے عدم توجہی سے ان کی بات سنی، وہ تو موبائل میں آن لائن آرڈرز کا جائزہ لے رہا تھا۔ کریم ماموں اور آگے بھی جانے کیا کیا بتا رہے تھے اس نے ایک لفظ نہیں سنا، اس کا سارا دھیان آن لائن پر تھا۔

☆☆☆

صوفیہ کی سالگرہ تھی، ثاقب کی پوری فیملی انوائیٹڈ تھی۔ عائلہ کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ اسے تو خیر اپنے شوہر کے ساتھ اپنے گھر سے آنا تھا مگر حدیقہ بہت پرجوش تھی۔

"امی، مجھے اپنی شاپنگ کرنی ہے اور صوفیہ بھابھی کے لیے گفٹ بھی لینا ہے۔" اس نے ماں سے فرمائش کی۔

"اتنے کپڑے، جوتے اور جیولری ہے تمہارے پاس، انہی میں سے کچھ پہن لینا، تحفے کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ میرے پاس بہت خوب صورت جوڑے آئے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک پیک کر کے دے دینا۔" ثاقب نے مداخلت کر کے اس کا مسئلہ حل کیا۔

"بھائی! یہ کیا بات ہوئی؟ وہ سب تو نیو فیشن کی چیزیں پہنے ہوئے ہوں گی۔ میں پرانی چیزیں پہن کر جاؤں؟"

"چھ ماہ میں کوئی چیز آؤٹ آف فیشن نہیں ہوتی عائلہ کی شادی کے اتنے سارے کپڑے ہیں۔ کچھ بھی پہن لو۔"

"وہ تو سب نے دیکھ لیے۔" حدیقہ نے ٹھنک کر کہا۔

"تمہیں یاد ہیں کسی کے کپڑے، جوتے، جیولری؟" ثاقب نے تحمل سے چھوٹی بہن کو دیکھا۔

"ابو ہوتے تو کسی سوال جواب کے بغیر ہی شاپنگ کروا دیتے، اتنی بحث نہیں کرتے۔" لاجواب ہو کر حدیقہ نے روہانسی ہو کر رونے کی تیاری کی۔ اس کا یہی حال تھا کہ کوئی فرمائش پوری کروانی ہو تو رونا دھونا مچا دیتی تھی۔

"اگر ابو ہوتے تو مگر یاد رکھو کہ اب ابو نہیں ہیں۔ اب وہ پہلے والی عیاشیاں بھول جاؤ، طریقے سے چلیں گے تو بہتر ہو گا ہم سب کے لیے۔" ثاقب نے حقیقت بیان کی۔

"آپ کی سسرال ہے ہونے والی، اچھے طریقے سے جائیں گے تو آپ کی ہی عزت بڑھے

گی۔" حدیقہ نے بھائی کو قائل کرنے کی کوشش کی۔
"میری عزت، تمہاری تیاری کی محتاج نہیں ہے۔"
"امی......ی......ی......!"
حدیقہ نے ماں کی طرف رخ کیا۔ مگران کی طرف سے بھی ہری جھنڈی دکھائی دی، وہ خود مجبور تھیں۔ اب شوہر کے راج میں بچوں کے اللے تللے کچھ اور تھے، پہلے ساری جمع پونجی عائلہ کی شادی میں لگا دی، پھران کی وفات پر اور چالیسویں تک جو اخراجات ہوئے، وہ بھی لاکھوں میں تھے۔
ثاقب گھر اور کاروبار، دونوں کو سنبھالنے اور چلانے کی کوشش کر رہا تھا اور ظاہر ہے کہ باپ کے دور جیسا بہت کھلا خرچا وہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بہت سنبھل سنبھل کر اور محتاط ہو کر چل رہا تھا۔ مگر گھر کے سب افراد نہ اس طرح سوچ رہے تھے اور نہ ہی عمل کر رہے تھے۔
حدیقہ نے کسی نہ کسی طرح اپنی ضد پوری کر ہی لی تھی۔ اپنی تیاری بھی کر لی اور صوفیہ کے لیے گفٹ بھی خرید لیا۔
سالگرہ کی تقریب میں خاص خاص افراد ہی تھے۔ گھر والوں کے علاوہ، صوفیہ کے دوچار فرینڈز، کزنز اور ثاقب اینڈ فیملی۔ سالگرہ میں اگرچہ مہمان بہت زیادہ نہیں تھے مگر پکوان بہت سارے تھے، درجنوں کے حساب سے۔ جس ریسٹورنٹ میں سالگرہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ وہاں کے بوفے سسٹم میں سو کے قریب کھانے پینے کے اسٹال تھے۔
حدیقہ اور امی گھر آ کر بھی تعریف میں رطب اللسان رہیں۔ صوفیہ کا ڈیزائنر جوڑا، تیاری، تقریب، ہر لحاظ سے وہ ایک یادگار فیملی فنکشن تھا۔
اگلے روز صوفیہ سے باتیں کرتے ہوئے وہ بہت خوش تھا۔ مگر یہ خوشی زیادہ دیر تک برقرار نہ رہی۔ صوفیہ کی باتوں کا آغاز تو اپنی برتھ ڈے پارٹی سے ہوا تھا پھر تحائف کے بارے میں بتانے لگی، کس نے کیا دیا۔
"میرا گفٹ اچھا لگا تمہیں؟" ثاقب نے بڑے اشتیاق سے سوال کیا۔
"ہاں، اچھی تھی تمہاری گولڈ کی چین، مگر......"
"مگر کیا؟"
"گھر میں سب کہہ رہے تھے کہ ہلکی ہلکی سی ہے۔"
"اچھا!" ثاقب نے بے اختیار ایک گہری سانس لی۔
"مگر میں اور میرے جذبے تو ہلکے نہیں ہیں نا۔"
"گفٹس سے بھی جذبوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جو اہم ہو اس کے لیے کچھ خریدتے وقت پیسے کا منہ نہیں دیکھا جاتا۔"
صوفیہ کا یوں جتانا ثاقب کو عجیب لگا اور تھوڑا برا بھی۔
"تم جانتی ہو کہ میں اسٹرگل پیریڈ میں ہوں، ابو تھے تو بات کچھ اور تھی، اب وہ حالات نہیں ہیں، گھر پہ لون ہے وہ بھی اتارنا ہے، گھر چلانا بھی ہے اور کام بھی دیکھنا ہے۔"
"تمہارے گھر پہ لون ہے؟" صوفیہ ٹھٹک گئی۔
"ہاں، دراصل ابو کے پاس اس وقت اماؤنٹ تو تھا مگر، وہ گھر میں لگا دیتے تو عائلہ کی شادی کیسے کرتے، اس لیے لون لینا پڑا۔"
"تو تمہیں لون بھی اتارنا ہے اور تم نے نئی گاڑی بھی بیچ دی؟" صوفیہ نے ایک گہری سانس لی۔
"ایک سچ بتاؤں، وہ گاڑی بھی بینک سے لی تھی، اس کی تھوڑی سی انسٹالمنٹ بھری تھیں۔ مزید میں نہیں بھر سکتا اس لیے اس سے جان چھڑا کر بنک کے معاملات نپٹائے۔" ثاقب بڑی سادگی اور سچائی کے ساتھ اسے بتا رہا تھا۔
"تم تو بڑی الجھنوں میں گھرے ہوئے ہو آگے لائف میں کیسے سروائیو کرو گے، پھر تینوں چھوٹے بہن بھائیوں کی ذمے داریاں بھی تم

پر ہیں؟" صوفیہ نے جیسے جھرجھری سی لی تھی۔
"دل جل کے کچھ نہ کچھ کرلیں گے یار! تمہارے ساتھ تو مشکل وقت بھی پکنک ٹائم لگے گا۔" ثاقب بڑے خلوص سے مسکرایا تھا۔ مگر صوفیہ کچھ اور سوچ رہی تھی۔
"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ انکل کے بعد تم سب کتنی مشکلات فیس کر رہے ہو۔ تم نے پہلے کبھی کچھ بتایا ہی نہیں۔"
"نہیں، میں نے سوچا کہ میں تو پریشان ہوں اپنے ساتھ تمہیں بھی کیوں پریشان کروں۔"
"اب تو کر دیا نا۔"
"کیا مطلب؟" صوفیہ کے معنی خیز لہجے پہ ثاقب ٹھٹک گیا۔
"کچھ نہیں۔" ادھر ادھر کی دو چار باتیں کر کے اس نے فون آف کر دیا۔

☆☆☆

لو کے گرم تھپیڑے، زوردار تھپڑ کی طرح لگ رہے تھے، مگر کھڑکی، دروازے کھلے رکھنا بھی مجبوری تھی، اگر یہ بند کر دیے جاتے تو گرمی اور حبس سے برا حال ہو جاتا، اس سے بہتر تھا کہ لو کے تھپیڑے برداشت کر لیے جاتے، سو یہ دادی پوتیاں یہی کر رہی تھیں۔ کیونکہ اس بلا کی گرمی میں، یہ کام بھی ضروری تھا جس سے پیٹ کا دوزخ سرد ہوتا تھا۔
"بیٹا! یہ گوکھرو ادھر دو۔" ددو نے زارا کو مخاطب کیا۔
"یہ لیں ددو!" زارا نے گوکھرو ان کی طرف بڑھائے۔
"بٹیا! ٹانکے ذرا باریک کرو۔ یہ موٹے موٹے ٹانکے تو بڑے بھدے لگ رہے ہیں۔" ددو نے اپنے چشمے کی اوٹ سے دوپٹے کا جائزہ لیا جس پر وہ لوگ کام کر رہے تھے۔
"جی اچھا!"
"کتنی ہی باریک اور نفاست سے کام کر لو، کوئی فائدہ نہیں محنت کا معاوضہ دینے میں دکان دار نخرے دکھاتے ہیں۔ اس سے تو اچھا ہے کہ موٹا بھدا کام کرو، جیسے اور لوگ کرتے ہیں۔" سارا نے جلے دل کے پھپھولے پھوڑے۔
"آپ کون سا بخش دیتی ہیں کسی کو، لڑ جھگڑ کر، باتیں سنا کر اپنی رقم نکلوا ہی لیتی ہیں۔" ہوم ورک کرتے گڈو نے دخل در معقولات کی۔
"اپنے حق کے لیے لڑنا ہی پڑتا ہے۔" سارا نے دوپٹے پر سے نظر اٹھائے بغیر جواب دیا۔
"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ کہیں اگر بولنا ضروری ہو تو کوئی حرج نہیں، بول لینا چاہیے، مگر بٹیا! زیادہ گرمی کھانے سے دوسرے کا نہیں اپنا ہی نقصان ہوتا ہے۔ رہی بات محنت کی تو محنت کا اصل صلہ تو اللہ ہی دیتا ہے، بندے کہاں دیتے ہیں۔" ددو نے صلح جو انداز میں سمجھایا۔
سارا نے بحث نہیں کی جو کہ اس کی عادت تھی یا مزاج کے برعکس، اس نے اپنا سارا دھیان گوٹے کی "سکیا" پہ لگایا ہوا تھا۔ جسے بڑی محنت سے بل دے کر اور موڑ کر پھول کی شکل دی گئی تھی۔
"اس بار تو پیسے بڑھاؤں گی ضرور، نیا ڈیزائن ہے، میٹریل بھی زیادہ لگا ہے اور محنت بھی۔" اس نے دل ہی دل میں مصمم ارادہ کیا۔
"آپا دل ہی دل میں یقیناً کوئی پلان بنا رہی ہیں۔" گڈو نے سر اٹھا کر اعلان کیا۔
"بتاؤں ابھی، بڑا آیا ٹیلی پیتھی کا ماہر۔" سارا نے اپنے شرلاک ہومز بھائی کو گھور کے دیکھا۔
"آپا! آج تو بریانی کھلا دو۔" گڈو کا دل ہوم ورک میں کم، باتوں میں زیادہ لگ رہا تھا۔
"کس خوشی میں؟"
"خوشی پہلے تھوڑی آئے گی، بریانی پکاؤ گی تو دل خود بخود خوش ہو جائے گا۔" گڈو نے ترنت جواب دیا۔
"چھوٹے میاں کچھ زیادہ ہی نواب ہو رہے ہیں ددو۔" زارا ہنسی۔
"باپ پر گیا ہے۔ اللہ بخشے تمہارا باوا بھی ایسا

ہی حاضر جواب تھا۔"
"بچپن میں وہ بھی آپ کو تنگ کرتے تھے؟" گڈو نے اشتیاق سے سوال کیا۔
"بس ایسا ہی شرارتی تھا جیسے تم ہو۔"
"یعنی کہ شریف شرارتی!" گڈو نے کالر اکڑایا۔
"یعنی کہ بدمعاش شرارتی!" سارا نے اسی کے انداز میں لقمہ دیا۔
"آج تو گرمی کے سارے ریکارڈ ٹوٹ گئے۔ توبہ توبہ، کیسی گرمی ہے، انڈا رکھ دو زمین پر تو بھن جائے۔"
گرم ہوا کے تھپیڑے کھاتے ہوئے، ددو نے کھڑکی سے باہر نظر دوڑائی، سامنے دیوار پہ تمام دن پرندے آکر بیٹھتے رہتے تھے، آج جھلسا دینے والی لو میں وہ بھی کہیں دبکے بیٹھے تھے۔
"لوگ کیا کم تھے اذیتیں دینے کے لیے جو موسم نے بھی یہی کام شروع کر دیا۔" زارا کی آنکھوں میں جو شکوے مچلتے تھے، وہ اس کی زبان پر آ گئے۔
زارا اور ددو نے بیک وقت اسے دیکھا، وہ تلخ ہو گئی تھی، ادھر ادھر اپنا غصہ نکال لیتی تھی مگر یوں براہ راست شکایت کے الفاظ، اس کی زبان پہ کم ہی آتے تھے۔
ددو کی پلائی گئی صبر و تحمل، قناعت اور برداشت کی گھٹی میں اتنا تو اثر تھا کہ بدترین حالات میں بھی، وہ شکوے کرنے کے بجائے ان حالات کا مقابلہ کرنے میں لگے ہوئے تھے، مگر پھر بھی انسان ہی تو تھے، پتھر تو نہیں، کبھی کبھی دل بھر آتا تھا اور چھلک جاتا تھا۔
"اللہ سے بڑا کوئی نہیں، نہ بندے نہ برا وقت۔" ددو کے لہجے میں وہی تحمل اور ٹھہراؤ تھا جو ان کی شخصیت کا خاصہ تھا۔

☆☆☆

دکان کے اندرونی حصے میں، ثاقب ہیلپر لڑکے کے ساتھ بیٹھا کپڑوں کی چھانٹی کر رہا تھا۔ درجنوں فینسی ملبوسات تھے جو اسٹاک میں تھے۔ ان میں سے کچھ جوڑے ڈسپلے کے لیے منتخب کر کے ہیلپر کے حوالے کیے۔ باہر آیا تو سارا بی بی اپنے تام جھام کے ساتھ موجود تھیں۔ ان کے لائے ہوئے دو جوڑے کریم ماموں کے سامنے پھیلے تھے، جن کا وہ معائنہ کر رہے تھے اور وہ محترمہ خود، دکان پہ موجود ایک دوسرے ہیلپر بچے کا کان پکڑے، مروڑ رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ دانت کچکچا کر اسے ڈانٹ بھی رہی تھی۔
"آئندہ یہ حرکت کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"
"اچھا نا!" سفیر اپنا کان چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔
"ثاقب بھائی!" ثاقب کو دیکھ کر اس نے دہائی دی۔
"یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟ یہ ہمارا ورکر ہے، آپ کو کوئی حق نہیں، بچے کے ساتھ ایسا سلوک کرنے کا، بائی داوے کیا کیا ہے اس نے؟" ثاقب نے اس ہٹلر اور چنگیز خان کی جانشین لڑکی کو تیز لب و لہجے میں مخاطب کیا۔
"آپ کا یہ ملازم اتفاق سے میرا چھوٹا بھائی ہے اور اگر آئندہ، یہ اپنی دوائی کھائے بغیر کام پہ آیا تو اس کے کان مروڑنے کے بجائے اکھیڑ دوں گی سمجھے۔"
اس نے سفیر عرف گڈو کو گھورتے ہوئے اس کا کان چھوڑا تھا۔ ثاقب حیران کھڑا اسے سن رہا تھا اور گڈو اپنی آپا سے مخاطب تھا۔
"اتنی کڑوی دوائی ہے، پتا نہیں کریلے سے بنائی ہے کہ نیم سے، کیسے کھاؤں؟"
"جیسے انڈے والا برگر کھاتے ہو، چاکلیٹس اور چپس کھاتے ہو اور بریانی کھاتے ہو، ایسے ہی دوائی بھی حلق سے نیچے اتارنی پڑے گی۔ انفیکشن اگر بڑھ گیا نا تو اس سے بھی کڑوی دوائی پینی پڑے گی۔"

وہ دھمکانے والے انداز میں گڈو سے مخاطب تھی اور ثاقب کی توجہ اس کے لائے ہوئے جوڑوں کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔ پہلے کے مقابلے میں وہ نیا اور مختلف کام تھا مگر تھا بہت خوب صورت، نفیس اور عمدہ، ثاقب کی آنکھوں میں امڈتی ستائش، سارا کی تیز نظروں سے مخفی نہیں تھی۔ تب ہی اس نے اپنے مخصوص قطعی اور دوٹوک لہجے میں اپنا مطالبہ سامنے رکھ دیا تھا۔

”اس کا اماؤنٹ زیادہ ہوگا، ایک پیسہ کم نہیں لوں گی۔ اس میں محنت بھی بہت لگی ہے اور لاگت بھی۔“

”ہر بار ہی اماؤنٹ بڑھا دیتی ہیں آپ۔“ ثاقب نے اس پر اچٹتی سی نظر ڈالی۔

”آپ کو کون سا گھاٹا ہوتا ہے ہر بار ہر جوڑے کی قیمت گاہک کو بڑھا کر دیتے ہیں۔“ سارہ نے ترنت جواب دیا۔

”سارا منافع ہماری جیب میں نہیں جاتا، ہمیں دکان کا کرایہ بھی نکالنا ہوتا ہے۔ اپنے ورکرز کی سیلری، بجلی کا بل، ایسوسی ایشن کی ماہانہ فیس، مختلف اقسام کے چندے اور سالانہ ٹیکس، ان سب کے ساتھ ساتھ گھر بھی چلانا ہوتا ہے۔“ ثاقب نے آج اس لڑکی کی طبیعت صاف کرنے کا فیصلہ کیا جو ہر بار مہنگے جوڑے بیچنے اور نوٹ کمانے کا طعنہ دیتی تھی۔

”مگر آپ کو تو کوئی کرایہ وغیرہ نہیں دینا پڑتا، آپ کی تو اپنی دکان ہے۔“ سارا نے بھنویں سکیڑ کر اعتراض کیا۔ ثاقب کی تقریر یا وضاحت میں سے یہی نکتہ اس نے اٹھایا۔

”ہر کوئی ہماری طرح خوش نصیب نہیں ہوتا، میں صرف اپنی نہیں اوور آل سب کی بات کر رہا ہوں۔“

”خیر، یہ زندگی کے جھمیلے تو سب کے ساتھ لگے ہوئے ہیں آپ ان کی بات کریں۔“ سارا نے سامنے پھیلے کپڑوں کی جانب اشارہ کیا۔

”بتائیں، کیا ڈیمانڈ ہے آپ کی؟“ ثاقب نے اس کی صاف گوئی پہ لب بھینچے، بھلے ہی وہ بغیر کسی مروت اور نرمی کے بات کرتی مگر یہ حقیقت تھی کہ اس کے بنائے ہوئے جوڑے، ہاتھوں ہاتھ اور منہ مانگے داموں بک جاتے تھے، بلکہ ان کے آرڈرز بھی آجاتے تھے۔

ہمیشہ کی طرح جھک جھک کر کے اور ایک طویل بحث کر کے بصد سارا اپنی بات منوانے میں کامیاب رہی۔

سارا کے جانے کے بعد دو چار گاہکوں کو بھگتا کر وہ کریم ماموں کی طرف متوجہ ہوا جو کارخانے کے متعلق کچھ کہہ رہے تھے۔

”میاں! تمہیں خود چکر لگانا پڑے گا۔ ذرا دیکھ کر آؤ کاریگر ٹھیک سے کام نہیں کر رہے۔ شکایتیں آ رہی ہیں گاہکوں کی طرف سے۔“

”ٹھیک ہے میں کل ہی جاتا ہوں وہاں۔“ ثاقب نے اپنی پیشانی مسلتے ہوئے جواب دیا۔

آج کل وہ کچھ پریشان سا ہو گیا تھا۔ صوفیہ سے رابطہ ہوئے کئی کئی روز گزر جاتے تھے۔ اس نے خود بھی کال نہیں کی اور ثاقب کی کالز بھی بہت کم ہی اٹینڈ کرتی تھی۔

”ایگزامز ہونے والے ہیں شاید، اس کی ٹینشن اور مصروفیت ہو گی۔“

ثاقب سوتاویلات سوچ کر اپنے آپ کو خود ہی بہلا رہا تھا مگر دل تھا کہ بہلنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ خیر یہ دل کے معاملات تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔ بے قراری اور بے چینی سے عبارت، مگر یہ جو دنیا کے معاملات ہیں یہ بھی پریشانیاں اور فکرات سمیٹے بھاگے چلے آتے ہیں۔

☆☆☆

گھر میں خوشی کا موقع تھا۔ عائلہ کو اللہ نے اپنی رحمت سے نوازا تھا۔ ننھیال میں بھی سب بہت خوش تھے مگر ساتھ ساتھ امی اور ثاقب پریشان بھی تھے۔ وہی لین دین کے معاملات، خوشی کے مواقع ہوں یا غم کے، انسان نے اپنے اوپر اتنے بوجھ خود ہی لاد لیے

ہیں، اتنی زنجیروں میں خود کو جکڑ رکھا ہے کہ نہ ٹھیک سے اپنی خوشی میں خوش ہو سکتا ہے، نہ ہی غم کے موقع پہ کھل کے دکھی ہو سکتا ہے۔

عائلہ کی خوشی میں نانی، ماموں، خالہ سب بہت خوش تھے، ددھیال، ننھیال دونوں میں یہ بچہ پہلی خوشی تھا اور امی نے اسی نکتے سے بات کا آغاز کیا تھا۔

''دونوں طرف کا پہلا بچہ ہے چھوچھک دینی ہے، سب لوگ آئیں گے عقیقے میں، دیکھیں گے کہ ننھیال نے کیا دیا ہے۔''

''ٹھیک ہے امی! کریں گے کچھ نہ کچھ، خالی ہاتھ تو نہیں جائیں گے عقیقے میں۔'' ثاقب نے رسان سے جواب دیا۔

''میں نے لسٹ بنوائی ہے، یہ دیکھ لو، کچھ کمی بیشی کرنی ہو تو بتا دینا۔'' امی نے لسٹ ثاقب کی طرف بڑھائی۔

ثاقب نے لسٹ پڑھنی شروع کی، جیسے جیسے وہ پڑھتا گیا اس کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں۔

''امی! یہ بچی کا سامان ہے یا اس کا جہیز؟''

''ارے بیٹا! پہلے بچے کی چھوچھک، کسی جہیز سے کم تھوڑی ہوتی ہے۔'' امی نے ایک گہری سانس لی۔

ثاقب نے بے یقینی سے پھر لسٹ پہ نظر دوڑائی، بچی کے کپڑوں جوتوں، کھلونوں، گاڑیوں، کاٹ، الماری، میز، کرسی، برتن، نہلانے، سلانے، چلانے کے اہتمام سے لے کر ماں بیٹی کے لیے گولڈ کی چیزیں، والدین سمیت ددھیال میں سب کے جوڑے۔

''یہ تو لاکھوں روپے کی لسٹ ہے۔'' ثاقب نے بے بسی سے ماں کو دیکھا۔

''کیا کریں، عزت کی بات ہے، اتنی دھوم دھام سے ہال میں عقیقہ کر رہے ہیں، سارے رشتے دار آئیں گے ان کے، ہمارے خاندان سے بھی قریبی افراد بلائے ہیں، سب دیکھیں گے کہ ہم نے کیا دیا ہے بچی کو۔'' امی نے وہی ٹیپ کا مصرعہ دہرایا۔

''افوہ امی! سب دیکھیں گے تو کیا ہمیں میڈل دیں گے، یا تمغہ یا ٹرافی کہ ہم اتنا جہیز اکٹھا کر کے لائے ہیں؟'' ثاقب جھنجلا گیا۔

''بھائی! اس میں میری شاپنگ شامل نہیں ہے۔'' حدیقہ نے انٹری دی۔

''بس تمہاری شاپنگ کی کمی رہ گئی ہے، ثاقب نے اسے گھورا۔''

''اس بار تو اپنی مرضی اور پسند کی شاپنگ کروں گی۔ یہ تو ہمارے گھر کی تقریب ہے۔''

''بیٹا! مثل مشہور ہے، ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں، جس کا ہاتھی، اس کا ناؤں، ہماری نواسی اور اس کی خوشی، اصل میں تو وہ انہی لوگوں کے گھر کی تقریب ہے۔ ہمارے گھر کی تقریب تو ان شاء اللہ ہمارے بیٹے کی خوشی ہوگی، ذرا عقیقے سے فارغ ہو جاؤں پھر صوفیہ کی امی سے بات کرتی ہوں، میرا تو خیال ہے کہ منگنی کے بجائے نکاح کر دیتے ہیں۔ سال، ڈیڑھ سال میں رخصتی کروالیں گے۔'' امی کی آنکھیں بیٹے کی خوشیاں سوچ کر چمک رہی تھیں۔

''آپ کی بات ہوئی تھی وہاں کسی سے؟'' ثاقب نے مضطرب ہو کر سوال کیا۔

''ہاں، ہوئی تو تھی، مگر کافی دن ہو گئے ایک دو بار میں نے فون کیا تھا وہ گھر پر ہی نہیں تھیں۔'' امی نے سادگی سے بتایا۔

''اچھا، فون کیا گھر پر ہی چھوڑ گئی تھیں؟'' ثاقب کا لہجہ عجیب سا ہو گیا۔

''ویسے صوفیہ بھابھی آج کل ہمارا چیٹ گروپ بھی جوائن نہیں کر رہی ہیں۔ پہلے تو ہر وقت لنک میں رہتی تھیں۔ اب تو ریپلائی بھی نہیں کرتیں۔'' حدیقہ نے بھی شکوہ کیا۔

''ارے مصروف ہو گی اپنی پڑھائی میں، اب ہر کوئی تمہاری طرح موبائل میں اپنی جان اٹکا کے تھوڑی رکھتا ہے ہر وقت۔''

امی نے بیٹی صاحبہ کو لتاڑا جو موبائل کو ہر وقت

اپنے ساتھ ساتھ یوں رکھتی تھی جیسے جاں بلب مریض کے پاس آکسیجن ماسک۔

''امی جان! آج کل ہر کوئی، میری طرح ہی اپنی جان اٹکا کے رکھتا ہے موبائل میں۔'' حدیقہ نے انہیں آگاہ کیا۔

''ارے ہاں، ساری دنیا ہی پاگل ہوئی پڑی ہے اس کے پیچھے، میں کیا ضروری بات کر رہی تھی ثاقب سے، وہ تو ادھوری ہی رہ گئی، ہیں ثاقب پھر ہو جائے گا یہ سب بندوبست؟'' انہوں نے پر امید نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔

''کوشش کرتا ہوں امی! پوری تو نہیں مگر آدھی کے قریب لسٹ پر عمل ہو جائے گا۔''

''ارے بیٹا! یہ غضب نہ کرنا، سدھیانے کے جوڑے وغیرہ تو بہت ضروری ہیں اور باقی سب بھی۔'' امی تو بلبلا اٹھیں۔

''کپڑوں کا کوئی مسئلہ نہیں ہے امی! وہ تو ارینج ہو جائیں گے، مگر، اچھا خیر، میں ٹرائی کرتا ہوں۔'' ثاقب کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

وقت کم تھا عقیقے سے پہلے سارا انتظام کرنا تھا۔ کسی نہ کسی طرح لسٹ کے مطابق بندوبست ہو ہی گیا۔ عقیقے کی تقریب بہت بڑی اور شاندار تھی مگر لاکھوں روپیہ خرچ کر کے جو سامان یہ لوگ لے کر گئے تھے، اسے دیکھ کر سب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

''اللہ ثاقب بھائی! تم نے تو ابو کی طرح خرچا کیا ہے۔'' عائلہ بھی ڈھیروں ڈھیر سامان دیکھ کر حیران بھی ہوئی اور خوش بھی۔

''خوش رہو!'' ثاقب نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا۔ وہ اپنی بہن کو بتا نہیں سکا کہ اپنی استطاعت سے بڑھ کر سارے انتظامات کرنے کے لیے اس نے کیا کیا جتن کیے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ قرض دار بھی ہو گیا۔

''قرضہ تو بعد میں اتر ہی جائے گا بیٹا! مگر ابھی عقیقے میں یہ سب دینا ضروری ہے۔'' امی نے کہا تھا اور ثاقب نے اس لسٹ کو پورا کرنے میں کمر کس لی تھی۔

پوری تقریب کے دوران اس کی منتظر نگاہیں، صوفیہ کو ڈھونڈتی رہیں، مگر انتظار لاحاصل ہی رہا۔ ثاقب نے کئی بار اسے کال کی اور اس کی کال کے جواب میں صوفیہ کا فون رات گئے آیا جب وہ گھر واپس آ چکے تھے۔

''کہاں ہو؟'' ثاقب بہت مضطرب تھا۔

''یہیں ہوں۔ بس ذرا مصروف تھی۔''

''گھر میں سب ہی اچانک بہت مصروف رہنے لگے ہیں۔'' ثاقب نے شکوہ کیا۔

''اور تم لوگ آج عقیقے میں بھی نہیں آئے عائلہ کے، ہم سب نے بہت انتظار کیا کال بھی کی مگر۔''

''اچانک مہمان آ گئے تھے گھر پہ، پھر لیٹ اتنے ہو گئے تھے کہ آنے کا کوئی ٹائم ہی نہیں رہا۔''

''اچھا! ویسے ایک بات بتاؤں۔'' ثاقب نے چند لمحوں کا توقف کیا اور پھر کہا۔

''ہمارے نکاح کی پلاننگ ہو رہی ہے، امی، تمہارے گھر آئیں گی شاید اسی ویک میں۔''

''اتنی جلدی کیا ہے، پہلے تم سیٹل تو ہو جاتے۔''

''زندگی سیٹل ہو جائے، ہم بھی ہو جائیں گے۔'' ثاقب ہلکا سا ہنسا، آج کئی روز بعد صوفیہ سے بات کر کے وہ بہت خوش تھا۔ اپنی خوشی میں اسے نہ صوفیہ کے بیگانے رویے کا احساس ہوا نہ ہی اجنبی لفظوں کا۔

وہ رات خوابوں کی مخملیں رتھ پہ سفر کرتے گزری تھی۔

☆☆☆

کھلے صحن میں بکھری ہوئی تیز دھوپ بلا جھجک، مدعو کیے گئے مہمان کی طرح کمرے میں بھی براجمان تھی، کھلا دروازہ، کھلی کھڑکیاں اور کھلے ہوئے روشن دان، نوکیلی چبھتی ہوئی دھوپ کا ہاتھ پکڑ کر اندر لانے والے بہت فراغ دل میزبان تھے۔

الماری سے ایک بڑا سا تھیلا نکال کر سارا تخت پر لے آئی پلاسٹک کا شاپر، کاغذ اور اخبار کی مختلف

نہیں کھولنے کے بعد جگمگاتا ہوا جوڑا اس کے سامنے تھا۔ پیازی رنگ کی سلک پر عنابی اور کاہی بنارسی لیپلک، اس پر گوٹے کا کام تھا۔ یہ فرشی غرارہ تھا اس کا دوپٹہ بنارسی تھا۔ اس پر بھی یہی کام تھا درمیان کی نسبت چاروں طرف گھنا کام تھا بہت بھاری کرن لگی ہوئی تھی۔

سارا نے جھلملاتی روپہلی کرن کی نرم جھالر پہ انگلیاں پھیریں، اس جوڑے کے ایک ایک ٹانکے میں محنت، نفاست اور خوب صورتی ہی نہیں بلکہ ان گنت خواب بھی پیوست تھے اگرچہ اس نے تہیہ کیا ہوا تھا، نہ رونے کا، خود سے عہد کیا تھا آنسو نہ بہانے کا، مگر پھر بھی، پھر بھی اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں جنہیں اس نے بے دردی سے رگڑ دیا۔

ددو! دھیرے دھیرے چلتے ہوئے آئیں اور اس کے قریب تخت پر بیٹھ گئیں۔

''تو تم نے فیصلہ کرلیا؟'' ایک بے بس نگاہ انہوں نے پہلے سارا پہ پھر جوڑے پہ ڈالی۔

''جی!'' سارا کی آواز، آواز نہیں، سرگوشی تھی۔ اس نے دوپٹہ تہہ کرنا شروع کیا۔ جوڑا، تھیلے میں ڈال کر وہ کھڑی ہوگئی۔

''ابھی جارہی ہو؟''

''جی۔''

''دھوپ بہت تیز ہے، ڈھل جائے ذرا، پھر چلی جانا۔''

''نہیں، میں ابھی جاؤں گی۔'' سارا اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

ثاقب نے اپنے سامنے پڑے اس جوڑے کو دیکھا، جو اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جگمگا رہا تھا اور نگاہوں کو خیرہ کررہا تھا۔

''یہ تو بہت اعلیٰ اور بہت مختلف چیز ہے۔'' ثاقب بے ساختہ بول اٹھا۔

''میٹریل بھی شاندار ہے۔'' اس نے توصیفی انداز سے دوپٹے کی کرن کو چھوا۔

''ایسی چیز عام مارکیٹ میں تو نہیں ملتی یہ کہاں سے لی؟''

''یہ میری دادی جان کی ہے، بہت پرانی مگر بہت اچھی، اس کی چمک بالکل بھی ماند نہیں پڑی۔'' پہلی بار سارا کی آنکھوں میں نرم سا تاثر ابھرا۔

ثاقب نے پورے جوڑے کا معائنہ کیا اور دل ہی دل میں ایک فیصلہ کرلیا۔ یہ جوڑا اس نے صوفیہ کے لیے منتخب کرلیا تھا۔

''منگنی ہو یا نکاح یہ سوٹ اس کے لیے موزوں ہے۔'' اس نے دل ہی دل میں سوچا اور سر اٹھا کر سارا کو دیکھا۔

''اس کا اماؤنٹ، آپ کی مرضی کا، جو چاہیں جتنا چاہیں۔''

اس کی چمکتی آنکھوں میں، مستقبل کے حوالے سے کچھ خواب روشن تھے۔ اس نے غور نہیں کیا کہ بڑی حسرت سے، اس جوڑے کو دیکھتی ہوئی اس لڑکی کی آنکھوں میں بجھی بجھی سی کوئی راکھ ہے۔

''اس کا اماؤنٹ......'' اس کا اماؤنٹ میں بعد میں لے جاؤں گی۔'' سارا کی آواز حلق میں پھنس رہی تھی۔ وہ ٹھہری نہیں چل دی۔

''عجیب لڑکی ہے، ویسے تو لڑجھگڑ کے رقم بڑھواتی ہے، پیسے نکلواتی ہے اور اتنا شاندار جوڑا یونہی چھوڑ گئی۔ اماؤنٹ بھی طے نہیں کیا۔'' ثاقب نے جاتی ہوئی سارا کو حیرت سے دیکھا۔

☆☆☆

سفیر عرف گڈو نے ثاقب کو دوپٹہ تہہ کرتے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں شناسائی کے ساتھ ساتھ حیرت کی رمق ابھری۔

''یہ......یہ کہاں سے آیا؟'' اس نے ثاقب سے سوال کیا۔

''تمہاری آپا دے کر گئی ہیں؟''

''آپا مگر کیوں؟'' اس کی بڑی بڑی پلکوں والی سیاہ آنکھوں کو حیرانی نے گھیرا ہوا تھا۔

''بیچنے کے لیے اور کیوں بھئی۔'' ثاقب اس

کے سوالات سے اکتا گیا۔ وہ بولتا بھی تو بہت تھا اور سوالات بھی اتنے ہی زیادہ کرتا تھا۔

"مگر یہ تو ان کی شادی کا جوڑا ہے، اسے کیوں بیچ رہی ہیں؟"

"شادی کا؟ تمہاری آپا کی شادی ہوگئی ہے؟" دوپٹہ تہہ کرتے ثاقب کے ہاتھ تھم گئے۔

"ہوئی نہیں، ہونے والی تھی۔" گڈو بولتے بولتے نزدیک پڑے اسٹول پہ ٹک گیا۔

"ہونے والی تھی؟ پھر؟" ثاقب نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا جو اپنی آپا سے مشابہ تھا۔

"بقرعید کے بعد ان کی شادی تھی پھر شادی کینسل ہوگئی۔"

"کیوں؟"

"جن سے شادی ہو رہی تھی نا، وقاص بھائی، انہوں نے کسی اور سے شادی کرلی۔"

"کس سے؟"

"مجھے کیا پتا۔" اس بار جھنجلانے کی باری گڈو کی تھی۔ یہ ثاقب بھائی تو مجھ سے بھی زیادہ سوال کرتے ہیں۔

"اوہ!" ثاقب نے تاسف سے ہونٹ بھینچے اور جوڑے کو طریقے سے اس کے بیگ میں رکھنے لگا۔

"ثاقب بھائی؟"

"ہوں؟"

"آپا سے مت کہیے گا کہ میں نے آپ کو یہ سب بتایا ہے، وہ بہت ڈانٹیں گی مجھے، بلکہ میرے کان ہی کھینچ کر توڑ دیں گی۔" گڈو کو اب اپنی "غلطی" کا احساس ہوا۔ اس نے مسمسی شکل بنا درخواست کی۔

"نہیں بتاؤں گا۔" ثاقب نے بیگ سنبھال کر ایک طرف رکھا، آج وہ اس جوڑے کو گھر لے جانے والا تھا۔ مگر گڈو کے انکشافات سن کر جانے کیوں دل بوجھل ہو رہا تھا۔

"پتا نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے؟ لوگ کیسے دوسرے کا دل دکھا دیتے ہیں؟ یوں بیچ راہ میں چھوڑ دیتے ہیں؟"

ثاقب کو سارا کے بارے میں جان کر افسوس ہوا تھا شاید اس کی جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو کسی کا دکھ جان کر انسان کو افسوس ہی ہوتا ہے۔

"تو یہ جوڑا ضرورت کی وجہ سے نہیں بلکہ غم وغصے کی بنا پر فروخت کیا گیا ہے۔ تب ہی اس نے پروا نہیں کی کہ اس کی کیا قیمت ملے گی؟" راستے بھر وہ لاشعوری طور پر سارا کے بارے میں سوچتا ہوا گھر گیا تھا۔

جوڑا گھر لے تو آیا تھا مگر اب کشمکش میں تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے خرید کر صوفیہ کے لیے رکھ لے یا سارا کو واپس کردے۔

پتا نہیں کتنے شوق اور ارمانوں سے بنایا ہوگا۔" ثاقب نے سوچا مگر اسے یہ خیال بھی آرہا تھا کہ اگر وہ اسے واپس کرتا ہے تو کوئی بعید نہیں کہ سارہ کسی اور کو بیچ دے۔

"فی الحال تو اسے اپنے پاس ہی رکھتا ہوں پھر دیکھتے ہیں آگے کیا سچویشن بنتی ہے۔"

ثاقب نے موبائل نکال کرامی کو کال کی وہ حدیقہ کے ہمراہ صوفیہ کے گھر گئی تھیں تاکہ اس سے منگنی یا نکاح کا معاملہ سیٹل کرسکیں۔

"ہم سب گھر پہنچنے والے ہیں۔" حدیقہ نے ثاقب کی کال اٹینڈ کی تھی۔

تھوڑی دیر میں ہی وہ لوگ گھر واپس آگئے تھے۔ چہروں پہ تھکن کے علاوہ کچھ اور بھی تھا ثاقب ٹھٹک گیا۔

"سب..... خیریت تو ہے نا۔" اس نے باری باری دونوں کا چہرہ دیکھا۔ جہاں ایک ہی تاثر رقم تھا۔

"نہیں کرنی تھی تو پہلے ہی بتادیتے، اتنے دنوں سے کیا ہمیں بے وقوف بنا رہے تھے یہ لوگ۔" حدیقہ ناراضی سے بڑبڑائی۔

"کیا مطلب؟"

"انکار کردیا ہے صوفیہ کی امی نے۔"

"مگر کیوں؟" امی کے آگاہ کرنے پر ثاقب کا

منہ پھلا کا نظارہ لیا۔

"وہ کہہ رہی تھیں کہ ابھی آپ ٹھیک سے سیٹلڈ نہیں ہوئے۔ پھر سر پہ اتنا قرضہ ہے، وہ اتارنا ہے اور چھوٹے تین بہن بھائیوں کی ذمے داریاں، سب کچھ کیسے ہوگا۔"

حدیقہ نے صوفیہ کی امی کے کیے گئے سارے اعتراضات ثاقب کے سامنے دہرا دیے۔

"انہیں اپنی بیٹی کا فیوچر، سیکیور نہیں لگ رہا تھا۔" حدیقہ نے پھر برا سا منہ بنایا۔

"امی؟" ثاقب نے ماں کی طرف دیکھا۔

"بس بیٹا، ان کی لڑکی، ان کی مرضی میں نے بہت سمجھایا مگر وہ پہلے سے ہی فیصلہ کر کے بیٹھے تھے۔ دونوں میاں بیوی ایک زبان تھے۔ ہم کیا کہتے، واپس آ گئے۔"

"صوفیہ سے بات ہوئی آپ کی؟" ثاقب نے سوال کیا۔

"وہ تو سامنے بھی نہیں آئیں۔" حدیقہ نے جواب دیا۔

ثاقب کے پاس پوچھنے کے لیے کوئی سوال نہ تھا۔ امی اور حدیقہ کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا کمرے میں عجیب سی خاموشی چھا گئی۔ پھر تھوڑی دیر بعد حدیقہ نے اس خاموشی کو ختم کیا۔

"ارے دفع کریں! ہمارے ثاقب بھائی کے لیے لڑکیوں کی کیا کمی، دیکھنا اس چڑیل سے زیادہ خوب صورت بھابھی لائیں گے ہم کیوں امی۔"

"ہاں، کیوں نہیں ماشا اللہ لاکھوں میں ایک ہے ہمارا بیٹا ان شا اللہ صوفیہ سے زیادہ اچھی لڑکی ملے گی۔"

ثاقب کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر دونوں ماں بیٹی، اسے بچوں کی طرح بہلانے کے جتن کر رہی تھیں۔

اور کیا ہی اچھا ہوتا، دل اگر واقعی بچہ ہوتا پھر اسے بہلانا اتنا مشکل نہ ہوتا۔ دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے، چت لیٹا ثاقب بہت کچھ سوچ رہا تھا۔

اس نے کئی بار صوفیہ کا نمبر ملایا مگر وہ بند جا رہا تھا۔ اگرچہ بہت طوفانی قسم کا عشق تو نہیں تھا اسے صوفیہ سے مگر پھر بھی ایک جذباتی لگاؤ تھا۔ وہ اچھی لگتی تھی، اتنی اچھی کہ اس اچانک دھچکے پر خود کو سمجھانا، بہلانا اور پیچھے ہٹنا اتنا آسان نہیں تھا۔

تیز دوڑتے دوڑتے انسان کو اچانک، رکنا پڑ جائے تو کبھی وہ منہ کے بل گر بھی جاتا ہے۔ ثاقب کو کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ منہ کے بل زمین پر گر گیا ہو۔ اسے چوٹ پہنچی تھی۔ اسے تکلیف ہو رہی تھی، مگر وہ اپنا درد، اپنی تکلیف کسی سے کہہ نہیں سکتا تھا، بانٹ نہیں سکتا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ اس کے آس پاس کوئی ہمدرد نہیں تھا۔ خیر خواہ نہیں تھا۔ سب تھے اس کے قریب، مگر اس وقت کسی کی دل جوئی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ دکھ، مایوسی، بے بسی سے گزر کر سارے جذبات اور احساسات غصے میں ڈھلنے لگے۔

"کیا میں واقعی بالکل صفر ہوں کہ یوں ریجیکٹ کر دیا جاؤں؟"

خود سے سوال جواب کی جنگ میں وہ ہارتا ہی جا رہا تھا۔ دل گرفتگی ڈھل کر خود ترسی میں بدلنے لگی۔

طیش، غصہ اور چڑچڑا پن اس پہ غالب آنے لگا۔ گھر پہ حدیقہ اور چھوٹے بھائیوں کو بات بات پر ڈانٹ پڑنے لگی۔

یہی حال دکان میں بھی تھا، اس کے ورکرز عتاب کی زد میں آنے لگے، حتیٰ کہ کریم ماموں بھی اس کے چڑچڑے پن سے محفوظ نہ رہے، گاہکوں سے الجھتے الجھتے وہ سارا سے بھی الجھ پڑا۔ حالانکہ اس نے کریم ماموں سے صرف اتنا کہا تھا کہ ڈسپلے میں جو سوٹ لگے ہیں۔ ان میں ایک جوڑے کا نہ کلر اچھا ہے نہ کام، اسے ہٹا کر دوسرا سوٹ لگا دیں۔

"آپ ہر بات میں کیوں دخل دیتی ہیں؟ ضروری ہے جو چیز آپ کو ناپسند ہو وہ کسی کو بھی اچھی نہ لگے؟" ثاقب اس پر برس پڑا۔

"جو انسان تھوڑا سا بھی ذوق اور شعور رکھتا ہو وہ ضرور اعتراض کرے گا۔"

سارہ، اس کے خلاف معمول رویئے پہ نہ حیران ہوئی نہ ہی خائف، البتہ اپنی بات کہنے سے پہلے، اس نے بھنویں سکیڑ کر چند لمحے غور سے ثاقب کو دیکھا ضرور تھا۔

کچھ دیر بعد جوڑوں کی قیمت کے معاملے میں، اس سے الجھ پڑا حالانکہ پچھلی بار وہ اس اماؤنٹ پہ راضی تھا جو سارا ڈیمانڈ کر رہی تھی۔ مگر آج وہ بحث و مباحثے پہ اتر آیا۔

''آپ فی الحال یہ کپڑے رکھیں، اماؤنٹ کی بات بعد میں کریں گے جب آپ کا دماغ ٹھکانے پر ہوگا۔''

وہ بڑے مزے سے کہہ کر چلتی بنی، پیچھے ثاقب پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ ادھر کریم ماموں بھی اسے سمجھا رہے تھے۔

''بیٹا! آج کا یہ چوتھا گاہک ہے جو بغیر کچھ خریدے واپس لوٹ گیا، اگر ایسے ہی تلخ ہوتے رہو گے تو کیسے کام چلے گا۔ دکان داری میں میٹھی زبان ہی سب کچھ ہوتی ہے۔ ہماری شیریں بیانی ہی گاہک کو لبھاتی ہے، وہ کچرا اور ردی بھی خریدنے کو تیار ہو جاتا ہے۔''

''یہ سب باتیں میں سمجھتا ہوں ماموں! مگر اس وقت کچھ بھی سمجھنے سے دل و دماغ قاصر ہے۔''

ثاقب کی جی جان سے آرزو تھی کہ یہ وقت جلدی جلدی، سچ مچ پر لگا کر گزر جائے یہ پل، یہ لمحے، یہ ساعتیں بیت جائیں، اگر یہ سچ ہے کہ وقت سے بڑا مرہم کوئی نہیں تو پھر یہ مرہم جتنی جلدی لگ جائے بہتر ہے۔

☆☆☆

غلطی گڈو کی تھی یا موٹر سائیکل کی، اس غلطی کا خمیازہ دونوں کو ہی بھگتنا پڑا، موٹر سائیکل سوار کو کم کہ وہ اچھا بھلا جوان تھا، جس نے بروقت خود کو سنبھال لیا چند خراشیں مگر ضرور آئیں اور گڈو کو ذرا زیادہ نقصان اٹھانا پڑا کہ وہ بچہ ہی تو تھا۔ ادھر ادھر دیکھے بغیر اندھا دھند بھاگ رہا تھا تیز رفتار موٹر سائیکل سے ٹکرا گیا۔

پیر کی ہڈی میں معمولی فریکچر ہو گیا۔

پلاسٹر چڑھے پیر کے ساتھ بارہ سالہ گڈو کو اپنے ہاتھوں میں اٹھائے اٹھائے، ثاقب اس کے بتائے رستے کے مطابق چل کر، پرانی طرز کے مکان کی ڈھیروں سیڑھیاں چڑھ کر، اب تیسری منزل پہ واقع اس بڑے سے کمرے کے دروازے کے باہر کھڑا تھا۔

دروازہ بجانے کی زحمت نہیں کرنی پڑی، وہ کھلا ہوا تھا اور کھلے دروازے سے تینوں ہی بیک وقت کھڑی ہو کر چیخیں۔

''کیا ہوا؟ یہ کیا ہو گیا؟''

جب تک ثاقب نے اسے اندر مسہری پہ لٹایا، وہ لوگ کتنے ہی سوالات کر چکی تھیں اور ثاقب کے کچھ کہنے سے قبل گڈو نے فٹافٹ ساری کہانی سنا دی۔

''دس بار منع کیا ہے کہ سڑک پر آنکھیں کھول کر چلا کرو، یہ بٹن اللہ میاں نے کس لیے دیئے ہیں؟''

سارا نے حسب عادت ڈانٹ ڈپٹ کی، بس نہیں چل رہا تھا کہ آج تو اس کے دونوں کان مروڑ کر اکھاڑ ہی ڈالے۔

''اچھا چلو چھوڑو، جو مصیبت تقدیر میں ہو، آ کر ہی رہتی ہے۔'' ددو نے رسان سے سارا کو سمجھاتے ہوئے ثاقب کی طرف رخ کیا۔

''آپ کا بہت شکریہ بیٹے! اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔''

''یہ میڈیسنز ہیں، پرچہ بھی اسی کے ساتھ ہے۔ اس پر لکھا ہے کہ کون سی دوائی کس وقت دینی ہے۔''

ثاقب ان کے شکریے پہ جھینپ گیا۔ اس نے جلدی سے ایک شاپر ددو کی طرف بڑھایا۔ جس میں گڈو کی دوائیاں تھیں۔ ایک تھیلے میں جوس کے ڈبے، چپس اور چاکلیٹس وغیرہ تھے، یہ چیزیں ثاقب نے گڈو کے لیے خریدی تھیں۔

''اچھا، میں چلتا ہوں۔'' ثاقب اٹھتے ہوئے بولا اور ساتھ ہی گڈو سے مخاطب ہوا۔

''آرام کرنا میڈیسن پابندی سے اور وقت پہ کھانا۔''
''ایک منٹ، پہلے یہ لیجیے۔'' سارا ایک گلاس میں کولڈ ڈرنک لے آئی، جس کے اوپر کروشیے کا خوب صورت گول کور ڈھکا ہوا تھا۔ گلاس کانچ کی ایک طشتری میں رکھا تھا۔ سارہ نے وہ طشتری ثاقب کی طرف بڑھائی۔
''شکریہ۔'' ثاقب نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے طشتری تھام لی۔
''آپ کا جو بھی خرچا ہوا ہے بتادیں ہم آپ کو واپس کردیں گے۔'' سارہ کا لہجہ خلاف معمول تھوڑا سا نرم تھا مگر سنجیدہ تھا۔
''خرچا؟'' ثاقب کی پیشانی پہ لمحے بھر کو شکنیں پڑیں پھر ہموار ہوگئیں۔
''آپ کے ایک جوڑے کی ادائیگی ابھی باقی ہے نا، اس میں سے کرلیں گے یہ حساب۔'' ثاقب نے کولڈ ڈرنک کا گھونٹ بھر کر اطمینان سے کہا۔
''اچھا!'' سارا لب بھینچ کر وہاں سے ہٹ گئی۔
ثاقب کے جانے کے بعد سارا نے ایک بار پھر جسب توقیق گڈو کی خبر لی۔
''ڈاکٹر نے کہا تھا کہ جوس پینا۔'' گڈو نے آپا کی ڈانٹ ہمیشہ کی طرح ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دی۔
''ہاں، نسخے میں لکھا ہے۔ کریلے کا جوس، وہی نکال کردوں گی۔''
''جی نہیں۔'' گڈو نے فوراً نفی کی۔
''ٹنڈے کی بھجیا بھی تو بتائی ہے، ثاقب بھائی بتا کر گئے ہیں۔'' زارا بھی میدان میں آ گئی اور بھائی کو تنگ کرنے لگی۔
''ددو! دیکھ رہی ہیں آپ، آپ کی دونوں پوتیاں مل کر میرا بھرتا بنا رہی ہیں۔'' گڈو نے ددو سے فریاد کی۔
''مذاق کر رہی ہیں بچے!'' ددو نے گوٹے کی لچھ کھولتے ہوئے اس کی دادرسی کی۔
''مذاق ہی مذاق میں پلا دیں گی کریلے کا جوس۔'' گڈو بڑبڑایا۔

☆☆☆

عائلہ رکنے کے لیے آئی ہوئی تھی۔ اس کی بیٹی ڈیڑھ ماہ کی ہوگئی تھی۔ گھر میں سب کے لیے ننھا سا کھلونا بنی ہوئی تھی۔
رات کے کھانے کے بعد حدیقہ نے سب کے لیے آم کا شیک بنایا تھا۔ جسے پینے کے دوران سب کی خوش گپیاں جاری تھیں۔
''امی! کوئی لڑکی دیکھی ثاقب بھائی کے لیے؟'' عائلہ نے سوال کیا۔
''ہاں، کیوں نہیں، خالدہ سے کہا تھا میں نے، اس نے تین چار لڑکیاں بتائی ہیں، کہہ رہی تھی کہ فوٹو اور ساری تفصیلات سینڈ کردے گی۔ اللہ کرے جلدی سے کہیں بات بن جائے۔''
''آمین!''
''ایسی بہو لایئے گا امی! کہ سب دیکھ کر دنگ رہ جائیں۔ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی، سب کی۔'' عائلہ بہت پرجوش ہورہی تھی۔
''کوئی ایلین لے آتے ہیں، سب دیکھتے ہی رہ جائیں گے۔'' ثاقب نے دخل درمعقولات کی۔
''بھائی! آپ کی کوئی پسند ہے تو بتا دیں۔'' حدیقہ نے بھائی کو آفر کی۔
''اے ہائے! میرا بیٹا اپنے کاموں میں مصروف رہتا ہے یا لڑکیوں کو دیکھتا ہے۔'' نواسی کو گود میں لیے بیٹھی امی تڑپ اٹھیں۔
''پسند کا کیا ہے، ایک نظر میں بھی آ جاتی ہے۔'' انس نے اپنے زریں خیالات کا اظہار کیا اور پھنس گیا۔ دونوں بڑی بہنیں پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ گئیں۔
''ان کو دیکھیں امی! ابھی زمین سے پورے اگے نہیں ہیں اور باتیں؟ یا تجربے؟'' حدیقہ نے لقمہ دیا۔
''بڑے تو ہوجاؤ پہلے، پھر کرنا یہ سب باتیں۔''

''اچھا بھئی بہنو! مجھے معاف کردو۔'' اس نے جھلا کر ہاتھ جوڑ دیے۔

''بھائی کو تو سوال کا جواب دینے دیں۔''

''ہیں بھائی؟''

''ابھی فی الحال تو اس چیپٹر کو کلوز ہی رہنے دیں۔'' ثاقب کا چہرہ بے تاثر تھا۔

''چھوڑو بھائی! ایسی بے وفا لڑکی کے پیچھے کیا جوگ لینا۔'' عائلہ جذباتی فلمیں اور ڈرامے بہت شوق سے دیکھتی تھی۔ اس کی بعض باتوں سے، اس شوق کا پتا چلتا تھا۔

''ایسی بات نہیں ہے، آج کل کون کسی کے لیے جوگ لیتا ہے، میں تو آگے بڑھنے کا قائل ہوں بس بات یہ ہے کہ کاروباری معاملات میں پھنسا ہوا ہوں۔ پہلے وہ سیٹل ہو جائیں پھر دیکھوں گا۔''

ثاقب نے رسان سے جواب دیتے ہوئے حقیقت پسندی کا مظاہرہ کیا۔ اور سچ بھی یہی تھا کہ جب چوٹ تازی تازی تھی تو بہت دیر تک، بہت زیادہ تکلیف محسوس ہوئی، مگر اب دھیرے دھیرے جیسے جیسے ثاقب اس وقت سے آگے بڑھ رہا تھا۔ درد کی شدت میں کمی آتی جا رہی تھی اور سچ یہ بھی ہے کہ حقائق کو قبول کر کے، ان کا سامنا کرنے سے زندگی کی بہت سی مشکلات دھیرے دھیرے آسان ہو جاتی ہیں اور بہت سی الجھنیں، سلجھ جاتی ہیں اور ویسے بھی غم روزگار میں الجھے لوگ مجنوں، رانجھا یا فرہاد بننا افورڈ کر بھی نہیں سکتے۔

ثاقب سونے کے لیے اپنے کمرے میں آکر لیٹا تو بے اختیار ایک تپتا ہوا گرم کمرا یاد آگیا۔ اے سی کی خنکی میں بھی وہ بے چین ہی رہا۔ رات ٹھیک سے نیند نہیں آئی۔

☆☆☆

متوسط طبقے کا چھوٹا سا گھر تھا، پھولوں اور بچوں کی کھلکھلاہٹوں سے سجا ہوا۔

خاتون خانہ کے انتقال کے بعد طاہر عثمانی نے دوسرا نکاح کر لیا تھا۔ ان کی والدہ اور تین بچوں نے گھر کے اس نئے مکین کا استقبال کیا تھا۔ اس وقت سارا انٹر میں پڑھ رہی تھی۔ زارا اور سفیر اسکول میں تھے۔

زندگی میں اطمینان اور سکون تھا۔ کئی گھرانوں کی نسبت خوش حالی تھی گھر میں طاہر عثمانی نے ایک سیکنڈ ہینڈ گاڑی بھی خرید لی تھی۔ مکینوں کا طرز زندگی بہت آسودہ تھا۔ کھانا پینا، پہننا اوڑھنا سب بہت عمدہ تھا۔

طاہر عثمانی، خراد مشین کے کاریگر تھے۔ آمدنی اچھی تھی، بچت کے قائل نہ تھے، کماتے اور شاہ خرچی کرتے اپنے اوپر اتنا خرچ نہیں کرتے تھے مگر گھر والوں کے لیے ان کا ہاتھ اور جیب کشادہ تھے۔ ددو کی فہم و فراست اور تحمل کی وجہ تھی۔ نئی آنے والی خاتون کا طرز عمل اچھا تھا۔ بچے بھی بھلے مزاج کے تھے لہٰذا شب و روز سکون سے گزر رہے تھے۔

اور ان ہی اطمینان بھرے دنوں، میں ایک واقف کار کے ذریعے سارا کا رشتہ آیا تو باہمی صلاح مشورے سے سارا کی بات طے کر دی تھی۔

خزاں کی گرد آلود، ایک زرد شام آنے سے قبل کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ گردش دوران اس گھرانے کی تاک میں ہے۔ سارا سکون، خوشیاں اور گھرانہ ایسے بکھر گیا جیسے خزاں کے پتے۔

طاہر عثمانی کی اچانک وفات کے بعد پریشانیوں اور مصائب نے اس گھر میں ڈیرے ڈال لیے تھے۔ معاملہ اس جذباتی صدمے اور دھچکے تک ہی محدود نہ رہا کہ کسی کا بیٹا اور کسی کا باپ چلا گیا ہے بلکہ مالی اور معاشی معاملات بھی بدحالی کے گرداب کا شکار ہو گئے۔

سفیر ابھی چھوٹا تھا پرائمری اسکول کا طالب علم، خراد کی مشینیں اونے پونے داموں بکیں ان سے اوپر کا پورشن بنوا کر کرائے دے دیا۔ وہ لوگ کرمنل نکلے انہوں نے جعلی کاغذات بنوا لیے کہ یہ گھر انہوں نے خریدا ہے۔ اب مقدمہ عدالت میں چل رہا تھا۔ اسی چکر میں گاڑی بھی بک گئی۔

"امید تو رہے ہیں کہ دو چار ماہ میں مقدمے کا فیصلہ آ جائے گا۔" کریم ماموں نے ایک طویل زندگی اور افراد پہ بڑی بپتا کو تھوڑے سے لفظوں میں سمیٹ کر چند منٹ میں نمٹا دیا۔

محویت سے سنتے ہوئے ثاقب نے ایک گہری سانس لی۔

"ان کے کوئی رشتے دار وغیرہ نہیں ہیں۔ جو اس برے وقت میں کام آ سکتے؟"

"رشتے دار تو سب بڑی بی کے ملک سے باہر ہیں کچھ دوسرے شہروں میں ہیں کوئی بھانجا بھتیجا ہے عدالت کے معاملات وہی دیکھ رہا ہے، خودداری بہت ہے۔ کسی سے مالی مدد نہیں لی۔ پوتیوں کو ساتھ لگا کر خود ہی محنت کر کے یہ وقت کاٹ رہی ہیں۔"

کریم ماموں ان کے پرانے محلے دار تھے حالات سے بخوبی واقف تھے۔ پھر جب سے گڈو کو انہوں نے دکان پر رکھوایا تھا۔ کچھ اس کی زبان بھی وہ حالات سے واقف رہتے تھے۔ گڈو اسکول کے بعد دوپہر میں ان کے پاس آ جاتا تھا۔ دکان میں پہلے ہی ورکر موجود تھے۔ گڈو کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ نہ ہی اس سے زیادہ کام لیا جاتا تھا۔ بس اسی بہانے اسے سیلری کے نام پہ کریم ماموں اپنے پاس سے بھی کچھ رقم دے دیا کرتے تھے۔

ثاقب بھی اب بہت خیال کرنے لگا تھا۔ گڈو کے فرنیچر کے سلسلے میں وہ چند بار کریم ماموں کے ساتھ ان کے گھر گیا تھا۔ دادو خوش مزاج تھیں مزے مزے کی باتیں کرتی تھیں۔ ان کی باتوں میں زندگی کا گہرا فلسفہ بھی ہوتا تھا، مگر بس آٹے میں نمک کے برابر، جیسے عقل مند کے لیے اشارہ۔

ثاقب ان سے بہت متاثر ہوا تھا۔ بدترین حالات نے بھی ان کے مزاج، زبان اور لہجے کو تلخ نہیں کیا تھا۔ بڑی ہمت اور بہادری سے وہ اپنے حالات کا مقابلہ کر رہی تھیں۔

کریم ماموں سے ان کی داستان سن کر، ثاقب کے خیالات اور احساسات نے ایک نیا رخ بدلا تھا۔ وہ جو خود پہ پڑی افتاد کو بہت بڑا غم اور عظیم دکھ خیال کرتا تھا، اب آشنا ہوا کہ اپنی پریشانیاں اور مصائب اس وقت بہت بڑے اور بہت برے معلوم ہوتے ہیں جب انسان اپنے اردگرد سے بے خبر اور دوسروں کی کٹھنائیوں سے ناآشنا ہوتا ہے۔ کبھی دوسروں کے زخم دیکھ کر اپنا درد، اپنی کسک اور اپنی ٹیس بہت چھوٹی اور معمولی معلوم ہوتی ہے۔

ثاقب کو اس گھرانے سے ہمدردی اور لگاؤ ہو گیا تھا۔ تب ہی وہ ان کی اعانت کے خیال سے، ایک فیصلہ کر کے دادو کو پیش کش کر رہا تھا اور حسب توقع ایک شکریہ کے ساتھ اس کی آفر مسترد کر دی گئی تھی۔

"آپ بڑے پیارے اور ہمدرد انسان ہو ثاقب میاں! مگر بات یہ ہے کہ ہم یہیں ٹھیک ہیں۔ یہ گھر ہماری استطاعت سے باہر نہیں ہے بس ذرا موسم کی شدتوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے مگر وہ تو لوگوں کی ایک بڑی تعداد کرتی ہے۔ ہم کوئی انوکھے تو نہیں پھر اب موسم تبدیل ہو رہا ہے۔ گرمی کا زور تو ٹوٹ ہی گیا ہے۔ یہ ایک آدھ ماہ اور نکل جائے پھر تو راوی تھوڑا سا چین لکھ دے گا۔"

دادو کے بوڑھے چہرے پہ وقار کے ساتھ ساتھ تحمل اور ٹھہراؤ بھی تھا۔

"مجھے معلوم ہے آپ، اپنوں کی مدد قبول نہیں کرتیں مگر میں تو غیر ہوں اور یہ ہیلپ نہیں بلکہ ڈیل ہے۔ جب تک مقدمے کا فیصلہ نہیں ہو جاتا۔ آپ اس فلیٹ میں شفٹ ہو جائیں جو کرایہ آپ یہاں دے رہی ہیں وہی دے دیجیے گا۔ باقی حساب کتاب بعد میں کر لیں گے۔ وہاں سیکورٹی کا بھی اتنا مسئلہ نہیں ہوگا۔ کریم ماموں بتا رہے تھے کہ وہ لوگ دھمکیاں دے رہے ہیں آپ کو؟"

"دھمکیاں نہیں بیٹا! گیدڑ بھبکیاں ہیں۔ میں نے اس کی رپورٹ درج کروادی تھی۔ مقدمہ ہار رہے ہیں تو اوچھے ہتھکنڈوں پہ اتر آئے، ویسے بھی بیٹا بس آنکھوں کی سوئیاں باقی رہ گئی ہیں اللہ خیریت

کے ساتھ یہ وقت بھی نکال دے۔ آمین۔"

☆☆☆

سہ پہر ڈھل کر شام کی پھیلی بانہوں میں گم ہو رہی تھی۔ گرمی کا زور اور شدت کب کی ختم ہو چکی تھی۔ اب ہوا بڑی فرحت بخش ہو چلی تھی۔

بازار میں دکان کے آگے کھڑی سارا نے ہاتھ میں موجود لسٹ کو غور سے پڑھا۔

"چمپا گھوکھرو، چوڑے فیتے کا گوٹا، باریک سسکیاں، پتیاں......"

وہ ایک ایک کر کے لسٹ کے مطابق خریداری کا جائزہ لے رہی تھی۔ ساری لسٹ مکمل ہو چکی تھی۔ ادائیگی کر کے چند قدم آگے بڑھی تھی کہ کوئی اس کے آگے آیا۔ سارا کی نظر اس پر پڑی اور اس کے اندر اشتعال کی ایک لہر اٹھی۔

"راستہ چھوڑیں میرا۔"

"سارا پلیز دس منٹ کے لیے میری بات سن لو۔"

"مجھے کوئی بات نہیں سننی۔" سارا ایک طرف سے نکل کر آگے بڑھنے لگی۔

"دیکھو، ہمارے فیوچر کی بات ہے۔ تم ٹھہر کر سن تو لو، مجھے......"

"راستے میں پریشان مت کریں مجھے۔" وہ دبے دبے لہجے میں غرائی اور تیز تیز قدم بڑھانے لگی۔ مگر وہ مستقل ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کچھ کہہ رہا تھا۔

"اف کوئی اس شخص سے میرا پیچھا چھڑا دے۔"

سارا نے انتہائی کوفت کے ساتھ مگر سچے دل سے دعا کی تھی اور شاید وہ قبولیت کا وقت تھا۔ تب ہی اس کی نگاہ اچانک ہی سامنے واقع بینک پر پڑی، جہاں سے ثاقب نکل کر باہر آیا تھا اور سارہ تیزی سے اس کی جانب بڑھی تھی۔

"مسٹر ثاقب! آپ پلیز، مجھے میرے گھر چھوڑ دیں گے؟"

"جی ضرور آئیے۔" ثاقب پہلے تو اسے دیکھ کر اور اس کی التجا سن کر چونکا پھر اگلے ہی لمحے خود کو سنبھال کر جواب دیا۔

اتنے میں وہ سارا کے پیچھے پیچھے پھر آ گیا۔

"سارا! تمہیں میری بات سننی پڑے گی۔ کب سے خوار ہو رہا ہوں۔ تمہارے نخرے ہی ختم نہیں ہو رہے۔"

لمبے قد کا وہ لڑکا بہت برہم ہو کر بول رہا تھا گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے ثاقب نے مڑ کر اسے دیکھا۔

"خوار، آپ نے کیا تھا ہمیں اور جی بھر کے کیا تھا۔ اب اللہ کے واسطے میرا پیچھا چھوڑ دیں۔" سارہ چیخ چیخ گئی۔

"اتنا ایٹی ٹیوڈ کیوں دکھا رہی ہو، تم ہو کیا جو اتنا اکڑتی ہو؟ اوقات کیا ہے تمہاری؟" وہ ٹھیک ٹھاک تپ کر بول رہا تھا۔

سارا کی آنکھوں میں جلال عود آیا اس نے دہکتے شعلوں جیسی نگاہیں اس پر مرکوز کیں اور ایک ایک لفظ چبا چبا کر گویا ہوئی۔

"مسٹر! میری اوقات اتنی تو ہے کہ تم جیسی گھٹیا اوقات کے انسان کو ریجیکٹ کر سکوں سمجھے؟ آئندہ اگر اس طرح میرا رستہ روکا تو تمہاری اوقات یاد دلا دوں گی۔" اس پر غرا کر وہ ثاقب کی گاڑی کی سمت بڑھی جو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔

راستے میں ونڈ اسکرین کے باہر سامنے کی جانب دیکھتے ہوئے سارہ کی آنکھوں میں نمی پھیلنے لگی۔ زخموں پر سے کھرنڈ اترنے لگے تو زخم اور درد دونوں عیاں ہو جاتے ہیں۔

میں تو بڑا بہادر خیال کرتا تھا آپ کو۔" ثاقب نے ڈرائیونگ کے دوران اس کی جانب دیکھے بغیر کہا۔

"آپ کا خیال درست ہے، میں بزدل نہیں ہوں۔ مگر انسان تو ہوں۔" سارا کی آنکھوں کی نمی اس کی آواز میں اکٹھی ہو رہی تھی جس پر پڑے جتن

کر کے اس نے قابو پایا۔
"یہ ٹھیک کہا آپ نے، ہم انسان ہیں، پتھر نہیں بن سکتے چوٹ لگتی ہے تو درد کا احساس ہوتا ہے۔ کہیں نہ کہیں سے ہم کمزور ہوتے ہی ہیں یا پڑ جاتے ہیں۔" ثاقب جیسے محتاط ہو کر ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ ویسے ہی دھیرے سے بول رہا تھا۔
"میرے والد صاحب انتقال کر گئے۔ میں اور میری فیملی کرائسز میں آ گئے، پھر میرا رشتہ ختم ہو گیا، اس سے دل کا بھی رشتہ تھا۔ بظاہر یہ عام سی کہانی ہے۔ نہ جانے کتنے لوگ اس طرح کی کہانیوں کا کردار بنتے ہیں۔ مگر وہ دادی ایسے موقعوں پہ کیا کہتی ہیں؟" ثاقب سوچنے لگا۔
"جس تن لاگے، سوتن جانے۔" سارا نے لقمہ دیا۔
"کچھ اور بھی کہا تھا، اسی طرح کی بات۔"
"جس جگہ آگ جلتی ہے۔ وہی زمین گرم ہوتی ہے۔"
"ہاں، یہی، سننے میں جو کہانیاں اور کردار عام سے معمولی سے لگتے ہیں۔ ان پہ کیا گزرتی ہے وہی جانتے ہیں۔ مجھے بھی پہلے بہت رنج ہوتا تھا۔ غصہ آتا تھا میں خود ترسی کا شکار بھی ہوا۔ احساس تنہائی کا بھی، خدا سے بھی شکوے کیے بندوں سے بھی شکایات ہوئیں مگر وہ ایک فیز تھا گزر گیا اور برا وقت گزر ہی جاتا ہے۔ بس ہمیں اس کے گزرنے کے بعد علم ہوتا ہے۔" ثاقب نے احتیاط سے موڑ کاٹا۔
سارا اس کی باتیں سن رہی تھی اور سامنے ونڈ اسکرین کی اندرونی طرف لٹکتے ہوئے چھوٹے سے اسٹف ٹوائے کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی جس مانوسیت کا احساس ہوا تھا، اس کا سبب اسے معلوم ہو گیا تھا اور ایک بار پھر اس کے حلق میں کوئی گولا سا پھنس رہا تھا۔ آنکھوں میں نمی جمع ہونے لگی۔
"یہ گاڑی کب خریدی؟"
"دو مہینے ہوئے ہیں۔ سیکنڈ ہینڈ ہے مگر اچھی کنڈیشن ہے ہماری ضرورت کے لیے کافی ہے۔"
"اگر آپ کا بھی بیچنے کا موڈ ہو تو ہمیں ضرور بتائیے گا۔"
"اچھا!" ثاقب نے ایک نظر اس پہ ڈالی۔ اس کے چہرے پہ کیا تھا وہ سمجھ نہیں سکا۔
"اگر کبھی ارادہ ہوا بیچنے کا تو ضرور بتاؤں گا۔" ثاقب نے اپنا سر ہلایا۔
گھر آ گیا تھا۔ ثاقب نے کار روک دی۔
"دادی کو میرا اسلام کہیے گا۔ ٹائم نہیں ہے ورنہ ضرور آتا۔"
"میں کہہ دوں گی اور آپ کا بہت شکریہ" سارہ دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔
"کس بات کا؟"
"ان سارے لفظوں کا جو آپ نے ہماری دل جوئی کے لیے کہے۔" سارا گاڑی سے اتر گئی۔
☆☆☆
بدلتی رتوں میں معاملات اور حالات بھی بدل رہے تھے۔ واقعات نے اپنا رخ بدل لیا تھا۔ آفات و مصائب کی کڑکتی، گرجتی بجلیاں خاموش ہو گئی تھیں بپھرے ہوئے سیلاب سے روز و شب میں ذرا ٹھہراؤ اور سکون آ گیا تھا۔
کارخانے میں صبح سے دوپہر ہو گئی تھی۔ کاریگروں کے معاوضے کے معاملات تھے میٹریل بہت مہنگا ہو گیا تھا۔ بعض کاریگر نئے تھے کام میں نفاست تھی نہ جدت، کئی گھنٹے سر کھپا کر وہ دکان پر آیا تھا کریم ماموں گڈو سے مٹھائی کا مطالبہ کر رہے تھے۔
"کس بات کی مٹھائی؟ رزلٹ آ گیا؟"
"رزلٹ نہیں، مقدمے کا فیصلہ آ گیا۔ گڈو میاں مقدمہ جیت گئے ہیں اپنا گھر مل گیا ہے انہیں۔"
"یہ تو واقعی مٹھائی والی خبر ہے تم خالی ہاتھ کیسے آ گئے؟"
"آپ دونوں گھر پہ آئیے گا نا، دو دو مٹھائی کھلائیں گی اور آپا بریانی بھی کھلائیں گی اور کباب بھی۔"

گڈو اپنی سی سیاہ پلکوں والی آنکھیں جھپکاتے ہوئے تیز تیز بول رہا تھا۔

وہ اپنی ''آپا'' سے بے حد مشابہ تھا، وہی گھنی، نوکیلی پلکوں والی آنکھیں، تھوڑی پھینی سی ناک جو چہرے کی بناوٹ پہ پھیلتی تھی۔ کٹاؤ دار ہونٹ، جو جلدی جلدی بات کرنے کے دوران گول ہو جاتے تھے اس کا چہرہ دیکھ کر ثاقب کو ایک مانوس سا احساس ہوتا تھا۔ جیسے سامنے وہ نہیں، بلکہ اس کی ''آپا'' کھڑی ہوں۔

اگلے روز کریم ماموں کے ساتھ وہ ان کے گھر گیا تھا۔ ددو کا چہرہ خوشی سے کھلا ہوا تھا۔ اتنے عرصے کی کلفت اور تکلیف یکایک ہی فراموش ہو گئی تھی۔

ددو مسرت سے چمکتا چہرہ لیے کریم ماموں اور ثاقب سے ڈھیروں باتیں کر رہی تھیں۔ سارا نے خوردونوش سے بھری ٹرے لا کر مہمانوں کے سامنے رکھی۔ کریم ماموں اور ثاقب نے اسے مبارک باد دی۔

''شکریہ۔'' وہ مسکرائی اور ثاقب حیرانی سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ ایک مسکراہٹ چہرے کو کیا سے کیا کر دیتی ہے؟

''آج پہلی بار سارا بی بی کو مسکراتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔''

ثاقب سادگی کے ساتھ بے ساختہ گویا ہوا اور اس کے تبصرے پہ سب ہی ہنس دیے سوائے سارا کے جو مسٹر ثاقب کو گھور رہی تھی۔

''اب میں اتنی بھی کھڑوس نہیں ہوں۔''

''ہاں اتنی تو نہیں، بس تھوڑی سی ہیں۔'' گڈو کو آج موقع مل گیا تھا۔

''بتاؤں ابھی؟ بڑے میاں تو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ!'' سارہ نے دور سے ہی اسے دھمکایا۔

''نہیں۔'' گڈو نے بے ساختہ ہی اپنے دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر رکھ لیے اور کریم ماموں سے مخاطب ہو۔

''اللہ میاں بچوں کے کان لوہے کے کیوں نہیں بناتے؟''

☆☆☆

ہواؤں میں خنکی آ کر جانے کو تھی۔ زرد رتوں کی اداسی اور مایوسی، ہری بھری مسکراہٹ میں بدل رہی تھی۔

سارا نے شوق شوق میں جو ہنر ددو سے سیکھا تھا۔ وہ ضرورت بن گیا تھا۔ مختلف یوٹیوب چینلز کی مدد سے اس نے اس ہنر اور اپنے کام میں چار چاند لگا دیے تھے۔

رنگوں کو برتنے کا خاص طریقہ اور سلیقہ دادی سے ہی ورثے میں ملا تھا۔ اب جب کہ طوفان آ کر گزر گیا تھا اور اس کے بعد کی، تباہی اور تخریب بڑی حد تک تعمیر میں بدل چکی تھی۔ وہ اپنے گھر میں آ گئے تھے۔ ان سب کی مسکراہٹ لوٹ آئی تھی۔

سارا کو اپنے رشتے کے حوالے سے جو جذباتی دھچکا لگا تھا اس سے کافی حد تک باہر نکل آئی تھی۔

دنیا کا کوئی غم ایسا نہیں جس کا ماتم عمر بھر کیا جائے۔ دل اور جذبات سے جڑے لوگوں کا دکھ بہت شدت سے محسوس ہوتا ہے۔ بہت دیر تک درد ہوتا ہے مگر یہ درد، یہ تکالیف کم ہوتے ہوتے، مدہم ہوتے ہوتے، ایک نہ ایک روز ختم ہو ہی جاتے ہیں۔

ناقدرے انسانوں پہ اپنے جذبات، عمر اور وقت ضائع کرنا حماقت کے سوا کچھ نہیں۔

سارا کے دل کو قرار آ گیا تھا۔ حقیقت تسلیم کر کے، تکلیف سہہ کر اس نے اپنا برا وقت گزار لیا تھا۔ اب سبز رتوں کا موسم تھا۔

اس نے کھڑکی سے باہر چھوٹے سے صحن میں رکھے گملوں کو دیکھا، جن میں رنگ برنگے پھول آ رہے ہیں کہیں ادھ کھلی، کہیں منہ بند کلیاں تھیں، کہیں پھول پورے کھل چکے تھے۔

سارا انہیں دیکھ کر خوشی سے مسکرائی اور بے اختیار اس کی سماعتوں میں ثاقب کی آواز گونجی۔

"پہلی بار سارا بی بی کو مسکراتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔"

کیا واقعی میں مسکرانا بھی بھول گئی تھی؟ وہ آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور خود کو غور سے دیکھنے لگی۔

☆☆☆

یہ برا وقت ہوتا ہے جو رینگ رینگ کے چلتا ہے، اچھا وقت تو جیسے پر لگا کر گزر جاتا ہے۔ فرید احمد کے انتقال کے بعد دو سال جیسے چیونٹی کی چال سے گزرے تھے اور پھر یہ برس تو یوں گزرا کہ پتا ہی نہیں چلا۔ ثاقب بنک کا حساب کتاب اور مالی معاملات چیک کر کے ابھی نیچے آ کر بیٹھا تھا۔

حدیقہ کا رشتہ طے ہو رہا تھا۔ اگرچہ وہ ماموں کے گھر جا رہی تھی۔ پھر بھی ثاقب نے باقاعدہ کوئی رسم ہونے سے پہلے اپنی ماموں کی فیملی کو بٹھا کر ایک اہم بات ضرور کی تھی۔

"ماموں! ممانی! میں آپ سب سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں کہ میں حدیقہ کی شادی ویسی نہیں کر سکتا جیسی ابو نے عائلہ کی شادی کی تھی۔ میں یہ بات اس لیے بتا رہا ہوں کہ بعد میں عائلہ کے ساتھ حدیقہ کا موازنہ یا مقابلہ نہ کیا جائے۔"

ثاقب نے سنجیدگی سے بات مکمل کی۔ پچھلے تین برسوں میں وہ یکا یک ہی بہت سنجیدہ اور سمجھ دار ہو گیا تھا۔ اور اخراجات میں توازن کے معاملے میں بہت محتاط بھی، اس کی بات سن کر ماموں نے جواب دیا۔

"میری بھانجی ہے، مجھے دو کپڑوں میں بھی قبول ہے۔ تم لین دین کی اور اخراجات کی فکر نہ کرو۔"

ماموں نے بڑی متانت سے بات کی تھی اور ممانی نے بے اختیار ہی پہلو بدلا تھا۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" ثاقب مسکرایا۔

"اپنی حیثیت اور استطاعت کے مطابق جو ہو سکا۔ وہ کروں گا مگر اپنے بجٹ اور حدود میں رہتے ہوئے۔ میں نے اپنی لائف میں کچھ سیکھا یا نہیں مگر ایک سبق ضرور سیکھا ہے کہ میانہ روی سے بہتر اور کچھ نہیں۔"

"یہ تم نے ٹھیک کہا، دکھاوے کے چکر میں ہم اکثر اپنی حدود سے باہر نکل جاتے ہیں، چلو تم نوجوانوں کی سوچ اچھی ہے۔ ہم بڈھے بھی خود کو سدھارنے کی کوشش کریں گے۔"

ماموں مسکرائے اور ان کے ساتھ ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھے جملہ افراد بھی، ممانی نے بھی مسکراتے ہوئے مٹھائی کا ڈبا کھول لیا۔

"لو بھئی سب لوگ منہ میٹھا کرو۔"

منہ تو میٹھا ہو گیا مگر حدیقہ نے بہت شور مچایا بعد میں۔

"آپی کی شادی بیس لاکھ میں کی، میری باری پہ آدھے بھی خرچ نہیں ہوں گے؟"

"بھائی کوئی دھوم دھام کو تھوڑی منع کر رہا ہے۔ سب کرے گا۔ مایوں مہندی، بارات، جہیز، بس الّلے تلّلے نہیں ہوں گے۔" ثاقب کے بجائے امی نے بیٹی کو جواب دیا تھا۔

"اچھا منگنی تو ہو گی نا؟"

"ہو تو گئی، سب کا منہ میٹھا کرا دیا اور کیسی ہوتی ہے منگنی؟ ماموں سے کہہ دوں گا واسع کے ہاتھ انگوٹھی بھجوا دیں۔"

"بھائی.....ئی.....؟"

"ارے ہاں، سب کچھ ہو جائے گا۔ کیوں پریشان ہو رہی ہے لڑکی۔" امی نے اسے گھر کا۔

وہ دل ہی دل میں پہناوئیوں کا حساب لگا رہی تھیں۔ حدیقہ کے بار بار بولنے سے حساب کتاب غلط ہو رہا تھا۔

"ارے ہاں بھائی! ایک بات پوچھنی تھی آپ سے ایک منٹ میں آئی ہوں۔" حدیقہ چھلانگیں مارتی ہوئی گئی اور بھاگم بھاگ واپس آئی۔

"یہ کس کا ہے؟" اس نے ثاقب کی آنکھوں کے سامنے شاپر لہرایا۔

"آپ کے روم کی صفائی کے دوران ملا ہے۔"

"اتنا حسین جوڑا کس کا ہے؟" وہ اب شاپر کھول کر جوڑا نکال رہی تھی۔ گوٹے کے کام کا بے حد

خوب صورت سوٹ، وہ تو فوراً ہی اس پر فدا ہوگئی۔
''یہ...... بکنے کے لیے آیا تھا دکان پر۔''
''میں لے لوں؟ ہینڈ ورک ہے اور اتنی صفائی سے بنا ہے۔''
''نہیں، یہ کسی کی شادی کا جوڑا ہے۔ یہ امانت ہے میرے پاس واپس دینا ہے۔'' ثاقب نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔
''کس کا ہے؟ اگر میں ایسا ہی جوڑا بنواؤں تو؟ بن جائے گا؟'' حدیقہ کی نگاہیں اس پر سے نہیں ہٹ رہی تھیں۔
''اس سے بھاری جوڑا بنوا دیتا ہوں میں، مگر بالکل ایسا نہیں، یہ تو بس ایک ہی پیس ہے، ایک ہی رہنا چاہیے۔'' ثاقب نے جگر جگر کرتا دوپٹہ اٹھایا اور تہہ کرنے لگا۔
''میں تمہیں لے چلوں گا اس کی کاریگر کے پاس، جیسا جوڑا بنوانا ہو، بتا دینا۔''
''ہاں یہ ٹھیک ہے، میں سرچ کر کے ڈیزائین نکال لیتی ہوں موبائل میں۔'' حدیقہ کی باچھیں کھل گئیں۔
حدیقہ کے ساتھ ساتھ امی اور عائلہ بھی تیار ہوگئیں۔
''میں بھی ہینڈ ورک کروا لیتی ہوں۔ حدیقہ کی انگیج منٹ پہ......''
''اور میں بھی......''

☆☆☆

اگلے ہفتے سارا سے اجازت لے کر ثاقب، امی اور بہنوں کو ان کے گھر لے گیا۔
گھنٹہ، ڈیڑھ گھنٹہ لگ گیا، تینوں کو سمجھانے میں کہ انہیں کس قسم کے رنگ، کون سا ڈیزائین چاہیے۔ جب یہ سب طے ہوگیا تو سارا نے ثاقب کو مخاطب کیا۔
''یہ جوڑے میں ڈائریکٹ اپنے گاہکوں کو دوں گی تو پوری پیمنٹ لوں گی، یعنی پورے جوڑے کی اتنی ہی قیمت جتنی دکان پر ہوتی ہے۔''
''ٹھیک ہے، آپ ان سے پوری پےمنٹ لیں۔ مگر گاہک میں لے کر آیا ہوں، میں اپنا کمیشن لوں گا۔'' ثاقب نے کندھے اچکائے۔
''ارے آپ دونوں تو پکے بزنس مین ہیں۔''
حدیقہ نے حیرانی سے اپنے بھائی کو پھر سارہ کو دیکھا۔
سارہ نے سب کو کولڈ ڈرنک پیش کی۔ ثاقب نے چائے مانگی اور چائے کا پہلا گھونٹ پی کر ہی اس کے چودہ طبق روشن ہوگئے۔
''یہ چائے؟'' اس نے بےچارگی سے ددو کو دیکھا۔
''ارے کیا پھر چینی ملانا بھول گئی یہ لڑکی۔'' وہ بڑبڑائیں۔
''اوہ......'' سارا کو اچانک یاد آیا۔
''سوری، ویری سوری۔'' وہ فوراً چینی لے آئی اور شوگر پاٹ ثاقب کے آگے رکھا۔
''دراصل میں پھیکی چائے پیتی ہوں ڈائٹنگ پر ہوں نا آج کل، کسی اور کے لیے بناؤں تو چینی یاد ہی نہیں رہتی۔'' سارا نے بڑی معصومیت سے اپنی صفائی پیش کی۔
''آپ ڈائٹنگ کیوں کرتی ہیں؟ اتنی اسمارٹ تو ہیں۔'' حدیقہ نے جھٹ سے تعریف کی۔
''تب ہی تو اسمارٹ ہوئی ہوں، میٹھی اور فرائی چیزیں چھوڑ دی ہیں۔ کم کر دی ہیں۔'' سارا کو دوپہر میں کھائے فرنچ فرائز یاد آئے۔
''مجھے بھی ٹپ دے دو یار! میری انگیج منٹ تک میں بھی کچھ ویٹ لوز کرلوں۔'' حدیقہ نے مسمسی شکل بنائی۔
''ہاں کیوں نہیں، اپنا نمبر دے دو، میں میسج کردوں گی۔'' سارا نے بڑے خلوص سے پیش کش کی۔

☆☆☆

گھر میں بڑے ریلیکس موڈ میں صوفے پہ بیٹھا تھا امی عائلہ اور حدیقہ زور و شور سے باتوں میں مصروف تھیں جب ثاقب نے انہیں مخاطب کیا۔

''امی! آپ کو سارا کیسی لگی اور ان کی فیملی؟''
''اچھی لڑکی ہے بیٹا، مگر چائے میں چینی ڈالنا بھول جاتی ہے۔''
''کوئی بات نہیں، چائے میں چینی بے شک بھول جائے مگر برے وقت میں ساتھ دینا اور حالات کا مقابلہ کرنا کبھی نہیں بھولے گی۔''
ثاقب نے باری باری امی اور دونوں بہنوں کو دیکھا، امی کو دبے لفظوں میں وہ پہلے ہی اپنی مرضی بتا چکا تھا۔ مگر اب کھل کر بات کر رہا تھا۔
''تمہاری پسند ہے تو بیٹا! ہمیں کیا اعتراض ہوگا، ویسے دیکھنے میں تو شریف لوگ ہی ہیں۔'' امی نے بیٹے کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تھا۔
عائلہ کے اعتراضات ذرا فلمی اور ڈرامائی تھے۔
دولت مند فیملی نہیں ہے، لڑکی کی ناک بھی تھوڑی چپٹی سی ہے۔''
''نہیں ایسی کوئی چپٹی ناک بھی نہیں، جیسی بھی ہے اس کے فیس لک پہ اچھی لگ رہی تھی۔'' حدیقہ نے بھی بھائی کی پسند کا دفاع کیا۔ اور ساتھ ہی بھائی سے سوال بھی۔
''بھائی! آپ نے سارا سے بات کی؟''
''نہیں۔''
''نہیں؟ بالکل بھی نہیں؟ کوئی ہنٹ بھی نہیں؟''
بہنوں کے ہر سوال پہ ثاقب نفی میں سر ہلا رہا تھا۔
''اگر اس نے انکار کر دیا تو؟''
''اللہ نہ کرے۔'' امی دہل گئیں۔ ''ایک بار میرے بیٹے کا دل ٹوٹ چکا ہے۔ اب کیا دوبارہ۔''
میں سارا کی دادی سے بات کروں پھر؟ امی کو جلدی ہوئی۔
''نیک کام میں دیر کیسی۔'' ثاقب مسکرایا مگر ساتھ ہی حدیقہ کا آئیڈیا بھی کوئی برا نہیں تھا، بات تو کرنی چاہیے سارا سے، اس کی رائے لینا بھی تو ضروری ہے۔
وہ اگلے روز ہی دوبارہ وہاں پہنچ گیا۔
وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ کھلے دروازے سے صحن کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ دادو طوطے کے پنجرے کے پاس بیٹھی اسے امرود اور ہری مرچ کھلا رہی تھیں۔
''میں ابھی آتی ہوں بیٹا! تم سارہ سے بات کرلو ڈیزائین وغیرہ تو یہی بناتی ہے۔ میں ذرا اس کے لاڈ اٹھالوں جب تک۔''
''جی!'' سارہ اس کے مقابل والے صوفے پہ بیٹھی تھی۔
''یہ آپ کا جوڑا؟'' ثاقب نے شاپر سے وہ جوڑا نکالا، جسے دیکھتے ہی اس نے ایک گہری سانس لی۔
''آپ نے پرائس نہیں بتائی ابھی تک۔''
''آپ بیچ دیں اسے، جو مرضی ہو دے دیجیے گا۔ اس کی قیمت کچھ بھی لے لوں گی میں۔''
''کچھ بھی۔''
''ہاں کچھ بھی۔''
''میں چاہتا ہوں کہ آپ یہ سوٹ گفٹ کر دیں۔''
''کیا؟'' گھنی سیاہ پلکوں والی آنکھیں حیرت سے اس کی سمت اٹھیں۔
''جن احساسات اور جذبات کے ساتھ یہ سوٹ بنایا گیا ہے وہ انمول ہیں۔ اس جوڑے کی کوئی قیمت نہیں لگ سکتی، یہ انمول ہے۔''
''میں آپ کو فری میں دے دوں؟ آپ کیا کریں گے اس کا؟''
سارا کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں الجھی الجھی سی ثاقب کا جائزہ لے رہی تھی۔
''آپ کے لیے بھیجوں گا۔''
''میرے لیے؟'' سارہ کو یکا یک ہی کرنٹ سا لگا۔
''جی، آپ کے لیے، اگر آپ ایگری ہوں تو، اگر اس کی کوئی قیمت ہو سکتی ہے تو وہ یہی ہے، آپ کی رضامندی اور...... ہاں مجھے کریم ماموں سے علم ہوا تھا کہ جو گاڑی میں نے خریدی ہے وہ بھی آپ کی فیملی کے پاس تھی۔ شاید اسی لیے آپ اس روز کچھ ایموشنل ہو گئی تھیں۔''
''یہ گاڑی کی چابی۔'' اس نے چابی میز پہ رکھی۔

"جس چیز سے آپ کی یادیں اور ٹیکنالو جڑی ہیں۔ اس پر آپ کا حق زیادہ ہے۔"

سارہ گنگ بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی۔ جسے وہ بنیا کہتی اور سمجھتی تھی اور حقیقت تھی کہ بزنس کے معاملے میں وہ پکا بنیا ہی تھا، مگر دل اور جذبات کے بیچ دکان داری نہیں ہوتی، وہ جانتا تھا، سمجھتا تھا۔

"امی آئیں گی اگلے ہفتے، آپ جب تک اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کر لیجیے گا۔" سارہ کی مستقل خاموشی پر وہ بھی چپ ہو گیا۔

کچھ دیر دونوں کے بیچ خاموشی کی چادر تنی رہی۔

پھر سارہ نے سر اٹھا کر اسے مخاطب کیا۔

"یہ جوڑا اور چابی اپنے ساتھ لے جائیں۔"

"کیوں؟......"

کیوں کہ یہ جوڑا میرے پاس واپس آ جائے گا اور گاڑی بعد میں۔" وہ بولتے بولتے چپ ہو گئی۔

"ٹھیک ہے، گاڑی بعد میں ہم دونوں مل کر استعمال کر لیں گے۔" ثاقب اس کا مفہوم سمجھ گیا۔

"آپ نے یہ سوٹ خود ہی سنبھال کر رکھا تھا؟ سیل کیوں نہیں کیا؟"

"بتایا تو ہے، اس کی قیمت کوئی نہیں دے سکتا تھا۔ اس لیے میں نے ہی اسے حفاظت سے رکھ لیا۔"

ثاقب کو اچانک کچھ خیال آیا۔

"اس کا مطلب، آپ ایگری ہیں؟ اتنی جلدی فیصلہ کر لیا؟" ثاقب کی حیرانی اور خوشی دونوں دیدنی تھیں۔

"ایک منٹ!" سارا نے ہاتھ اٹھا کر تنبیہ کی۔

"لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ رشتے داری کے بعد کسی سے کوئی رعایت ہوگی، محنت کا صلہ کسی کے لیے نہیں چھوڑوں۔"

"ڈن، ویسے میں نے پہلے ہی گھر میں بتا دیا ہے کہ آپ رشتے داروں سے ذرا زیادہ چارج کرتی ہیں۔ ان کو رعایت نہیں دیتیں بلکہ ان سے فیور لیتی ہیں۔"

"اچھا اور کیا تعریفیں کی ہیں میری؟"

"تعریف تو گھر والوں نے کی ہے آپ کی، ان کے خیال میں آپ بھی میری طرح پکی بزنس مین ویمن ہیں، لہٰذا ہماری جوڑی بہت اچھی رہے گی۔"

ثاقب نے بڑے مزے سے بتایا۔

"چلیں، آپ کی امی سے رعایت کر لوں گی۔"

سارہ نے کچھ سوچ کر کہا۔

"رہنے دیں، کوئی ضرورت نہیں ہے کسی سے بھی رعایت کی ویسے بھی گھوڑا گھاس سے دوستی کرے گا تو کھائے گا کیا؟"

"کوئی بات نہیں، گھوڑے کو ڈائٹنگ کی بھی پریکٹس ہے اور گھاس کی جگہ وہ چنے بھی کھا سکتا ہے۔"

"ہاں بھئی ثاقب میاں اور سناؤ کیا حال احوال ہیں؟" دادو اندر آ کر بیٹھ گئیں۔

"سب کچھ اچھا ہے دادی! حال بھی مستقبل بھی۔" ثاقب مسکرایا اور میز پہ رکھے عروسی جوڑے کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ سارہ نے سیل کرنے کے لیے دیا تھا۔"

"ہاں، میں نے تو منع کیا تھا مگر مانی ہی نہیں۔"

دادو ذرا افسردہ سی ہو گئیں۔

"جی بات یہ ہے کہ......"

"میں چائے بناؤں آپ کے لیے؟" سارا بٹ پٹا کر کھڑی ہو گئی۔

"بالکل بنائیں، مگر میٹھی، میں ڈائٹنگ پر نہیں ہوں۔"

"افوہ، ایک بار پھیکی چائے کیا بن گئی، اب بار بار اس کا ذکر ہو گا۔" سارہ جز بز ہوئی کچن میں آ گئی۔

اس نے دودھ پتی چائے میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ چینی جھونک دی۔

آج کی چائے اتنی میٹھی تو ہونی چاہیے کہ ہمیشہ یاد رہے اور اگلی پچھلی ساری کسر نکل جائے۔

مگ میں چائے نکالتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ اندھیری راتوں کو صبر اور محنت سے کاٹنے والوں کے لیے روشن سویرے ضرور طلوع ہوتے ہیں۔

☆

زرقا سکندر

میں تیرے قربان

"جانو میری جان
میں تیرے قربان
میں تیرا تو میری جانے سارا پاکستان

"واہ جی...... یہ کس خوشی میں بکرے کو گیت
سنائے جا رہے ہیں۔"
بکرے کو چارہ کھلاتا ارمان لہک لہک کر گا رہا تھا



رہا تھا جب ساتھ والی چھت پر دھلے کپڑے اتارنے آئی اریبہ نے اسے آواز لگائی۔

"خبر ہی ایسی ہے تم بھی سنو گی تو واللہ جھوم اٹھوگی۔"

آنکھوں میں والہانہ پن لیے وہ اس سے مخاطب تھا۔

"ہائے رومی...... کہیں تمہارا دبئی کا ویزا تو نہیں آگیا۔"

اریبہ بھی پرجوش ہوکر دیوار کے پاس چلی آئی۔

"ویزا بھی آہی جائے گا وعدہ کرو پھر تم بھی مجھے ویسی ہی چوری بنا کر دوگی جو فلم دوبئی چلو میں تاجو نے علی اعجاز کو بنا کر دی تھی۔"

وہ ہنسا۔

"رومی کبھی تو سنجیدہ ہوجایا کرو۔" اریبہ اس پر خفا ہونے لگی۔

"اچھا تو چلو سنو اس بار عید پر بکرے کے ساتھ ساتھ میں بھی قربان ہونے جارہا ہوں۔"

پیار سے بکرے کے سر کو سہلاتا وہ بتا رہا تھا۔

"وہ کیسے بھلا؟"

اریبہ کا تجسس بڑھا۔

"وہ ایسے کہ یہ بکرا تو ہوا میرے اللہ کے حضور قربان اور میں ناچیز آپ پر...... یعنی کہ امی جان نے خیر سے ہم دونوں کے رشتے کے لیے رضامندی دے دی ہے اور اب عید پر کوئی رسم وغیرہ کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔"

"اچھا تو یہ بات تھی۔"

اریبہ کا دل زور سے دھڑکا۔

رومی سے اچھی خاصی بے تکلفی کے باوجود بھی وہ بری طرح شرما گئی اور لاکھ چھپانے کی کوشش کے باوجود اس کے چہرے سے پھوٹتی خوشی کی روپہلی کرنیں اس پھیلتی شام میں بھی رومی کی نظروں کو خیرہ کر گئی تھیں۔

☆☆☆

"الٰہی خیر......"

دال بگھارنے کی آواز سن کر گھر کے اندر قدم رکھتے رفیق الحسن کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

آج پھر دال...... بقرعید کی آمد آمد ہے لگتا ہے ہماری بیگم صاحبہ کی بھی دال پکانے کی روایت کا آغاز ہوگیا ہے۔ چلو رفیق میاں اب پہلے اپنے پیٹ کی فکر کرو اور ابھی سے گرانی معدہ کے لیے پڑیوں کا بندوبست کر رکھو۔

اس لیے کہ عید میں تو ابھی کئی روز باقی ہیں اور ہمارے یہاں روز کے حساب سے ایک دال پکانے کا سلسلہ شروع، کبھی چنا تو کبھی مونگ اور پھر مسور، ملکہ مسور یا دال ماش...... جو عید تک پہنچتے پہنچتے دو دالوں کو ملا ملا کر پکانے پر ختم ہوگا۔ عید کا دن آجاتا ہے مگر ادھر دالوں کی باریاں چلتی رہیں گی۔ یہ صلاحیت بھی خاص خنسا کا وصف ٹھہری، مجال ہے جو ان کے علاوہ کسی اور ترکاری کا سوچ لے۔ واہ خنسا بیگم آپ کے حساب کتاب۔

"اب اندر بھی آجائیں کیوں وہیں ساکت کھڑے ہیں آپ؟"

انہیں دروازے پر ہی گم صم کھڑا دیکھ کر چولہے کے آگے بیٹھی خنسا نے بیلن لہرا کر پکارا تو وہ بھی فوراً سوچوں سے باہر نکلے۔

"لوجی پھر میں آگیا۔"

اور چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ بکھیرتے آگے بڑھ آئے۔

"میں روٹی بنانے لگی ہوں آپ جلدی سے منہ ہاتھ دھو آئیں بس اب......"

"بیلن ہاتھ میں ہے، بڑا سا چمٹا پاس رکھا ہے تیسری اس کی زبان، ایک چھوڑ تین تین ہتھیاروں سے لیس ہے۔ خنسا اس وقت...... میری کسی بات سے یہ اگر ذرا سی بھی بگڑ گئی تو پھر سنبھالنا مشکل ہو

جائے گا۔ لہٰذا رفیق الحسن بغیر کسی مباحثے کے چپ چاپ کھانا کھا کر چلتے بنو، انکار کا مطلب سمجھتے ہو ناں، پہلے ہی دفتر میں سر کھپا کر آ رہے ہو۔

خود کو ہی جھڑک کر کھانے پر آمادہ ہوئے وہ منہ ہاتھ دھونے واش بیسن کے آگے جا کھڑے ہوئے۔

''یہ فیصل اور رامش کدھر ہیں؟''

اریبہ کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے کر چارپائی پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے اپنے چھوٹے دونوں بیٹوں کے بارے میں استفسار کیا۔

''جہاں انہیں اس وقت ہونا چاہیے۔''

کھانا ان کے آگے لا کر خنسا نے تلخی سے جواب دیا۔

''پوری گلی بکروں اور گائیوں سے بھری پڑی ہے اور میرے بچے ان کے پیچھے دیوانے ہوئے جا رہے ہیں اب عید تک انہیں یونہی کھانا پینا سونا بھولا رہے گا۔''

''اس بار ہاتھ ہی کچھ ایسا تنگ رہا ہے کہ بچت تو ہو ہی نہیں پائی، چاہ کر بھی میری قربانی کی استطاعت نہ بن سکی۔ مگر بچوں سے وعدہ ہے کہ آئندہ برس میں لازماً انہیں بکرا لے کر دوں گا۔''

''میں ذرا ان لڑکوں کو تو دیکھوں رات ہونے کو ہے۔''

شوہر کی بات پر ان شاء اللہ کہہ کر خنسا بھی بچوں کو بلانے چل دی تھیں۔

''اے فیصل اور رامش دونوں ادھر تو آنا۔''

بچے گھر آ کر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے جب مینا تائی نے اچانک دیوار کے پیچھے سے منہ نکال کر انہیں صدا لگائی تو بچے ان کی ایک پکار پر ہی کھانا چھوڑ کر ان کی جانب لپکے۔

''یہ لو پچاس روپے اور چوک سے جا کر بکرے کا چارہ تو لے آؤ رومی اور صائم دونوں ہی گھر پر نہیں ہیں۔''

''جی اچھا بڑی امی!'' پیسے لے کر بچے تائی کے حکم کی تابعداری میں بھاگ نکلے۔

''دن دیکھیں گی نہ رات اب بقر عید تک بچوں کو یونہی دوڑائے رکھیں گی...... او نیک بختو کھانا تو ختم کرتے جاؤ۔''

خنسا نے بچوں کو روکنا چاہا مگر وہ اتنی دیر میں باہر کا دروازہ بھی پار کر گئے تھے تو وہ بھی برتن سمیٹنے کو اٹھ کھڑی ہوئیں۔ جانتی تھیں کہ بچے اب بکرے کو چارہ کھلا کر ہی گھر آئیں گے۔

☆☆☆

''آج دفتر میں میری رفیق سے بات ہوئی بتا رہا تھا کہ ہاتھ تنگ ہونے کی وجہ سے اس بار قربانی نہیں کر پائے گا۔ تم ان کی طرف گوشت زیادہ بھجوا دینا۔''

تایا ابو، تائی مینا کو بتا رہے تھے۔

''آپ کو بڑا درد ہوتا ہے اپنے بھائی کا جس کی بیوی ڈھنگ سے مجھے بکرے کی مبارکباد تو دے نہ سکی۔ الٹا اس کی ہمارا بکرا دیکھ کر رنگت ہی پیلی پڑ گئی تھی۔''

وہ تو فوراً ہی لال بھبھوکا ہو کر شکایتوں کا دفتر کھول بیٹھیں۔

خنسا اور مینا اور دونوں کی شاذ ہی آپس میں بنتی تھی۔ ہر دم ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار ہی رہتیں۔

''اوہو مینا! کبھی تو محاذ جنگ سے باہر نکل آیا کرو، اماں تم دونوں کے بارے میں ٹھیک ہی کہا کرتی تھیں کہ روز قیامت بھی ایک دوسرے سے کمر کر کے ہی اٹھو گی...... آج تک میری سنی ہے تم نے جو کہ اب مانو گی...... کرو جی بھر کے اپنی من مانی۔''

ان کے شکوؤں سے بیزار ہو کر تایا ابو نے بھی وہاں سے اٹھنے میں ہی عافیت جانی تھی۔

☆☆☆

عید کی نماز پڑھ کر گھر آئے رفیق الحسن نے فوراً ہی کرتا شلوار اتار کے نیکر اور بنیان چڑھا لی اور صحن میں بیٹھ کر چھریاں تیز کرنے لگے۔

"یہ اس وقت کیا سوجھی آپ کو رفیق صاحب عید کا دن ہے کوئی بھی ملنے آسکتا ہے۔"

آئینے کے آگے کھڑی آنکھوں میں کاجل لگاتی خنسا اپنی تیاریوں کو حتمی شکل دے رہی تھیں۔

"کہیں آپ کو بھی موسمی قصائی بننے کا شوق تو نہیں چڑھا۔ جو انہیں تیز کرنے لگے، ہاں مرغی تو آپ ذبح کر ہی لیتے ہیں پھر بکرا بھی کاٹ ہی لیں گے۔"

ان پر طنزیہ فقرے اچھالتی وہ ہنسیں۔

"نہیں خنسا سمجھا بھی کرو دراصل باہر کئی گھروں میں قربانی شروع بھی ہوگئی اور میں دیکھ کر آرہا ہوں بھائی صاحب کے بکرے کی تو کھال بھی اتر چکی ہے گوشت بس ابھی آیا کہ آیا...... اب اگر یہ چھریاں تیز ہوں گی تو ہاتھ کے ہاتھ گوشت بھی صاف کرتا جاؤں گا۔ تم بس جلدی سے مجھے اچھا سا گوشت بھون دینا۔"

"پتا نہیں کس خوش فہمی میں بیٹھے ہیں آپ جیسے اپنی بھابھی صاحبہ کو جانتے نہ ہوں...... اگر ایک بھی ڈھنگ کی بوٹی اس نے بھیج دی تو مان جاؤں گی اپنی جیٹھانی کو۔"

خنسا کا اچھا خاصا موڈ ناگواری میں بدل گیا تھا۔

ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ صائم ایک کپڑے سے ڈھکی پلیٹ اٹھائے اندر چلا آیا اور خنسا چچی کو تھما کر انہیں قدموں لوٹ گیا۔

"ہائے یہ کیا بھجوادیا ہمیں...... میں نہ کہتی رفیق الحسن۔"

پلیٹ پر سے کپڑا ہٹاتے ہی خنسا بیگم تڑپ کر گویا بیٹھے بیٹھے گھوم گئیں۔

"میرے اللہ......" ماتھا پیٹ کر انہوں نے دہائی دی۔

"امی جی کیا ہوا؟"

ماں کی آواز سن کر اریبہ بھی گھبرا کر باہر آگئی۔ گوشت کی پلیٹ پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے پر مایوسی دوڑ گئی۔

"چربی، چھیچھڑوں اور ہڈیوں کے درمیان کہیں کہیں رکھی ننھی ننھی بوٹیوں پر مشتمل ایک پلیٹ۔

"آؤ تم بھی دیکھ لو تمہارے تایا کے گھر سے کیسا گوشت آیا ہے۔"

خنسا کی آواز پورے صحن میں گونجی، غالباً وہ دیوار کے اس پار مکینوں سنانا چاہ رہی تھیں۔

"رفیق صاحب یہ دیکھیے اپنی بھاوج کا کمال۔" ایک چھیچھڑا نما بوٹی لہرا کر انہوں نے شوہر کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

"کوئی جیٹھانی صاحبہ کو جا کر بتائے کہ یہاں بلیاں کتے نہیں جیتے جاگتے انسان بستے ہیں۔"

"اب ایک بکرے میں سے نکلتا ہی کیا ہے جو حصے میں آیا بھابھی جی نے بھجوادیا۔"

ٹوکے اور چھری کو باہم رگڑتے رفیق الحسن نے پلیٹ پر نظر مارے بنا ہی جواب دیا ہمیشہ کی طرح اس بار بھی وہ بڑی بھابھی جی کا دفاع کرنا نہ بھولے تھے۔

"نہیں ہمارے حصے میں یہی کچھ آنا تھا تو بے شک یہ بھی نہ بھجواتیں۔"

خنسا کو غصہ آگیا۔

"ہائے میرا دل ڈوبا جارہا ہے اسے یہاں سے لے جاؤ اریبہ۔"

خنسا نے فوراً ہی وہ پلیٹ اریبہ کو پکڑائی تو اس نے بھی یہ سب کچھ ایک لفافے میں ڈال کر فریج میں رکھ دیا۔ اس کا بھی موڈ خراب ہوگیا تھا۔

"بکرا نہلانے کھلانے کو تو میرے بچے جنہوں نے صبح دیکھی نہ رات بس خدمت میں لگے

رہے اور قورمہ پلاؤ اڑائیں گے خود تو بہ توبہ کیا زمانہ آگیا کہ اب قربانی میں رشتہ داروں کا حصہ بھی غائب ہونے لگا۔ آپ دیکھ لیجیے گا بینا اگلی عید تک یہی گوشت چلائے گی جیسے میں جانتی نہیں اسے۔"

"تو کیا آپ کو پوری ران بھجوادیتیں۔"

بیوی کی جلی کٹی سن سن کر بالآخر رفیق صاحب بھی غصہ آگیا۔

"ران اور بھابھی صاحبہ ہمیں دیں یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ...... خدانخواستہ انہیں کچھ ہو نہ جاتا۔"

طنزیہ مسکراہٹ خنسا کے چہرے پر عیاں تھی۔

"شیر کا جگرا چاہیے ہمیں ران بھجوانے کو جو کم ازکم میری جیٹھانی کے پاس نہیں...... اب چھوڑیں انہیں بھی گھسنا...... کچھ فائدہ نہیں ان کو تیز کرنے کا۔ جب اپنوں کے دلوں پر زنگ لگ جائے تو پھر غیروں سے امید کیسی۔ اٹھیں اور مجھے اماں سے عید ملوا کر لائیں...... راہ تک رہی ہوں گی میری۔"

خنسا کا موڈ خاصا خراب ہو چکا تھا اس لیے رفیق الحسن بھی چھریاں وہیں پٹخ کر کپڑے بدلنے کو اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ان عورتوں کی لڑائی میں نقصان ہمیشہ ہم دونوں بھائیوں کا ہی ہوا ہے۔"

"یہ چچا اور چچی کہاں جارہے ہیں؟"

"ارمان جو باہر کہیں سے آرہا تھا انہیں موٹر بائیک پر جاتا دیکھ کر اندر چلا آیا۔

"نانی کی طرف عید ملنے۔"

رکھائی سے اسے مختصر سا جواب دے کر اریبہ پھر سے برتنوں کی دھلائی میں لگ گئی۔

"مت پوچھو یار کیا حال ہوا ہے میرا...... گھر سے تو امی نے ہانی باجی کے گھر گوشت دینے بھیجا تھا ادھر گیا تو گائے ذبح ہو چکی تھی وہاں اور گوشت بن رہا تھا دولہا بھائی نے مجھے بھی چھری تھما کر ساتھ بوٹیاں چھوٹی کرنے کو بٹھالیا۔ بڑی مشکل سے جان چھڑا کر آرہا ہوں صرف اور صرف تمہارے لیے اور تم ہو کہ ابھی تک یونہی پھر رہی ہو۔ عید کی کچھ تیاری نہیں۔"

اسے ابھی تک ملگجے کپڑوں گھر کے کاموں میں جتے دیکھ کر وہ مایوسی سے بولا۔

"بکرا ذبح ہو گیا تمہارا۔"

اس کی بات سنی ان سنی کرتی اریبہ کے پوچھنے کا انداز خفگی سے بھرا تھا۔

"وہ تو کب کا بٹ بھی چکا...... امی نے تمہارے گھر بھی تو بھیجا تھا۔"

رومی کو تعجب ہوا۔

"اچھا تو تم ان چھیچھڑوں کو گوشت سمجھ رہے ہو۔"

وہ فریج کی جانب مڑی اور وہی لفافہ نکال لائی۔

"تم خود آخر کہاں تھے جب تائی امی یہ سب بھجوارہی تھیں۔"

اور اس میں سے چربی چھیچھڑے نکال کر اسے دکھانے لگی۔

"کم ازکم ڈھنگ کی چار بوٹیاں ہی ڈلوادیتے، اتنا دل تھا آج میرا مٹن پلاؤ بنانے کا۔"

وہ غصے اور دکھ کی ملی جلی کیفیت سے دوچار تھی۔

"ابو تو میری نانو کے لیے بھی صاف ستھرا گوشت لاکر دیتے ہیں۔"

جبکہ ارمان سامنے کھڑا اس کے خوب صورت چہرے پر جمی نگاہوں کو خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ فوری طور پر اس سے کچھ جواب نہ بن پڑا تو شرمسار سا چپ چاپ وہاں سے چلا آیا۔

گھر پہنچا تو امی بھی زبیر ماموں کی طرف جانے کو تیار کھڑی تھیں۔

"امی آپ نے رفیق چچا کے ہاں گوشت تو بھجوادیا تھا ناں۔"

"بالکل بھیج دیا ہے۔"

مینا نے بے نیازی سے جواب دیا اپنے کیے پر انہیں ذرا بھی ندامت نہ تھی۔

"امی آپ کو پتا ہے ناں کہ رفیق چچا نے قربانی نہیں کی آپ تھوڑا اور گوشت دے دیں میں دے آتا ہوں انہیں۔"

"اچھا، مگر کس خوشی میں۔"

کمر پر ہاتھ رکھ کر ناگواری سے انہوں نے رومی کو دیکھا۔

"تمہارے ابا کم تھے کیا جو تم بھی ان لوگوں کے حمایتی بن کر چلے آئے۔ ہم نے بکرا ذبح کیا ہے اونٹ نہیں جو پورے محلے میں بانٹ کر بھی وہیں کا وہیں رہے...... اب جتنا حصے آیا میں نے بھجوا دیا۔"

"افسوس مگر کچھ لوگوں کے حصے میں صرف چھیچھڑے چربی ہی آئے ہیں۔"

وہ زیر لب بڑبڑایا۔

"لیکن امی......" ارمان نے کچھ کہنا چاہا مگر وہ اس سے پہلے ہی بول اٹھیں۔

"میں نے اریبہ سے تمہارے رشتے کی ہامی بھری ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں خنسا کے ساتھ بول چال اور لینا دینا بھی اچھا رکھوں گی سمجھے تم...... میں زبیر بھائی کے ہاں گوشت دینے جارہی ہوں، گھنٹے ڈیڑھ میں آجاؤں گی۔ تم اتنی دیر تک گھر پر ہی رہنا پیچھے محلے میں سے کوئی گوشت دینے بھی آسکتا ہے۔"

"امی میری بات تو سنیں......" ارمان نے انہیں روکا۔

مگر وہ اسے نظر انداز کرتیں گوشت کا لفافہ اٹھائے باہر نکل گئیں۔

"یوں کرتا ہوں کہ فریج میں سے گوشت کا ایک پیکٹ نکال کر اریبہ کو دے آتا ہوں...... ایسی بھی کیا بات ہے کون سا امی کو پتا چلے گا۔"

وہ فوراً فریج کی جانب بڑھا اور پھر ماں کی ہوشیاری کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ کیونکہ وہ جاتے جاتے فریج بھی لاک کر گئی تھیں۔ شاید انہیں اپنے فرزند ارجمند سے ایسی ہی ہمدردی کی امید تھی۔

"امی......" وہ دانت پیس کے رہ گیا۔ اور اندر کمرے میں جا کر لیٹ گیا کچھ دیر کے لیے اسے اونگھ آگئی۔ اس کی آنکھ باہر کا دروازہ بجنے سے ہی کھلی تھی۔ باہر جا کر دیکھا تو سامنے محلے کا ایک بچہ گوشت کی پلیٹ اٹھائے کھڑا تھا۔ پلیٹ خالی کر کے اسے دے کر وہ پلٹا تو ایک بار پھر اطلاعی گھنٹی بج اٹھی۔

"لگتا ہے امی آگئیں......" اس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا تو سامنے اس کا دوست صماد گوشت کا ایک بڑا سا تھیلا اٹھائے کھڑا تھا۔

"آ و یار اندر۔"

اس سے مصافحہ کر کے پیچھے ہٹتے ہوئے ارمان نے صماد کو اندر آنے کی دعوت دی۔

"نہیں یار ابھی جلدی میں ہوں پھر ملتے ہیں کسی دن...... میں نے اپنی کمائی سے بکرا خریدا تھا پھر ران کا حق بھی تو میرے جگری یار کا ہی بنتا ہے۔"

تھیلا اسے پکڑا کر وہ چل دیا۔

ارمان دروازہ بند کر کے پلٹا تو ساتھ ہی اریبہ کا اداس چہرہ اس کی نظروں میں گھوم گیا۔ فوراً ہی ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے اس کے ذہن میں کوندا۔

"ہوسکتا ہے کہ یہ ران امی اور خنسا چچی کے درمیان برسوں سے قائم عداوت کی دیوار کو گرادے۔ یہ سوچ کر اس نے دروازے کے اوٹ سے دائیں بائیں گلی میں دیکھا اور دل ہی دل میں صماد کو دعائیں دیتا ران کا تھیلا لے کر رفیق چچا کے گھر گھس گیا۔

تیری دید ہی میری عید ہے

افشاں آفریدی

طوبیٰ کا موڈ ہنوز خراب تھا۔ ارقم ناشتے کی ٹیبل پر آیا تو اسے برہمی سے برتن پٹختے دیکھا، جس کے چہرے پر غصہ، سرخی لانے کا سبب بنا تھا اور یہ غصہ ارقم کا لایا ہوا تھا۔ دو دن سے یہی حال تھا اس کا۔ طوبیٰ حسن روٹھ کر جلدی مان جائے ایسا پہلے کبھی ہوا تھا جواب ہوتا۔

ارقم نے گہری سانس بھر کر اسے بغور دیکھا اور پھر حسب سابق خاموشی سے چائے کا کپ اٹھا کر ڈائننگ روم سے نکل گیا۔ اس کی یہ خاموشی ہی طوبیٰ کو بری طرح کھلتی تھی۔ سامنے والا اپنا کلیجہ جلا کر راکھ بھی کر دے پر ارقم کی گہری چپ نہیں ٹوٹتی تھی۔

''ارے ہے طوبیٰ! ارقم چلا گیا کیا؟'' اماں بیگم ناشتے کے لیے میز پر آئیں تو بیٹے کو نہ پا کر اس سے استفسار کیا۔ وہ کلس کر رہ گئی۔

''جی چلے گئے ہیں۔'' اس نے ایک عالم بے زاری میں جواب دیا تھا۔

''ارے ناشتہ کیے بغیر چلا گیا میرا بچہ، تم نے روکا بھی نہیں!'' اماں بیگم نے ارقم کی مخصوص نشست کے آگے رکھی پلیٹ میں آملیٹ کو جوں کا توں دیکھا تو تڑپ ہی گئیں۔

''آپ تو ایسے کہہ رہی ہیں جیسے میرے روکنے سے وہ رک ہی جاتے۔ ناشتہ بنا کر ٹیبل پر رکھ دیا ہے اب کیا میں منتیں کروں ان کی۔'' اس کا پارہ ویسے ہی چڑھا ہوا تھا۔ خفگی سے جواب دیا۔

''ارے لڑکی! وہ شوہر ہے تمہارا۔ بیویاں اپنے شوہروں کے لیے کیا نہیں کرتیں۔ ناشتہ بنا کر تو ملازمہ بھی دے سکتی ہے۔ مگر بیوی محبت سے کھلاتی ہے۔ یہی تو فرق ہوتا ہے بیوی اور ملازمہ میں۔'' اماں بیگم شروع ہو گئی تھیں۔

''ہونہہ!۔ ملازمہ۔ اس گھر میں تو میں ہی ملازمہ ہوں۔ بلکہ اس سے بھی گئی گزری۔ ملازمہ کو کم از کم تنخواہ تو ملتی ہے جبکہ میں، سارا سارا دن مفت کی چاکری کرتی ہوں اور بدلے میں مجھے کیا ملتا ہے۔ نہ تعریف نہ توصیف۔ بس نصیحتیں ہی نصیحتیں ہیں میرے لیے۔ کوئی فرمائش کر دوں تو پورا گھر میرے خلاف کھڑا ہو جاتا ہے۔'' اماں بیگم کے سامنے دلیے کا باؤل رکھتے ہوئے وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی تھی۔

''ارے رات دن محنت کرتا ہے میرا بچہ۔ تب کہیں جا کر سب کی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ مگر اس کی فکر کسے ہے۔ بیوی صاحبہ گھڑی گھڑی روٹھتی رہتی ہیں۔ پھر چاہے شوہر خالی پیٹ ہی گھر سے نکل جائے۔'' دلیے کا پیالہ دھکیل کر اماں بیگم بھی، بیٹے کی طرح ہی خالی پیٹ اٹھنے لگیں تو وہ زچ ہو گئی۔

اسے لگتا تھا کہ دونوں ماں بیٹے اسے بلیک میل کرنے کے لیے کھانا چھوڑ دیتے تھے۔

''پلیز اماں بیگم! آپ ناشتہ کریں نہیں تو شوگر ڈاؤن ہو جائے گی آپ کی۔ پھر ارقم مجھ سے خفا ہوں گے۔'' اس نے ناراضی سے کہا۔

''ہاں بس تم دونوں یہی کرتے رہنا۔ آج تم ناراض ہو کل وہ خفا ہو جائے گا۔ ارے میں کہتی ہوں ان بچیوں کا بھی کچھ سوچا ہے کیا اثر لے رہی ہیں یہ



معصوم، اماں باوا کے جھگڑوں سے۔'' اماں بیگم نے سامنے کرسیوں پر بیٹھی پانچ سالہ یسریٰ اور چار سالہ حمنیٰ کی طرف اشارہ کیا جن کو وہ بوائل انڈا کھلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''تو آپ مجھے بتایئے اماں بیگم، میں کیا کروں؟ پچھلی باتوں کو چھوڑیں۔ ابھی کا بتایئے۔ کیا سارا قصور میرا ہے۔ کیا میں نے وعدہ خلافی کی ہے۔ ہر بار ارقم ایسا ہی کرتے ہیں۔ آپ گواہ ہیں کہ وہ مجھے ناراض کرتے ہیں۔'' اس نے کانٹا پلیٹ میں رکھ کر رخ مکمل طور پر اماں کی طرف موڑ لیا تھا۔

''ارے بیٹا! تو وہ کون سا اپنے شوق سے انکار کر رہا ہے۔ تم بھی تو اس کی مجبوری کو سمجھو۔ پرائیویٹ کمپنیوں میں ایڈوانس تنخواہ اتنے آرام سے نہیں ملتی۔ رہ گئی ناراض ہونے کی بات تو تمھیں بھی تو بات بے بات روٹھنے کی عادت ہے۔'' اماں بیگم ارقم کی حمایت نہ کرتیں یہ اس صدی میں تو ممکن نہیں تھا۔

''ایک ہمارا زمانہ تھا۔ تمھارے سسر مرحوم نے مجال ہے کبھی روٹھنے منانے کے سلسلے کو رواج دیا ہو۔ ارے روٹھنا تو دور کی بات، ہماری تو کبھی منانے کی بھی ہمت نہیں ہوئی۔ یہ نئے چونچلے بھی بس تمھاری ہی نسل کے ہیں۔'' اماں بیگم ہمیشہ کی طرح صاف صاف سنا گئی تھیں۔

جواباً وہ منہ پھلا کر کچن کی طرف چل دی تھی۔ یہ اماں بیگم سے خفگی کا اظہار تھا۔

''حد ہوگئی ہے آج کل کی لڑکیوں نے تو شوہروں کو گویا جوتے میں پہن رکھا ہے۔'' دلیے کا باؤل اپنی جانب سرکاتے ہوئے انہوں نے اونچی آواز میں اسے سنایا تو وہ دل ہی دل میں تلملا کر رہ گئی۔ البتہ پھر کچن سے باہر نہیں آئی۔ پتا تھا کہ دونوں بچیوں کو اماں ناشتہ کرا دیں گی اس لیے تیوریاں چڑھائے کچن کا کام سمیٹتی رہی۔

رات کو نبا کھانے پر آئی ہوئی تھی اس کے جانے کے بعد وہ اتنا تھک گئی تھی کہ کچن سمیٹے بغیر جا کر سو گئی لہٰذا صبح کافی کام نبٹانے تھے۔ چیزیں کچھ ٹھکانے پر لگیں تو وہ کچن سے باہر نکلی۔ دونوں بچیوں کو اسکول لانے لے جانے کی ذمہ داری اس کی تھی۔ ارقم کے لیے جاب کے ساتھ یہ سب کام کرنا ممکن نہیں تھا۔ بچیوں کو اسکول پہنچا کر وہ گروسری اسٹور پہنچی تو گرمی سے برا حال تھا۔ اس پر قیمتوں میں ہوشربا اضافے نے اس کا مزاج مزید تیکھا کر دیا۔

''توبہ ہے! اب کیا انسان کھانا کھانا بھی چھوڑ دے۔'' ایک ہفتے کے راشن میں ہی سات ہزار خرچ ہوگئے تھے۔ اسے یک دم احساس ہوا کہ نجانے ارقم کس طرح سارے اخراجات پورے کر رہا ہے۔

مہنگائی نے تو واقعی کمر توڑ رکھی ہے۔ اس پر اس کی فرمائشیں، بچیوں کی ضروریات۔ اسکول کی فیسیں۔ یوٹیلٹی بلز اور اماں بیگم کی دواؤں کا خرچہ۔ شکر ہے مکان اپنا تھا کرائے کا مسئلہ نہیں تھا۔ گاڑی بھی تھی مگر پیٹرول کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کے باعث اس کا استعمال بھی ارقم ضرورتاً ہی کرتا تھا۔ آفس اور چھوٹے موٹے کام کے لیے بائیک ہی استعمال ہوتی۔

اس کی جاب اچھی تھی۔ تنخواہ کے ساتھ میڈیکل الاؤنس بھی تھا مگر پچھلے سال ہونے والی نبا کی شادی کے لیے ڈالی گئی کمیٹیاں ابھی تک پوری نہیں ہوئی تھیں۔ ہر ماہ ایک بڑی رقم کمیٹیوں کی نذر ہو جاتی۔ اماں بیگم نے بیٹی کو رخصت کرتے ہوئے استطاعت سے زیادہ جہیز دیا تھا۔ نبا بھی بھائی اور ماں کی لاڈلی تھی، جیبیں خالی کرا کر ہی نکلی تھی گھر سے بلکہ کمیٹی کی شکل میں قرض ابھی تک واجب الادا تھا۔ جس کی ادائیگی کے لیے طوبیٰ کو اپنا دل مارنا پڑ رہا تھا۔ اور یہی وجہ تھی اس کی ناراضی کی۔

☆☆☆

''تو پھر کیا طے ہوا۔ ارقم بھائی نے ہامی بھر لی

تمہیں مطلوبہ رقم دینے کی؟" اقصیٰ نے چائے کا کپ اس کے سامنے لا کر رکھتے ہوئے اس کی دکھتی رگ کو چھیڑ دیا۔

"دے ہی نہ دیں تمہارے ارقم بھائی مجھے پیسے۔ اتنی بھاری رقم نہیں ان کے پاس مجھے دینے کے لیے۔ ان کے تو صرف نام میں ہی "رقم" کا لفظ ہے باقی جیب خالی ہے ان کی۔" وہ تو یوں بھی بھری بیٹھی تھی۔ آج صبح ہی اماں بیگم کی باتوں نے ٹھیک ٹھاک دل جلا دیا تھا اس کا۔ اس پر ارقم کا یوں بنا ناشتہ کیے گھر سے چلے جانا اسے مزید بے زار کر گیا تھا۔ اس لیے اس کے گھر واپس آنے سے پہلے ہی وہ بچیوں کو لے کر امی کے طرف آ گئی تھی۔

بات ہی اس نے ایسی کہی تھی کہ اقصیٰ کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ جسے اس نے بدقت چھپایا۔

"کیوں اب کیا ہوا۔ پچھلے مہینے انہوں خود ہی تو ہاں کہی تھی۔"

"ہاں مگر اب اچانک۔ اماں بیگم کی بھتیجی کی

وہ کسی نتیجے پر پہنچتے ہوئے سخت لہجے میں بولیں، تو جواباً اس نے تیغ صفت نظروں سے اقصیٰ کی طرف دیکھا۔

"اسے کیا دیکھ رہی ہو میری طرف دیکھو طوبیٰ! اور جواب دو میری بات کا۔" امی کا جلال جاگ اٹھا تھا۔ اقصیٰ نے ماحول کو سنگین دیکھا تو مسکراہٹ دباتی بچیوں کو لے کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ جبکہ وہ منہ پھلائے کھڑی سوچ رہی تھی کہ اب امی کو کیا جواب دے۔

☆☆☆

"اپنی اماں کے گھر چلی گئی ہیں تمہاری توبہ بیگم۔" ارقم گھر آیا تو گھر میں گونجتی خاموشی نے استقبال کیا۔ پوچھنے پر اماں بیگم سے متوقع خبر سننے کو ملی۔ طوبیٰ سے خفگی کی صورت میں اماں بیگم اسے توبہ ہی کہہ کر پکارا کرتی تھیں۔ ارقم نے نظر جھکا کر گہری سانس بھری۔

"وہ بے وقوف اور جذباتی ہے اماں بیگم!"

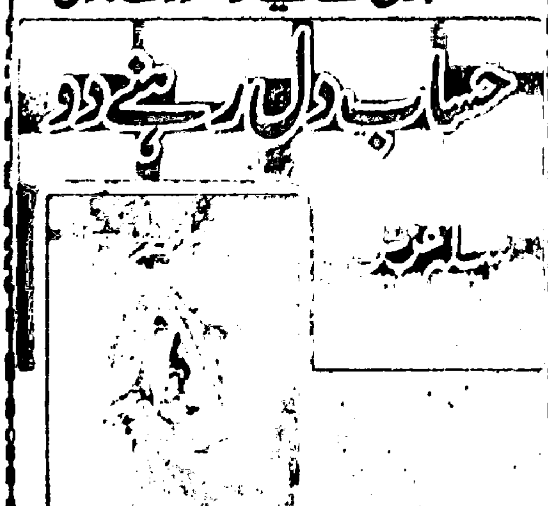
"ہاں بیٹا! بے وقوفی کی بھی تم نے خوب کہی۔ چھ سال ہو گئے ہیں تمہاری شادی کو، بیس برس کی تھی جب میں اسے بیاہ کر لائی تھی، اب چھبیس سال کی شادی شدہ عورت ہے وہ۔ عقل کیا بیٹیاں بیاہنے کے بعد سمدھیانے سے تحفے میں ملے گی اسے۔" اماں بیگم بیٹے کی بات پر بری طرح چڑ گئی تھیں۔

ارقم کے پاس ماں کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اگر ہوتا بھی تو وہ باعث ادب کچھ نہیں کہتا۔

"آپ نے کھانا کھایا؟" گہری سانس بھر کر ارقم نے اماں سے پوچھا تھا۔

"نہیں۔ تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ تم جا کر پہلے بیوی بچوں کو لے آؤ۔ پھر ساتھ ہی کھائیں گے۔ کیونکہ اس نے بھی صبح سے کچھ نہیں کھایا ہے، تمہیں تو معلوم ہے اس کا، ناراضی میں صرف غصہ ہی کھاتی ہیں توبہ بیگم۔" اماں بیگم کو خفگی میں بھی اس کا خیال تھا۔ وہ دل کی بری نہیں تھیں۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول



منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی
فون نمبر: 32735021

"آپ کیوں کہتی ہیں اُسے ایسا۔" ارقم نے مبہم مسکراہٹ سمیت ماں کی طرف دیکھا تھا۔

"اس کی بچکانہ حرکتوں پر سارا دن توبہ ہی کرتی ہوں اس لیے منہ سے نکل جاتا ہے۔" اماں بیگم کے لبوں پر بیٹے کے استفسار پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ جس پر وہ ماں کو نرم نظروں سے دیکھتا اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ تھا اس کی نظروں میں، اماں بیگم نادم سی ہوگئیں۔

"اچھا اچھا! اب ماں کو شرمندہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ جاؤ جا کر لے کر آؤ اس بے وقوف کو۔ وہ گھر پر نہیں ہوتی تو سناٹا کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے مجھے۔ میں اتنی دیر میں کھانا گرم کرتی ہوں۔ کوفتے اور بگھارے چاول بنا کر گئی ہے طوبیٰ، ساتھ میں روٹی بھی ہے۔" اماں بیگم قصہ کوتاہ کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں تو وہ دل ہی دل میں مسکراتا گھر سے باہر کی طرف چل دیا۔

باوجود شدید ناراضی کے طوبیٰ اس کا پسندیدہ کھانا پکا کر گئی تھی۔ ارقم کا صبح کا ناشتہ نہ کرنا ایسے ہی اسے فکرمند کر دیتا تھا۔ دو گلیاں چھوڑ کر طوبیٰ کی امی کا گھر تھا۔ راستہ پیدل کا تھا مگر وہ بائیک کے بجائے گاڑی لے کر وہاں پہنچا۔

☆☆☆

"حد کرتی ہو تم بھی طوبیٰ! یہ کوئی وجہ ہے میاں سے ناراض ہونے کی۔ تم بیوی ہو ارقم کی۔ تمہیں اس کے مسائل سمجھ کر اس کا ساتھ دینا چاہیے بیٹا۔" اس سے ساری بات جان کر امی کا غصہ کچھ اور بڑھا تھا

"بس آپ بھی مجھے ہی غلط کہیں۔ ایسا بھی کیا قصور کر دیا میں نے، صرف تیس چالیس ہزار روپے ہی تو مانگے ہیں۔ صبوحی کی بیٹی ہوئی ہے۔ آپ کو یاد ہے اس نے میری دونوں بیٹیوں کی پیدائش کے موقع پر مجھے اور ارقم کو برانڈڈ سوٹ اور بچیوں کو کیش دیا تھا۔ اتنے سالوں بعد اللہ نے اسے اولاد کی نعمت سے نوازا ہے۔ مجھے بھی تو پلٹاوا کرنا ہے۔ میں نے شادی طے ہوگئی ہے۔ بقرعید کے تیسرے دن رخصتی ہے اس کی۔ دو دن پہلے مٹھائی آئی ہے ان کے گھر سے اور تمہیں تو پتا ہے کہ خاندان کی کسی بھی بچی کی شادی ہو جہیز کے لیے کنگ سائز فریج، ہماری طرف سے ہی جاتا ہے۔" اس نے اصل بات بتائی تو انھوں نے بھنویں اچکا کر اسے دیکھا۔

"اوہ۔۔ ویسے یہ فریج دینے کی کیا روایت نکالی ہے تمہاری ساس نے! دینا ہی ہے تو واشنگ یا سوئینگ مشین دے دیں، جو نسبتاً کم قیمت ہو اور تمہارے بجٹ میں بھی سما سکے۔"

"کیا کریں یہ ان کے خاندان کی رسم ہے۔ بیٹی کی شادی ہو تو خاندان میں سب مل کر گھر کا سامان دیتے ہیں۔ نبا کے لیے بھی ارقم کے دونوں ماموؤں نے جہیز کے بڑے بڑے آئٹمز دیے تھے، جبکہ چچا اور تایا اب ان کے حیات نہیں اور ان کا کوئی بیٹا بھی نہیں ہے، اس لیے ان کے گھر سے ایسا کوئی تحفہ نہیں آسکا تاہم ان کی ہر بیٹی کے لیے اماں بیگم اپنا حصہ بھیجنا نہیں بھولتیں۔" اس نے سنجیدگی سے تفصیل بتائی۔ لہجے میں اماں بیگم کے لیے ستائش تھی۔

"رہ گئی فریج کی بات، تو اماں بیگم کی سوچ کے مطابق چونکہ کھانا کھلانا اور پانی پلانا، بڑے ثواب کا کام ہے لہٰذا فریج کے ذریعے اس کھانے کو بچانے کا انتظام کرنا اور لوگوں تک ٹھنڈا پانی پہنچانا بھی ایک اچھا فعل ہے۔ اس لیے ان کی طرف سے یہی تحفہ جائے گا۔"

"اور ارقم بھائی! وہ کیا کہتے ہیں اس بارے میں۔ اس سال میں یہ دوسری شادی ہے ان کی کزن کی، اچھا خاصا بوجھ پڑ گیا ہوگا ان پر بھی۔"

"انہوں نے کیا کہنا ہے۔ اگلا بندہ چاہے خون تھوک تھوک کر مر جائے ان کی خاموشی نہیں ٹوٹتی۔ نہ وہ اپنی اماں بیگم کو کسی بات کے لیے انکار کرتے ہیں نہ میری ناراضی کا کوئی جواب دیتے ہیں۔ اب بھلے جہاں سے بھی انتظام کرنا ہو وہ

کریں گے۔" ارقم کے نام پر ایک بار پھر اس کا موڈ آف ہو گیا تھا۔

"ویسے یہ بہت بڑی بات ہے طوبیٰ! ارقم بھائی بہت اچھے انسان ہیں۔ تمہاری بھلی بری بھی سہتے ہیں اور اپنی اماں بیگم کے فرمان بھی بجا لاتے ہیں۔ مجھے ان سے ہمدردی ہے۔" اسے شرارت سے دیکھتے ہوئے اقصیٰ نے کہا تو اس نے تیکھی نظروں سے گھورا۔

"تم اپنی چونچ بند ہی رکھو سمجھیں! نہیں تو وہ حشر کروں گی کہ لوگوں کو تم سے ہمدردی ہونے لگے گی۔"

پاس پڑا کشن اٹھا کر نشانہ لگاتے ہوئے اس نے غضبناکی سے کہا تو اقصیٰ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے طوبیٰ! بھابھی ہے اب یہ تمہاری۔ ایسے مذاق کرنا زیب دیتا ہے تمہیں اب؟" حسب سابق امی کی اسی وقت انٹری ہونا تھی، جب وہ جارحانہ عزائم سمیت اقصیٰ کی طرف لپکی تھی۔

امی کے ساتھ یسریٰ اور حمنیٰ بھی تھیں، جو ماں کو مامی کی طرف لپکتا دیکھ کر مسکرانے لگی تھیں۔

"افوہ امی! بھابھی یہ بعد میں بنی ہے۔ میری دوست تو یہ بچپن سے تھی۔" اس نے امی کی گود سے چھوٹی بیٹی کو لیتے ہوئے نروٹھے پن سے کہا تو وہ اسے تنبیہی نظروں سے دیکھنے لگیں۔

"رہنے دیں آنٹی! یہ نہیں سدھرے گی۔ جنگلی بلی ہے یہ پوری۔ آس پاس کے لوگوں کو زخمی کرنا کام ہے اس کا۔ اللہ اس کے اہل محلہ کی حفاظت فرمائے۔ آمین۔" اقصیٰ نے ہنس کر اس کی بڑی بیٹی یسریٰ کو گود میں بٹھاتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا تو امی نے مشکوک نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا مطلب، آج کس کو زخمی کیا ہے تم نے۔ کیا آج پھر ناراض ہو کر آئی ہو ارقم میاں سے۔" اس کے چہرے کے تاثرات اور اقصیٰ کی آنکھوں سے جھلکتی شوخی نے امی کو مشکوک کر دیا تھا۔ یک دم

پچھلے مہینے ہی ارقم کو بتا دیا تھا کہ رقم کا بندوبست کر لیں۔ مگر اب وہ انکاری ہیں۔"

"ہر انسان کی مالی حیثیت دوسرے سے الگ ہوتی ہے طوبیٰ! تمہیں اتنے امیر لوگوں سے تعلقات رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اقصیٰ کی بھی تو کلاس فیلو تھی وہ۔ اس نے تو شادی کے بعد ملنا جلنا نہیں رکھا۔ تمہیں بھی اپنی حیثیت کے لوگوں سے رابطہ رکھنا چاہیے۔" امی اس کی بات سن کر الٹا اس پر ہی بگڑیں۔

"یہ خوب کہی آپ نے! دراصل صبوحی نہیں اس کا شوہر ہے امیر، وہ بھی دل کا امیر۔ بیوی کو کھلا پیسہ اور اجازت دے رکھی ہے انہوں نے۔ وہ بھی نوکری پیشہ ہیں۔ مگر ہر کوئی ارقم کی طرح نہیں ہوتا۔ ان کی تو لگامیں بھی اماں بیگم کے ہاتھوں میں ہیں۔" وہ تیکھے پن سے بولی تو امی کا پارہ چڑھ گیا۔

"دوسروں سے خود کا موازنہ کرنا بند کرو طوبیٰ! جو اللہ نے دیا ہے اس میں خوش رہو۔ جو نہیں ہے اس کی حسرت میں کڑھتی رہو گی تو حاصل شدہ نعمتوں کا سکھ بھی ہاتھ سے نکل جائے گا۔ صبر کرنا سیکھو۔"

"بس۔ یہاں آپ مجھے صبر اور وہاں اماں بیگم مجھے شکر کی تلقین ہی کرتی رہیے گا۔ آپ تو میری ماں ہیں کم از کم آپ میرا ساتھ دیں۔" وہ یک دم روہانسی ہو کر بولی تو امی کا دل چاہا اپنا سر پیٹ لیں۔

"تمہاری ماں ہوں تب ہی تو تمہارے بھلے کو کہہ رہی ہوں۔ ارقم میاں بہت اچھے انسان ہیں۔ تمہاری اوٹ پٹانگ باتیں بھی برداشت کر لیتے ہیں۔ اور تمہاری ساس بھی بھلی عورت ہیں۔ دیکھ لینا ابھی ارقم کو بھیجتی ہوں گی تمہیں لانے کے لیے۔ مگر بیٹا تم بھی حالات کو سمجھو۔

آگے عید قرباں کا جانور بھی خریدنا ہے انہیں۔ پھر ان کی کزن کی شادی پر فریج بھی لینا ہے۔ تم سب کے عید کے کپڑے، شادی کی تقریبات کے لیے بھی تمہاری کوئی نہ کوئی فرمائش ہوگی۔ اس پر تم

خود جانتی ہو کہ مہینے میں کمیٹیاں بھی چکانی ہیں، تو خود سوچو ایک بندہ کہاں کہاں پورا پڑے۔ تم تو بیوی ہو۔ شوہر کا خیال کرنا چاہیے تمہیں۔" امی نے گہری سانس بھر کر اپنی کم عقل بیٹی کو دیکھا اور نرمی سے سمجھانے لگیں۔

"ہاں تو کتنے ہی سال سے بقر عید پر ایک سستا سا جوڑا لیتی ہوں میں، نئے جوتے، جیولری، کاسمیٹکس کچھ نہیں خریدتی تا کہ قربانی کا جانور لینے میں ارقم کو آسانی ہو۔ آپ سب جانتی ہیں۔ ہر سال دونوں عیدوں کے بیچ ان کے خاندان میں کوئی نہ کوئی شادی ہوتی ہے۔ وہاں کے لین دین میں تو کوئی کمی نہیں کی جاتی اب مجھے صبوحی کے لیے، ایک برینڈڈ سوٹ لینا ہے تو سارے عذر بس میرے ہی لیے ہیں۔ صرف تیس ہزار کا ہی تو وہ سوٹ ہے جو میں صبوحی کو دینا چاہتی ہوں۔" ماں کے سمجھانے پر وہ ٹھنک کر بولی تو امی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"تیس ہزار روپے۔ اتنا مہنگا سوٹ۔" امی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔

"افوہ امی۔ آپ تو ایسے کہہ رہی ہیں جیسے تیس ہزار نہیں تین لاکھ کا سوٹ ہو وہ۔" اس نے ماں کی حیرت پر انہیں خجالت سے دیکھا۔ "یسریٰ کی دفعہ اس نے مجھے پینتیس ہزار کا سوٹ دیا تھا اور حمنیٰ کی بار بیالیس ہزار کا۔ آج کل برانڈڈ سوٹس کی یہی قیمتیں چل رہی ہیں۔ میں نے تو پھر بھی سستا سوٹ ہی دیکھا ہے اس کے لیے۔" اس نے دبے دبے لہجے میں ماں کو معلومات فراہم کیں۔

"اللہ اُس کے رزق و مال میں برکت دے۔ اس نے اپنی حیثیت کے مطابق دیا۔ تم اپنے شوہر کی جیب اور اپنے حالات دیکھو، اور بس اب بات کو ختم کرو اور باہر جا کر دیکھو۔ بیل بج رہی ہے۔ یقیناً ارقم میاں آئے ہوں گے۔" امی نے سخت اور سنجیدہ لہجے میں بات ختم کی تو وہ لب بھینچ کر رخ موڑ گئی، جب کہ وہ داماد کے استقبال کے لیے کمرے سے باہر نکل گئی تھیں۔

امی کی اطلاع کے مطابق واقعی ارقم اسے لینے آیا تھا۔ ابا کی موجودگی میں وہ زیادہ نخرے نہیں کر سکتی تھی۔ لہٰذا جب ارقم نے اسے ساتھ چلنے کے لیے کہا تو وہ کسی پس و پیش کے بغیر اٹھ گئی۔ پھر اقصیٰ نے کھانے کے لیے بہت اصرار کیا، مگر ایک تو وہ امی سے شکایت لگانے کی وجہ سے اقصیٰ سے خفا تھی، دوسرے بچیاں بھی گھر جانے کو بضد تھیں۔ اماں بیگم کے بغیر گزارا نہیں تھا ان دونوں کا۔ اس لیے سہولت سے انکار کر کے ارقم کے ساتھ باہر نکل آئی۔

"آؤ بیٹھو۔" ارقم نے کار کا دروازہ کھولا تو اس نے بھنویں سکیڑ کر اسے دیکھا۔

"پیٹرول کیا سستا ہو گیا ہے جو مجھے گاڑی میں لینے آ گئے ہیں۔" تڑخ کر سوال کیا تو ارقم نے تحمل سے بچیوں کو پچھلی نشستوں پر بٹھاتے ہوئے اس کے طنز کو نظر انداز کیا۔

"ایسی بات نہیں، اماں بیگم نے بتایا تم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا ہے، پھر آج باہر کے بھی سب کام پیدل جا کر کیے تم نے۔" ارقم کا لہجہ ہمیشہ کی طرح حلاوت سے پر تھا۔ نرمی اس کے چہرے کا وصف تھی۔

"ہاں تو پہلے کون سے جہاز چارٹر کیے جاتے تھے میرے لیے، جو آج میرا پیدل چلنا تکلیف دہ ہوا آپ کے لیے، میرے نصیب میں تو بس سمجھوتے اور قربانیاں ہی رہ گئی ہیں۔ ہر کوئی صبوحی کی طرح خوش نصیب نہیں ہوتا کہ اپنی ساری خواہشیں پوری کر سکے۔ اور پلیز اب یہ مت کہیے گا کہ اس کے شوہر کی تنخواہ آپ سے زیادہ ہے۔ سب پتا ہے مجھے۔ مگر ہر ایک کو آپ کی طرح سوشل ورک کا خفقان نہیں ہوتا۔"

تپے تپے لہجے میں وہ تواتر سے بول رہی تھی۔ اشارہ ارقم کی چچا زاد بہن کی شادی میں دیے جانے والے تحفے کی طرف تھا۔ جواباً وہ خاموش ہی رہا۔ اس کی یہی خاموشی اسے طیش دلاتی تھی۔ یوں

لگا جیسے وہ کسی دیوار سے مخاطب ہو۔ ابھی بھی یہی ہوا تھا۔ جس پر وہ مزید کھول کر رہ گئی۔

دو منٹ کا راستہ تھا۔ وہ گھر پہنچ گئے تو ارقم خاموشی سے بچیوں کو گاڑی سے باہر اتارنے لگا۔ جبکہ اس اثناء میں وہ تیوریوں پر بل ڈالے گھر کے اندر چلی گئی تھی۔ تاہم اس کی خفگی اس وقت ملامت میں تبدیل ہوگئی جب اس نے ارقم کو دیکھا۔

کھانے کے دوران وہ بہت خاموش تھا۔ حتیٰ کہ بچیوں سے بھی خلاف معمول زیادہ بات چیت نہیں کی اور برائے نام کھانا کھا کر اٹھ گیا تو اماں بیگم سمیت اسے بھی افسوس ہونے لگا۔ اپنا پسندیدہ کھانا بھی اس نے رغبت سے نہیں کھایا تھا۔

پورا دن وہ اسی ادھیڑ بن میں لگی رہی تھی کہ صبوحی کے لیے تحفے کا انتظام کیسے کرے مگر امی کی ڈانٹ نے اس کی سوچ بچار کے دریا پر بند باندھ دیا تھا۔ جن کی ساری ہمدردیاں صرف ارقم کے ساتھ تھیں۔ اس کی فکرات ان کے نزدیک کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتی تھیں۔ مگر اب اسے بھی احساس ہو رہا تھا کہ اس نے واقعی بہت زیادہ بوجھ ارقم پر ڈال دیا تھا۔

وہ چائے لے کر کمرے میں آئی تو ارقم لباس تبدیل کر کے آنکھوں پر بازو رکھے بستر پر دراز تھا۔

"ارقم! کیا سو گئے ہیں آپ؟" اس نے نرمی سے اسے پکارا تھا۔ ارقم نے بازو آنکھوں پر سے ہٹایا۔

"لیجیے۔ چائے پی لیں۔" اسے جاگتا پا کر وہ اس کے پاس چلی آئی تھی۔ ارقم اس کے کہنے پر اٹھ کر بیٹھ گیا تھا پھر چائے کا کپ اس کے ہاتھ سے لے کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور ایک لفافہ اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا تو وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"گن لو۔ امید ہے اتنے میں کام چل جائے گا۔" طوبیٰ نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے لفافہ اس کے ہاتھ سے لے کر پیسے گنے۔ وہ

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیئر آئل

SOHNI HAIR OIL

- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- نئے بال اُگاتا ہے۔
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے یکساں مفید۔
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔



قیمت -/150 روپے

سوہنی ہیئر آئل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خریدا جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف -/150 روپے ہے، دوسرے شہر والے منی آڈر بھیج کر رجسٹرڈ پارسل سے منگوالیں، رجسٹری سے منگوانے والے منی آڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

2 بوتلوں کے لئے ---------- -/400 روپے
3 بوتلوں کے لئے ---------- -/600 روپے
6 بوتلوں کے لئے ---------- -/1100 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیئر آئل ان جگہوں سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 32735021

پانچ پانچ ہزار کے دس نوٹ تھے۔

''ان پیسوں کا انتظام کہاں سے کیا آپ نے؟'' فکر اور حیرت سے سوال کرتی وہ اس کے پاس آبیٹھی تھی۔

''ظاہر ہے اکاؤنٹ سے طوبیٰ!'' ارقم نے سنجیدگی اسے جواب دیا۔

''مگر وہ پیسے تو آپ نے گائے خریدنے کے لیے رکھے تھے۔''

''کوئی بات نہیں۔ اس بار ہم بکرا لے لیں گے۔'' ارقم کا انداز پرسکون تھا۔

''نہیں۔ ہم گائے ہی لیں گے وہ بھی کم ازکم چار من کی۔'' اس نے فیصلہ کن لہجے میں اصرار کیا۔

پچھلے دو سالوں سے وہ بڑا جانور قربان نہیں کر پا رہے تھے۔ پچھلے سال نبا کی شادی، اور اس سے پچھلے سال اماں بیگم کے حج کے فریضے، کی ادائیگی کے باعث دونوں سال ارقم نے بکرے کی قربانی دی تھی اور سچ تو یہ ہے کہ ارقم کو اس بات کا ذرہ برابر افسوس بھی نہیں تھا۔ مگر طوبیٰ کو بڑا قلق تھا۔ جب تک گائے کی قربانی نہ ہو اسے تو عید قرباں کا مزا ہی نہیں آتا تھا۔

''دو سال بعد جا کر تو آپ گائے کے لیے پیسے جمع کر پائے ہیں۔ بس ہم گائے ہی لیں گے۔ یہ طے ہے۔'' وہ اپنے خواب سے دستبردار ہونے کو تیار نہ تھی۔

''اور اس کی وجہ۔؟'' ارقم نے گہری نظروں سے اس کے چہرے کو پڑھا۔ ''اصل چیز تو اللہ کی راہ میں قربانی کرنا ہے نا۔ تو پھر کیا فرق پڑتا ہے کہ جانور کون سا ہے کون سا نہیں، تین من کا ہے یا چار من کا۔'' ارقم نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔

''فرق پڑتا ہے! کیوں نہیں پڑتا۔ حدیث نبوی ﷺ کے مفہوم کے مطابق، قربانی کے جانور کے ہر بال کے عوض ایک نیکی ہے اور قیامت کے روز، قربانی کا یہ جانور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں، اپنے سینگوں بالوں اور کھروں سمیت حاضر ہوگا۔ اور جب میزان میں اس کا وزن کیا جائے گا تو خود سوچیے کتنی زیادہ نیکیوں کا سبب بنے گا ہمارے لیے۔'' اس نے برجستہ جواب دیا تھا۔

''کیا تمہیں یقین ہے طوبیٰ! کہ محض یہی وجہ ہے؟۔ کہیں اس خواہش کے پیچھے نمود ونمائش یا ریا کاری تو نہیں؟۔ جانتی ہونا کہ ریا کاری شرک اصغر ہے۔'' ارقم کا لہجہ سنگین حد تک سنجیدہ ہوگیا تھا۔ جس پر طوبیٰ کے چہرے پر یک دم برہمی کے اثرات ابھرے۔

''کتنا برا سمجھتے ہیں آپ مجھے۔ کیا آپ کو میں دنیا دکھاوے کے لیے نیکی کرنے والی لگتی ہوں؟۔''

ارقم کے سنجیدگی سے پوچھنے پر اس نے باقاعدہ ناراضی سے استفسار کیا، تو ارقم نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ جسے اس نے نہایت خفگی سے چھڑا لیا تھا۔

''نہیں۔ میں نے یہ نہیں کہا مگر نیکی کرتے ہوئے ہمیں اپنی نیتوں کو ایک بار چیک ضرور کر لینا چاہیے۔ کبھی کبھی شیطان ہماری نیکیوں کو نیت کے فساد کے ذریعے ہی اچک لے جاتا ہے۔'' ارقم نے اس کے برا ماننے پر نرمی سے کہا تو اس کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔

''بس ایک آپ اور ایک آپ کی اماں بیگم، مجال ہے جو کبھی میرے بارے میں کچھ اچھا سوچ لیں جب دیکھو یہی منفی باتیں کرتے رہتے ہیں آپ دونوں۔ بلکہ اب تو آپ نے میری امی کو بھی ملا لیا ہے ساتھ۔ اعمال تو اعمال میری تو نیتوں پر بھی شک ہے سب کو۔'' یک دم غصے سے کہتی ایک جھٹکے سے ارقم کا ہاتھ کھینچ کر اپنے سامنے کیا اور اس پر پیسوں کا لفافہ سختی سے رکھتے ہوئے وہ اس کے پاس سے اٹھ گئی تھی۔

''ارے پیسے تو رکھو! صبوحی کے لیے گفٹ نہیں لینا کیا؟'' ارقم نے اسے پکارا تھا مگر اب طوبیٰ کا پارہ ایک بار پھر چڑھ چکا تھا۔ ذرا دیر پہلے ارقم

کے لیے جاگی ہمدردی اس کے غیض کی تپش سے بھاپ بن کر اڑ گئی تھی۔

''صبوحی میری دوست ہے۔ اس کے لیے گفٹ لینا بھی میرا دردِ سر ہے۔ آپ تردد نہ کریں۔ اس سے پہلے کہ مجھ پر منافقت یا ریاکاری کا ایک اور فتویٰ لگے میرا سو جانا ہی بہتر ہے۔'' تکیے پر سر پٹختے ہوئے اس نے تیکھے پن سے کہا اور منہ پھیر کر لیٹ گئی۔ انداز میں بچپنا تھا۔ ارقم کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ جانتا تھا کہ اگلی صبح حسبِ عادت وہ رات کی ناراضی بھول چکی ہوگی۔

☆☆☆

میکے اور سسرال کی طرف سے جو زیور اسے ملا تھا وہ اماں بیگم نے لاکر میں رکھوا دیا تھا۔ البتہ گھر میں وہ لاکٹ اور انگوٹھیاں وغیرہ پہنے رہتی تھی۔ ان میں سے ایک انگوٹھی کافی ہلکی تھی جو اس نے کالج لائف میں اپنی پاکٹ منی کو جمع کر کے خریدی تھی۔ کل رات اس نے سوچ لیا تھا کہ صبح بچوں کو اسکول چھوڑنے کے بعد قریبی مارکیٹ جا کر سنار سے اس کی قیمت کا پتا کر لے گی۔ مگر اس سے پہلے امی سے مشورہ کرنا بھی ضروری تھا۔

اماں بیگم آج حنا کی طرف گئی ہوئی تھیں۔ اس لیے اسے گھر واپسی کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ بچیوں کو اسکول چھوڑ کر وہ امی کی طرف آگئی۔ اور انہیں اپنی سوچ سے آگاہ کیا۔

''مطلب خناس نکلا نہیں ابھی تک تمہارے دماغ سے۔ میں سمجھ رہی تھی کہ کل کی جھاڑ پونچھ سے عقل کچھ ٹھکانے آگئی ہوگی۔'' امی تو سنتے ہی چراغ پا ہو گئی تھیں۔

''اس میں بے عقلی کی کون سی بات ہے امی! آخر یہ زیور بہ وقتِ ضرورت کام نہ آیا تو پھر کس کام کا۔'' وہ بدبدا کر بولی تھی۔

''خدانخواستہ ایسی کیا افتاد آپڑی ہے تم پر جو بات زیور بیچنے تک آپہنچی ہے۔ شوہر اور ساس کو مطلع کیے بغیر یہ کیا کرنے چلی ہو۔ کچھ ہوش ہے تمہیں۔'' امی کو اس کا جملہ مزید تاؤ دلا گیا۔

''ان دونوں سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ میری انگوٹھی ہے۔ منہ دکھائی میں نہیں ملی تھی مجھے۔'' وہ بپھر کر ضدی پن سے بولی تو امی کو بھی غصہ آگیا۔

''شادی کے بعد ''میرا تیرا'' نہیں سب کچھ ''ہمارا'' ہوتا ہے نادان لڑکی!۔ اگر کبھی ارقم تمہیں بغیر بتائے ایسا کچھ کر ڈالے تو برداشت ہوگا تمہیں۔'' تیکھے تیوروں سمیت اس سے استفسار کیا تو وہ جھلا سی گئی۔

''اف امی! لگتا ہے میری نہیں بلکہ ارقم کی ماں ہیں آپ، کبھی تو میری طرف داری بھی کر لیا کریں۔'' تروٹھے پن سے کہہ کر وہ وہاں رکی نہیں اور امی کے بہت پکارنے پر بھی گھر سے نکلتی چلی گئی۔ اقصیٰ پیچھے پیچھے گیٹ تک اسے روکنے آئی مگر وہ واقعی آج روٹھ گئی تھی۔ پلٹ کر نہ دیکھا۔

''میرے پاس کچھ پیسے پڑے ہوئے ہیں۔ پچھلے مہینے کی کمیٹی سے بچ گئے تھے۔ آپ کہیں تو دے دوں اسے۔ وہ واقعی پریشان ہے۔'' اقصیٰ واپس آئی تو امی سے پوچھا۔ نند کے لیے تردد تھا لہجے میں۔

''کوئی ضرورت نہیں اس کا دماغ مزید خراب کرنے کا۔ اکلوتی بیٹی کے لاڈ اٹھا اٹھا کر پہلے ہی تمہارے ابو نے اسے کسی کام کا نہیں چھوڑا۔ عورت کو اپنے شوہر کی کمائی میں گزارا کرنے کی عادت ہونا چاہیے۔ خبردار جو تم نے حق دوستی نبھایا ہو تو۔ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔'' بہو کو پیار سے ڈانٹ کر امی نے قصہ کوتاہ کیا اور دل ہی دل میں بیٹی کے لیے ہدایت کی دعا کرتی، کچن کی طرف بڑھ گئیں تو اقصیٰ لبوں پر تبسم اور دل میں طوبیٰ کے لیے فکرمندی لیے ان کے پیچھے چلی آئی۔

☆☆☆

امی کی ڈانٹ نے اس کے دماغ کو واقعی ٹھکانے پر لگا دیا تھا۔ پہلے تو وہ بہت جھنجھلائی

مگر جب غصہ ٹھنڈا ہوا تو وہ سنار کی طرف جانے کے بجائے سیدھا گھر چلی آئی۔ مگر یہ کیا؟۔ گیٹ پر کھڑی نئی نکور بائیک اسے حیران کر گئی۔ لاک کھول کر وہ تیز قدموں سے اندر آئی تھی۔

ارقم بستر کے پاس بیٹھا جوتے اتار رہا تھا وہ اسے بے وقت گھر پر دیکھ کر پریشانی سے لپک کر قریب آئی۔

''ارقم آپ؟ اس وقت؟۔ سب خیریت تو ہے؟ اور باہر کھڑی نئی بائیک کس کی ہے؟۔'' ایک ہی سانس میں سارے سوال کر ڈالے۔

''الحمدللہ سب ٹھیک ہے۔ تم پریشان مت ہو۔'' اس کی فکر کے جواب میں ارقم نے مسکرا کر جواب دیا تو اس کی جان میں جان آئی۔

''اور مٹھائی کھاؤ۔ یہ نئی بائیک ہماری ہے۔'' گلاب جامن اس کے منہ میں ڈالتے ہوئے ارقم نے نئی خبر سنائی تو گلاب جان اس کے گلے میں اٹک گیا۔

''کیا مطلب ہماری؟۔ آپ کی پرانی بائیک کہاں ہے؟۔''

''بیچ دی میں نے آج۔ بار بار سروس کروانا پڑتی تھی۔ فہد کے طفیل اچھی قیمت لگ گئی اس کی۔'' اپنے دوست کا ذکر کرتے ہوئے اس نے بتایا۔ اور پھر ایک لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔

''پھر ایک لفافہ؟'' طوبیٰ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''یہ صبوحی کے لیے گفٹ کے لیے پیسے ہیں۔ بائیک کے پیسوں میں سے کچھ پیسے نئی بائیک کے ایڈوانس کے لیے دے دیئے اور باقی تمھارے لیے لے آیا ہوں۔'' ارقم کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح حلاوت اور ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

''کیا مطلب۔ انسٹالمنٹ پر لی ہے آپ نے بائیک۔ حالانکہ آپ کو پتا بھی ہے کہ اماں بیگم کتنا خلاف ہیں قسطوں پر چیزیں لینے کے۔ آپ جانتے ہیں نا کہ زائد قیمت کو سود مانتی ہیں وہ۔'' اسے سب کچھ بھول کر اماں بیگم کی فکر پڑ گئی تھی۔

''نہیں زائد قیمت کے ساتھ نہیں لی۔ فہد کا دوست ہے وہ شوروم والا۔ مجھے نقد والی قیمت پر ہی دلوائی ہے اس نے۔ تم فکر مت کرو میں خود زائد قیمت ادا کرنا پسند نہیں کرتا۔'' ارقم پر اماں بیگم کی تربیت کا گہرا رنگ تھا۔ اس کی بات سن کر وہ کچھ مطمئن ہوئی اور پھر اچانک کچھ سوچ کر ارقم کی طرف دیکھا۔

''اور یہ سب آپ نے صرف میری وجہ سے کیا۔ ہے نا؟۔ میری فرمائش پوری کرنے کے لیے۔'' وہ مان بھری ندامت سے کہتی ارقم کو مسکرانے پر مجبور کر گئی۔

''کیا کریں توبہ بیگم! آپ سے شادی کی قیمت بھی تو چکانا ہے نا۔'' وہ شوخی سے بولا تو طوبیٰ مصنوعی خفگی بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بے ساختہ ہنس پڑی۔

''آپ کو قیمت چکانا بھی چاہیے۔ اتنا آسان نہیں ہے طوبیٰ حسن کے ساتھ زندگی گزارنا۔ میرے ابو نے بہت لاڈوں سے پالا ہے مجھے۔ شادی کی ہے آپ نے تو نخرے بھی اٹھانا پڑیں گے۔'' وہ ناز سے بولی تھی۔

''انکار کس کافر کو ہے۔'' ارقم خوشگوار موڈ میں بولا تو وہ خوش دلی سے ہنس دی۔

(سوری ارقم۔ بس اس بار آپ کو تنگ کیا ہے۔ ان شاء اللہ آئندہ ایسا نہیں کروں گی۔)

ارقم کے کندھے پر سرشاری سے سر ٹکاتے ہوئے اس نے دل ہی دل میں تہیہ کیا تھا۔

☆☆☆

''آج رات ذی الحج کا چاند نکلنے کی قوی امید ہے طوبیٰ! میں نے بچیوں کے ناخن کاٹ دیے ہیں۔ تم بھی ناخن تراش لو اور اگر عید کے لیے بالوں کی کٹنگ کرانی ہے تو آج دوپہر تک کروالو جا کر۔''

''جی اماں بیگم! ابھی سے ہی کرواؤں گی کٹنگ۔ کٹنگ بھی کیا بس بالوں کی نوکیں ترشوانا

ہیں۔ کتنے دنوں سے ٹریمنگ نہیں کروائی میں نے۔ آج رات کھانے کے بعد چلی جاؤں گی امی کی طرف۔"

"مغرب کے بعد نہیں بیٹا! اس کے بعد تو ذی الحج کا مہینہ شروع ہو جائے گا۔ صحیح مسلم میں آپ ﷺ کا فرمان ہے:

جب ذی الحج کا مہینہ شروع ہو جائے اور تم میں سے کسی کا قربانی کا کرنے کا ارادہ ہو تو اپنے بال اور ناخن نہ کاٹے۔" مطلب ذی الحج کا چاند نظر آنے سے قربانی کرنے تک حاجیوں کی طرح ناخن اور بال نہیں کاٹنا چاہیے۔ ایسا کرنا مستحب ہے۔" اماں بیگم نے سمجھایا تو وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔ ہر سال اماں بیگم یہ سب یاد دلاتی تھیں اور ہر سال ہی وہ بھولتی تھی۔

"سہ پہر جا کر مغرب سے پہلے لوٹ آنا۔ رات کو سحری کا بھی انتظام کرنا ہے۔ سورۃ الفجر میں ان دس راتوں کی قسم کھائی ہے اللہ سبحان وتعالیٰ نے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس عشرے کی عبادت کی بہت فضیلت بتائی ہے۔ اور نو ذی الحج یعنی عرفہ کے دن کا روزہ رکھنا تو دو سالوں کے گناہوں کا کفارہ ہے۔" ناشتے کی میز پر اماں بیگم نرمی سے بتا رہی تھیں۔

مخاطب طوبیٰ سے تھیں۔ کیونکہ ارقم کے بارے میں تو وہ جانتی تھیں کہ اس یاد دہانی کی اُسے ضرورت نہیں۔ جبکہ طوبیٰ کے لیے یہ سب یاد رکھنا ہمیشہ ہی دشوار رہا تھا۔ ویسے بھی اس کے میکے میں ان دنوں میں ایسا اہتمام کیا بھی نہیں جاتا تھا۔ نئے کپڑے بنا لیے، قربانی کا جانور خرید لیا اور عید والے دن قربانی کر لی اللہ اللہ خیر صلا۔ مگر ارقم سے شادی کے بعد اماں بیگم نے اس کی بھی تربیت کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ ان کے بقول بہو دین دار ہو گی تب ہی تو ان کی نسل بھی دین پر عمل کرنے والی بنے گی۔ ذی الحج کے شروع کے نو دن وہ خود بھی روزہ رکھتیں باقی سب کو بھی رکھواتیں۔ ذکر اور عبادت کا خاص اہتمام کرتیں۔ دینی رجحان کے معاملے میں ارقم بالکل اپنی اماں بیگم کا پرتو تھا، دل سے عبادت کرتا۔ مگر طوبیٰ کو کبھی تلقین نہ کی شاید اس لیے کہ اسے پتا تھا کہ یہ کام اماں بیگم بخوبی کر لیں گی۔

"دن لمبے ہو گئے ہیں اماں بیگم! اور آج کل گرمی بھی شدید ہو رہی ہے۔" سحری اور روزے کے نام پر ہی طوبیٰ کو فکر لاحق ہو گئی تھی۔

"اللہ ہمت دینے والا ہے۔ تم بس ارادہ کرو توفیق اور اجر تو رب کریم ہی دے گا بیٹا!" اماں بیگم ناشتہ ختم کر کے اٹھتے ہوئے بولیں تو وہ بے بسی سے ارقم کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔

"پریشان مت ہو۔ جیسے پچھلے سال تم نے رکھ لیے تھے اس سال بھی رکھ لو گی۔" وہ پرسکون انداز میں بولا۔

"اپنی نہیں آپ کی فکر ہے مجھے۔ اتنی گرمی میں جاب کے ساتھ روزے رکھنا کوئی آسان بھی تو نہیں۔"

"میری فکر مت کرو۔ جب انسان اپنے کسی پیارے کی خاطر کچھ کرنا چاہتا ہے تو تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔ ہم عبادت اللہ کے لیے کرتے ہیں اور اللہ سے بڑھ کر اپنا کون ہے۔" چائے کا آخری گھونٹ لے کر وہ اٹھتے ہوئے بولا تو وہ اسے فخر سے دیکھ کر رہ گئی۔ دل سے دعا نکلی۔

"یا اللہ میری بھی مدد کرنا کہ میں اپنی بیٹیوں کی ایسی ہی تربیت کر سکوں جیسی اماں بیگم نے کی ہے۔"

رات کو واقعی چاند نظر آ گیا تھا۔ دوسرے دن ارقم جا کر گائے بھی خرید لایا۔ تو گھر میں اور بھی رونق ہو گئی۔ پھر واقعی پورا عشرہ بہت برکت کے ساتھ گزرا۔ ہر سال کی طرح اماں بیگم اپنے حج کے دنوں کو یاد کرتی رہیں اور ان کا تذکرہ کر کے طوبیٰ کے دل میں بھی حج کرنے کی خواہش کو بیدار کرتی رہیں۔ تاہم عبادت کے ساتھ ساتھ اپنی پوتیوں

کے عید کے کپڑے حسب سابق انہوں نے خود سیئے۔ نیلی قمیص اور دوپٹوں کے ساتھ روپہلے رنگ کے جامہ وار کپڑے سے سیئے گئے غرارے بہت حسین تھے۔

"افوہ اماں بیگم! کیوں آپ روزدوں اور اس گرمی میں یہ کپڑے سی رہی ہیں۔ یہ سب پہن کر بچیاں کھیلیں گی کیسے۔" اماں بیگم کو اس کام سے باز رکھنے کے لیے اس نے اپنے ہی انداز سے بات کہی تھی حالانکہ دادی کا یوں پوتیوں سے پیار جتانا، اس کا خون بڑھا دیتا تھا۔ مگر اسے احساس تھا کہ اس عمر میں اتنی محنت کرنا ان کے لیے آسان نہیں رہا تھا۔

"کھیل بھی لیں گی۔ تم پریشان مت ہو۔ دیکھو تو کس شوق سے بنوائے ہیں میری پیاری بچیوں نے یہ کپڑے۔ پریاں لگیں گی دونوں۔ دادی کی جان۔ دادی قربان ان پر۔" اماں بیگم کی محبت کے آگے وہ ہار مان کر چپ ہوگئی۔

نو ذی الحج کو افطار کے بعد صبح پکائے جانے والے کھانوں کی تیاری کے لیے اماں بیگم بھی اس کی مدد کی خاطر باورچی خانے میں آگئی تھیں۔ لہسن ادرک پیسا، پیاز تلی، اور رائتہ بنانے کے ساتھ ساتھ ایک میٹھا بھی بنا لیا گیا تھا۔ کبابوں کا مسالہ اماں بیگم ہر سال خود تیار کرتی تھیں۔ جو باربی کیو کے لیے مشہور تھا۔ اور یوں تھوڑی دیر میں وہ سب کاموں سے فارغ ہوگئی تو اماں بیگم نے زبردستی اسے مہندی لگوانے اقصیٰ کے پاس بھیج دیا۔ جس کا شادی سے پہلے کا کیا ہوا بیوٹیشن کورس خوب کام آرہا تھا۔ افطار کے بعد اسے سخت سستی ہو رہی تھی مگر اماں بیگم نے اس کی ایک نہ سنی۔

"خیر سے شوہر والی ہو بیٹا! سجو سنورو۔ یہی تو دن ہیں سنگھار کرنے کے۔ اللہ میرے ارقم کو لمبی زندگی دے۔ مرد عید کی نماز پڑھ کر لوٹے تو بیوی کو تیار ہو کر اس کا استقبال کرنا چاہیے۔" اپنی تمام تر تنک مزاجی کے باوجود اماں بیگم اسے چاہتی بھی تھیں۔ وہ ان کے اکلوتے بیٹے کے گھر کی رونق تھی۔

"جی اچھا اماں بیگم! لگوا لیتی ہوں مہندی۔ مگر ان دونوں کو ساتھ لے کر نہیں جاؤں گی۔ پچھلی بار بھی حمنیٰ نے ہاتھ مار کر میری ساری مہندی خراب کر دی تھی۔" کچن سے نکلتے نکلتے اس نے واضح لہجے میں اپنا ارادہ بتایا تھا۔

"انہیں میں گول ٹکیہ والی مہندی لگا دوں گی۔ بس تم ذرا جلدی آجانا۔" اماں بیگم نے اسے بچوں کی طرف سے مطمئن کیا تو وہ تیار ہو کر امی کی طرف چلی گئی۔ اقصیٰ سے اپنی پسند کا مشکل سا ڈیزائن لگوا کر جب وہ گھر آئی تو اماں بیگم نے دونوں بچیوں کو مہندی لگا کر ہاتھوں کو پلاسٹک کے لفافوں میں لپیٹ کر انہیں سلا دیا تھا۔ ورنہ پچھلی بار کی طرح صبح دونوں بچیوں کے رخساروں پر مہندی کا ڈیزائن چھپا ہوا ملتا۔

کل عید تھی اور اس کے ساتھ ہی اسے صبوحی کی طرف جانے کی خوشی بھی تھی۔ ذی الحج کا چاند نظر آنے سے پہلے ہی وہ صبوحی کے لیے سوٹ اور نومولود بچی کے لیے کپڑے اور کچھ کھلونے لے آئی تھی۔ جنہیں اس نے بڑے دل سے خوبصورت پیکنگ میں ملفوف کر کے رکھ لیا تھا۔ اماں بیگم سے دوپہر قربانی کے بعد صرف ایک گھنٹے کے لیے جانے کی اجازت ارقم نے دلوادی تھی۔ جس پر اس کا دل باغ باغ تھا۔

☆☆☆

مہک اٹھی ہے فضا پیرہن کی خوشبو سے
چمن دلوں کا کھلانے کو عید آئی ہے

ارقم کے عید کی نماز کے لیے جاتے ہی، اس نے اماں بیگم کی ہدایت کے مطابق، ٹی پنک کلر کا عید کا سوٹ پہن کر بالوں کا جوڑا بنایا اور ہلکا سا میک اپ کر لیا۔ اماں بیگم کا یہ حکم اسے جی جان سے بھاتا تھا۔ وہ زبان کی کڑوی ضرور تھیں، مگر ارقم اور اس کے درمیان محبت قائم رکھنے کے لیے اسے سیکھ دیتی رہتی تھیں۔ شوہر کے دل پر راج کرنے کے اسرار و

رموز امی سے زیادہ اسے اماں بیگم نے سکھائے تھے۔ ورنہ وہ بہت لا ابالی تھی۔ البتہ پہننے اوڑھنے کی وہ شوقین تھی۔ بجنا سنورنا اسے بے حد پسند تھا۔

گرمی شدید تھی اس لیے اس نے لان کا سوٹ بنایا تھا۔ شام میں اس کی دونوں نندوں کو کھانے پر آنا تھا، لہٰذا کام کافی تھا گھر پر۔ خود تیار ہونے کے بعد اس نے بچیوں کو تیار کیا اور اماں بیگم کو بھی کپڑے استری کر کے دیے۔ اتنے میں ارقم نماز پڑھ کر آ گیا تھا۔ قصائی بھی ساتھ تھا۔ یوں صبح کے گیارہ بجے تک وہ قربانی کے فرض سے سبکدوش بھی ہو گئے تھے۔

ادھر اماں بیگم نے گوشت کے حصے بنانا شروع کیے اور ادھر وہ کلیجی کا مسالا تیار کرنے کچن میں جا گھسی۔ اور پھر دوپہر تک وہ اماں بیگم کے ساتھ لگی رہی۔ جن کی ہدایت کے مطابق، گوشت کا آدھا حصہ غریبوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ اور بقیہ رشتے داروں کے ہاں جاتا، جبکہ اپنے گھر وہ صرف کلیجی اور تکے ہی بنایا کرتے تھے۔ اماں بیگم اور ارقم گوشت تقسیم کرنے کے معاملے میں بہت فراغ دل تھے۔ وہ جانتی تھی کہ اس بار بھی ایسا ہی کیا جائے گا، اس لیے پہلے ہی ارقم سے کہہ کر صبوحی کے لیے ایک معقول حصہ بنوا لیا تھا۔

بمشکل تین بجے کے قریب وہ کچن سے فارغ ہوئی تو اماں بیگم نے اسے بلا کر نقد رقم اس کے اور ارقم کے ہاتھ پر رکھی۔ یہ ان کی عیدی تھی۔ میٹھی عید کی طرح اماں بیگم بقر عید پر بھی انہیں عیدی دیتی تھیں۔ پھر چاہے وہ پانچ سو روپے ہی کیوں نہ ہوں اور وہ ہر بار بڑی خوشی سے عیدی وصولتی تھی۔

''بہت شکریہ اماں بیگم!'' وہ لاڈ سے ان کے گلے لگ گئی تھی۔

''اف بڑوں سے عیدی لینے کا بھی اپنا مزا ہے۔ ہے نا ارقم!'' وہ کمرے آ کر صبوحی کی طرف جانے کے لیے تیار ہوتے ہوئے پوچھنے لگی تو ارقم نے مسکرا کر تائید کی۔

''بالکل ایسا ہی ہے۔ اماں بیگم کے ہاتھ سے عیدی لیتے ہوئے آج بھی اچھا لگتا ہے حالانکہ اب تو میں خود بھی کماتا ہوں۔ مگر یہ پیسہ کمائی سے زیادہ عزیز ہے کیونکہ اس میں ان کا پیار ہے۔''

''یہ تو ہے۔ ویسے بڑے تو آپ بھی ہیں نا مجھ سے۔ تو چلیے نکالیے میری عیدی۔'' ارقم کی بات پر اسے اچانک خیال آیا تھا۔

''کیسی عیدی! تمھیں اماں بیگم سے صبوحی کے گھر جانے کی اجازت دلوائی تو ہے۔ کیا یہ کافی نہیں ہے۔'' ارقم نے مسکراہٹ دبا کر سنجیدگی سے کہا تو وہ ہیئر برش تھامے اس کے سر پر آ سوار ہوئی۔

''بالکل کافی نہیں ہے۔ بس زیادہ بہانے نہ بنائیں اور نکالیں عیدی۔'' حنائی ہتھیلی ارقم کے سامنے پھیلاتے ہوئے اس نے پیار بھرے تحکم سے کہا تو تھوڑی بہت مصنوعی رد و کد کے بعد بالآخر ارقم کو جیب سے پیسے نکالتے ہی بنی۔

''یہ لیں جناب آپ کی عیدی۔'' سو کا نوٹ نکال کر اس نے طوبیٰ کی ہتھیلی پر دھرا تو اس نے چیخ ہی مار دی۔

''کیا! یہ ہے میری عیدی؟۔ سدھر جائیں ارقم نہیں تو اپنی اور آپ کی جان ایک کر دوں گی۔'' دھمکی آمیز لہجے میں کہتے ہوئے باقاعدہ اسے گھورا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

''میری جان آپ سے الگ نہیں محترمہ!'' بیوی کو محبت پاش نظروں سے دیکھ کر کہتے ہوئے اس نے اپنی جیب سے ایک ڈبیا نکال کر اس کی طرف بڑھائی تو وہ حیران ہی رہ گئی۔ یہ وہی جڑاؤ کڑے تھے جو اسے کچھ دن پہلے ایک دکان پر بہت پسند آئے تھے۔ گولڈ کے ڈیزائن والے یہ آرٹیفیشل کڑے بہت مہنگے تھے۔ وہ انہیں خرید نہ سکی تھی۔ بہت بھاؤ تاؤ کے باوجود دکاندار پیسے کم کرنے پر راضی نہیں ہوا تھا۔

''اف یہ کڑے۔ آپ کو یاد تھے ارقم!'' خوشی اور حیرت اس کے لہجے سے چھلک رہی تھی۔ ارقم

نے اس کے مسرت سے چمکتے چہرے کو دیکھا تو خود بھی مسکرا دیا۔

"جی جناب۔"

"مگر یہ تو بہت مہنگے تھے۔ دکان دار ایک پیسہ کم نہیں کر رہا تھا۔ آپ کو کتنے کے دیے اس نے؟" خوشی کے ساتھ ساتھ اسے فکر بھی سوار ہوئی۔

"اتنے کے ہی جتنے تم نے دام لگائے تھے۔ اس دن اس بھلے دکاندار نے میرے ہی اشارے پر قیمت کم نہیں کی تھی۔ یہ میں تمھارے لیے لینا چاہ رہا تھا۔" ارقم نے بتایا تو وہ اس کی چالاکی پر حیران ہونے کے ساتھ ساتھ بے انتہا خوش بھی ہوئی۔ ارقم نے اپنے ہاتھ سے اسے کڑے پہنائے تو عید کا رنگ ہی دوبالا ہو گیا۔

خوشی اور سنگھار نے اس کے چہرے پر رنگ ہی رنگ بکھیر دیے تھے۔ وہ تیار ہو کر جس وقت صبوحی کے گھر جانے کے لیے نکلی۔ بے انتہا خوش تھی۔

"صبوحی کو پتا ہے کہ تم آ رہی ہو اس کی طرف؟" راستے میں ارقم نے سوال کیا تھا۔

"نہیں۔ میں اچانک جا کر اسے سرپرائز دوں گی۔" وہ خوش دلی سے بولی تھی۔

"دیکھ لو کہیں تمھیں ہی نہ سرپرائز مل جائے وہاں پہنچ کر۔ عید والے دن اکثر لوگ گھر پر نہیں ہوتے۔ رشتے داروں سے ملنے یا گوشت تقسیم کرنے چلے جاتے ہیں۔" ارقم نے سنجیدگی سے کہہ کر اسے ڈرایا تو وہ چڑ گئی۔

"افوہ۔ مجھے ہولائیں مت آپ۔ ان شاء اللہ ایسا نہیں ہوگا۔" ارقم کے خدشے پر اس کا دل خوف زدہ ہو گیا تھا۔ نروٹھے پن سے بولی تو جواباً ارقم محض مسکرا کر چپ ہو گیا۔ شہر کے پوش علاقے میں بنا یہ گھر مکینوں کی مالی آسودگی کا کھلا ثبوت تھا۔ گیٹ پر چوکیدار نے بتایا کہ صبوحی گھر پر ہے تو اس کی جان میں جان آئی۔

"میں گھنٹہ ڈیڑھ میں آپ کو کال کر کے بلا لوں گی۔ تب تک آپ ابرار بھائی سے عید ملنے چلے جائیں۔" اس نے ارقم کے ماموں زاد بھائی کا نام لے کر کہا جو اگلے بلاک میں رہتے تھے۔ جواباً ارقم نے تائید میں سر ہلایا تو وہ خوشی خوشی اندر کی طرف بڑھ گئی۔ ملازم اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر، گھر کے مکینوں کو مطلع کرنے گیا تو وہ وہیں بیٹھ کر خوبصورتی سے سجے ڈرائنگ روم کی ڈیکوریشن کو مرعوبیت سے دیکھنے لگی۔

انتظار کے چند لمحوں کے بعد دروازے سے صبوحی کے بجائے، اس کی ساس کو اندر آتا دیکھ کر وہ کچھ بدمزا سی ہو کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ان کی طنزیہ گفتگو ہمیشہ اس کی طبیعت مکدر کرتی تھی۔ انہیں صبوحی سے بہت اختلاف رہتا تھا۔ جس کا اظہار وہ آئے گئے کے سامنے کرنے سے بھی گریز نہیں کرتی تھیں۔

"السلام علیکم آنٹی! عید مبارک کے ساتھ ساتھ پوتی کی بھی بہت مبارک باد۔" وہ اپنی بدمزگی تبسم کے پیچھے چھپا کر اٹھی اور ان سے عید ملتے ہوئے مبارک باد دی۔

"وعلیکم السلام۔ خیر مبارک طوبیٰ! آج بڑے دنوں بعد شکل دکھائی تم نے۔" ساس صاحبہ خوش دلی سے کہتی سامنے رکھے صوفے پر براجمان ہوئیں۔ ان کا لہجہ ہمیشہ کی طرح کچھ طنزیہ تھا۔ ان کے اسی رویے کی وجہ سے وہ شاذ و نادر ہی صبوحی کے گھر آتی تھی۔

"بس آنٹی! بچوں کی وجہ سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ مگر اس بار صبوحی نے خوش خبری ہی ایسی سنائی کہ مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں تو مٹھائی کی منتظر تھی۔ ماشاء اللہ سے بیٹی ہوئی ہے اس کی۔"

"بیٹی کی پیدائش پر بھلا کون مٹھائی بانٹتا ہے طوبیٰ! شادی کے پانچ سال بعد بیٹی کا تحفہ دیا ہے تمھاری سہیلی نے۔ ہاں اگر بیٹا ہوتا تو اور بات تھی۔ میں اصلی گھی والے لڈو بانٹتی۔" صبوحی کی ساس کے

لہجے ہی نہیں چہرے سے بھی تاسف جھلک رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں جھلا کر رہ گئی۔ اتنے سالوں بعد اللہ نے ان کے گھر رحمت اتاری تھی مگر انہیں شکر نصیب نہیں تھا۔

"اگلی بار ان شاء اللہ بیٹا بھی آجائے گا آنٹی!" اس نے مصنوعی مسکراہٹ بہ امر مجبوری ہونٹوں پر سجا کر کہا۔ اسے یاد تھا کہ اس کی دوسری بیٹی حمنیٰ کی پیدائش پر بھی اماں بیگم نے پورے خاندان میں مٹھائی بھجوائی تھی۔ وہ یسریٰ اور حمنیٰ کو اپنی جان سے لگا کر رکھتی تھیں۔

"ہاں! اب دیکھیں کہ وہ اگلی بار کب آتی ہے؟ پانچ سال بعد تو یہ دن آیا تھا۔" ان کی بیزاری نے طوبیٰ کا دل بھی اچاٹ کر دیا۔ دل چاہا وہاں سے نکل بھاگے۔

"اولاد کے معاملے میں تم دونوں دوستوں نے ایک جیسی قسمت پائی ہے۔" وہ طنز سے کہہ رہی تھیں۔

سبکی کے شدید احساس نے طوبیٰ کی صبیح رنگت کو سرخ کر ڈالا۔

"بیٹیاں بہت پیاری ہوتی ہیں آنٹی!۔" نا چاہتے ہوئے بھی وہ دفاعی انداز اختیار کر گئی تھی۔

"بیٹیاں پیاری ہوتی ہیں مگر وہ بیٹوں کی طرح سہارا نہیں بن سکتیں بچے! جب تم اور ارقم میاں بوڑھے ہونے لگو گے تب یہ باتیں تمھاری سمجھ میں آئیں گی۔" ساس صاحبہ نے بنا مروت اسے سنا ڈالیں تو وہ لب بھینچ کر بمشکل خود کو بہت کچھ کہنے سے روک پائی۔

"بہرحال تم اوپر چلی جاؤ۔ بہو بیگم ابھی تک اپنے کمرے میں ہی ہیں۔ عید والے دن بھی انہیں سونے سے فرصت نہیں تھی۔" صبوحی کی ساس ہمیشہ کی طرح بھری بیٹھی تھیں۔ اس نے گفٹ اور گوشت کا شاپر اٹھایا اور تیزی سے لاؤنج کی طرف بڑھ گئی۔ مبادا وہ مزید زہر اگلنا شروع کر دیں۔

مگر اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف آتے ہوئے اوپری منزل سے آتی، جھگڑے کی ہلکی ہلکی آوازوں نے اس کے قدم سست کر دیے۔ صبوحی اور اس کا شوہر رضا کسی بات پر بحث یا جھگڑا کر رہے تھے۔ طوبیٰ کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں ابھرنے لگیں۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ وہ صبوحی سے ملنے اوپر جائے یا نہ جائے۔

"چلی جاؤ اوپر۔ شاید تمھیں دیکھ کر ہی تمھاری سہیلی کچھ شرم کر لے۔ آج عید والے دن بھی اسے لڑنے سے فرصت نہیں۔" وہ متذبذب سی کھڑی ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ عقب سے، صبوحی کی ساس کا سرد لہجہ سنائی دیا تو وہ، قصور وار نہ ہوتے ہوئے بھی ندامت سے نظریں چرا کر اوپری منزل پر چلی آئی۔

"کم از کم آج کے دن تو لڑنے سے باز آجاؤ رضا!" صبوحی کی غصے سے بھری آواز کمرے سے باہر بھی با آسانی سنائی دے رہی تھی۔

"میں باز آجاؤں اور تم اسی طرح زبان چلاتی رہنا فضول عورت!" رضا کا غصہ آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔ "جب دیکھو پیسوں کے لیے جھگڑا کھڑا کرتی رہتی ہو۔ آخر کرنا کیا ہے تمھیں اتنے پیسوں کا۔"

"یہ تم مجھ سے پوچھ رہے ہو رضا! اپنی عیاشیوں پر خرچ کرتے وقت تو کبھی نہیں بتایا تم نے کہ تم اتنا بڑا اماؤنٹ کہاں اڑا آتے ہو۔" صبوحی کی تلخ آواز، طوبیٰ پر حیرت کے پہاڑ توڑ رہی تھی۔

یہ وہ صبوحی تھی جو ہمیشہ کہتی تھی کہ رضا اس کی ذرا ذرا سی خواہش پر اپنی جان چھڑکنے کو تیار رہتا ہے، اس کے قدموں تلے اپنی ہتھیلیاں بچھاتا ہے۔ مگر اس وقت وہ دونوں جس طرح لڑ رہے تھے، جو زبان آپس میں استعمال کر رہے تھے، اس سے ان دونوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت کا اندازہ اسے بخوبی ہو رہا تھا۔

یہ وہ جوڑا تھا جس پر وہ رشک کیا کرتی تھی جن کی مثالیں دے کر ارقم سے شاکی رہتی تھی۔ جن کے

بار بے میں سوچ سوچ کر وہ اپنی زندگی سے نالاں ہوگئی تھی۔ ہر بار رضا کا مقابلہ ارقم سے کرنے کی وجہ سے اس کے دل میں صرف شکوے ہی پیدا ہوتے تھے۔

"بکواس مت کرو! میں تمھیں جواب دینے کا پابند نہیں۔ یہ میری کمائی ہے اور اب میں تمھیں اپنی اُس مڈل کلاس دوست طوبیٰ پر امارت کا رعب ڈالنے کے لیے اپنی محنت کی کمائی برباد کرنے کی اجازت ہرگز نہیں دوں گا۔" رضا کا لہجہ یک دم آنچ دینے لگا تھا۔

طوبیٰ کے بڑھتے قدم یک دم ٹھٹکے تھے۔ بھلا میاں بیوی کی لڑائی میں اس کا کیا ذکر تھا۔ رضا کے حقارت آمیز انداز پر اسے سخت توہین محسوس ہوئی۔

"یہ پیسہ صرف تمھارا نہیں ہے رضا! میرا اور میری بیٹی کا بھی برابر کا حق ہے اس پر۔ رہ گئی میری دوستوں کی بات تو تمھیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے کہ میں ان پر کیوں پیسہ خرچ کرتی ہوں۔" صبوحی کا لہجہ بھی تلخی لیے ہوئے تھا۔

"مجھے فرق پڑتا ہے صبوحی بیگم! کیونکہ یہ میری کمائی ہے۔" رضا نے ایک بار پھر صبوحی کو اپنی کمائی کا طعنہ دیا۔ تو اسے ارقم کا رویہ یاد آیا۔ کبھی کبھی وہ زیادہ پیسے بھی خرچ کر ڈالتی تھی، مگر یہ جملہ اسے آج تک سننے کو نہ ملا کہ وہ کمائی چونکہ ارقم کی ہے اس لیے اس کا کوئی حق نہیں۔ بلکہ وہ کتنے دھڑلے سے فرمائشیں کرتی تھی۔ اور پوری نہ ہونے پر خفا بھی ہو جاتی تھی۔

"اچھی طرح پتا ہے مجھے کہ تم اپنی دوستوں خاص کر طوبیٰ پر محض اس کو احساس کمتری میں مبتلا کرنے کے لیے خرچ کرتی ہو۔ جنون ہے تمھیں دوسروں پر حاوی رہنے کا۔ اور وہ احمق لڑکی تمھارے ہاتھوں بے وقوف بنتی رہتی ہے۔"

"وہ احمق لڑکی ارقم حسن جیسے بندے کی بیوی ہے رضا۔ جو اسے سر آنکھوں پر بٹھاتا ہے۔ اس کی کڑوی کسیلی بات سن کر بھی سخت کلامی نہیں کرتا۔ تم سے کتنا اچھا ہے وہ اور ایک تم ہو......"

صبوحی کے لیے رضا کی زبان سے اتنا سچ سن کر ہضم کرنا آسان نہ تھا۔

"میں جیسا بھی ہوں تم سے بہتر ہوں تم تو اپنی دوست کی بھی دوست نہیں۔ اسے اپنے شوہر اور زندگی سے نالاں کرنے کے لیے کیا نہیں کیا تم نے آج تک۔ تمھیں کیا لگتا ہے کہ مجھے کچھ نظر نہیں آتا صبوحی بیگم!" رضا یک دم غضب ناک ہو کر دھاڑا تو باہر کھڑی طوبیٰ کے لیے ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔

وہ کسی سیلابی ریلے کی مانند صبوحی کے کمرے کی طرف بڑھی تھی۔ اس کی پیہم جارحانہ دستک پر اندر سے آتی آوازیں فی الفور تھم گئیں۔ اور پھر یک دم دروازہ کھلا تو صبوحی اسے سامنے پا کر حیران رہ گئی۔

"تت۔ تم طوبیٰ۔ تم یہاں؟" صبوحی سمیت رضا بھی اس کی اچانک آمد سے زیادہ اپنے الفاظ پر فکرمند اور پریشان ہوا۔ پتا نہیں اس نے کیا کیا سنا تھا۔

"عید مبارک صبوحی! عید مبارک رضا بھائی۔" گہری متاسف نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے طوبیٰ نے مضبوط لہجے میں ان دونوں کو مبارک باد دی تو وہ یک دم پرسکون ہو کر مسکرا دیے۔

"تمھیں بھی عید مبارک طوبیٰ! تم نے مجھے بتایا نہیں کہ تم آج آنے والی ہو۔ کم از کم میں کچھ تیاری تو کر لیتی۔ دیکھو نا کیسے سر جھاڑ منہ پہاڑ کھڑی ہوں۔" صبوحی نے تیزی سے اپنے چہرے پر خوشی سجاتے ہوئے اپنائیت سے کہا تو طوبیٰ بمشکل اپنی برہمی اور بے زاری چھپا سکی۔

"بس تمھیں سرپرائز دینا جو مقصود تھا۔ اچھا ہوا جو میں آج بنا بتائے آ گئی، ورنہ مجھے ساری زندگی اپنی حیثیت کا پتا ہی نہ چلتا۔ میں ہمیشہ اس گمان میں رہتی کہ تم میری سب سے اچھی دوست ہو۔ بہت شکریہ تم نے مجھے اس جھوٹے بھرم سے نکال لیا صبوحی!" وہ جب بولی تو دکھ نا چاہتے ہوئے بھی اس

کے لہجے سے جھلکنے لگا تھا۔ صبوحی اور رضا کے چہرے یکلخت ندامت سے سرخ ہوئے۔ وہ دونوں کچھ بول ہی نہ سکے۔

''تم نے ہمیشہ مجھے بہت مہنگے تحائف دیے صبوحی! میری حیثیت سے بڑھ کر عطا کیا مگر آج حقیقت پر سے پردہ اٹھا کر، تم نے مجھے سب سے قیمتی ہدیہ دیا ہے۔ تم نے واقعی میری عید کا مزہ دوبالا کر دیا۔ میں تاعمر تمھاری شکرگزار رہوں گی۔ بدلے میں یہ کچھ تحائف ہیں اور میری دعا ہے کہ اللہ تمھیں ''ایسی'' ہزاروں عیدیں دیکھنا نصیب کرے۔ آمین۔'' گہری طنزیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے تحائف کا شاپر کمرے کی دہلیز پر رکھ کر وہ پلٹی تو رکی نہیں۔ آنکھوں میں ڈھیروں آنسو اور دل میں دوست کی بے وفائی کا درد لیے صبوحی کے گھر سے نکلتی چلی گئی۔

''اف یہ سب کیا سنا میں نے میرے اللہ! میری اتنی پیاری دوست اور مجھ سے حسد۔۔۔'' نا چاہتے ہوئے بھی آنسو ابل پڑنے کو بے تاب تھے۔ وہ بغیر کچھ سوچے سمجھے روڈ پر آ گئی تھی۔ عقب سے ہارن کی آواز پر یک دم مڑ کر دیکھا۔ وہ ان کی ہی کار کا ہارن تھا۔ ارقم کار میں وہیں موجود تھا اس کا منتظر۔ گویا وہ گیا نہیں تھا۔ شدید گرمی میں اسے کار میں اپنا منتظر بیٹھا دیکھ کر طوبیٰ کو پشیمانی نے آلیا۔ صبح فجر کی وقت سے جاگا ارقم قربانی کی بھاگ دوڑ کے بعد محض اس کی خوشنودی کی خاطر یہاں گرمی میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔

''ارقم آپ گئے نہیں ابرار بھائی کی طرف۔'' وہ آنسو آنچل سے صاف کرتی کار میں آبیٹھی اور چھوٹتے ہی سوال کیا۔

''عید کے دن تمہارے بغیر کہیں جانے کو دل نہیں مانا اس لیے نہیں گیا۔ آج تو نہا وغیرہ کر مر رہا ہوں رہی ہیں کل ساتھ چلیں گے ان شاء اللہ۔ مگر تم اتنی جلدی کیسے واپس آ گئیں؟'' اس کے بیٹھتے ہی ارقم نے کار اسٹارٹ کر کے اے سی آن کر دیا تھا۔ جانتا تھا کہ اس وقت گرمی سے اُس کا حال برا ہے۔

''جلدی کہاں۔ مجھے تو واپس آنے میں کافی دیر ہو گئی۔ مجھے تو بہت پہلے لوٹ آنا چاہیے تھا۔'' ارقم کے سوال پر وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی تو ارقم نے اس کے چہرے کو بغور دیکھا۔ جس کی آنکھوں سے اداسی چھلک رہی تھی۔

''طوبیٰ! کیا بات ہے؟ سب ٹھیک ہے۔''

''اب ٹھیک ہے۔'' آنکھوں میں آئی نمی دھکیل کر وہ یک دم ہنس پڑی تھی۔

محبت اور سرشاری سے ارقم کی طرف دیکھتی طوبیٰ حسن کی آنکھوں میں ہی نہیں دل میں بھی اجالا اتر آیا تھا۔

''الحمد للہ میرے رب! تو نے مجھے کتنا اچھا ساتھی عطا کیا ہے کہ ایک جہاں مجھ پر رشک کرتا ہے اور میری دوست مجھ سے حسد۔'' دل ہی دل میں سوچتی وہ گہری نظروں سے ارقم کو دیکھ رہی تھی۔ جس پر وہ کچھ چونک گیا تھا۔

''خیریت بیگم صاحبہ! ایسی میٹھی نظروں سے دیکھ رہی ہیں۔ کیا مزید کوئی فرمائش پوری ہونے سے رہ گئی ہے؟'' شوخ لہجے میں کہہ کر ارقم نے اسے چھیڑا مگر ہر بار کی طرح وہ ناراض نہیں ہوئی۔ اور یک دم اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ کر مسکرا دی۔

''ہاں۔ ایک فرمائش اور ہے۔ وہ یہ کہ آپ ساری زندگی میرے ساتھ ایسے ہی رہیں گے۔ میری غلطیوں اور کوتاہیوں کو ایسے ہی اعلیٰ ظرفی سے معاف کرتے رہیں گے۔ کیسے پوری کریں گے یہ فرمائش بھی؟'' وہ پوچھ رہی تھی۔

''کرنی تو پڑے گی ہی۔ بقول آپ کے طوبیٰ حسن کے ساتھ زندگی گزارنا آسان جو نہیں۔'' اس کی بات اسی کے انداز میں دہراتے ہوئے ارقم، اسے بے اختیار ہنسنے پر مجبور کر گیا۔ اور وہ اسے دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔

بس کہ آج روزِ سعید ہے
تیری دید ہی میری عید ہے

☆

سمیرا حمید

مُشکِ یام

پانچ بھائیوں کے بعد پیدا ہونے والی چراغ اپنے بھائی بہرام کی چہیتی ہے، چچی کی لاڈلی، بہت منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہوئی۔ اس کی شرارتوں سے بہرام حویلی کے سارے مکین عاجز تھے۔

بہرام کو اپنی لاڈلی بہن چراغ سے جتنی محبت ہے، بیوی سے اتنا ہی دور ہے۔ اس نے سختی سے تاکید کر رکھی تھی کہ چراغ کو کچھ نہ کہا جائے۔ اس کو ذاتی وکٹوریہ بھی دلوادی تھی۔ جس پر سوار ہو کر وہ شہر میں ہواخوری کے لیے نکلتی تھی۔ ایک دن اس سے ایک نوجوان ٹکراتا ہے۔

وہ نوجوان جس کا نام شمس ہے، شاہی مسجد کے امام صاحب کا بیٹا ہے۔ شاہی مسجد حویلی کے سامنے ہے۔

چراغ کی شرارتوں سے حویلی کے سارے مکین تنگ ہیں وہ کسی کا خاطر میں نہیں لاتی۔ حسن اور دولت کے نشہ نے اس کے مزاج کو دو آتشہ کر دیا ہے۔

چراغ کے بھائی نے اسی نوجوان کی پتنگ کاٹی تو وہ رات کو اپنی پتنگ لینے آ گیا۔ اس وقت چراغ وہ پتنگ اڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ دونوں میں تکرار ہوئی۔ شمس کو اپنی زیادتی کا احساس ہوا تو وہ دریا کنارے پر معافی مانگنے آیا۔

چراغ اس سے کہتی ہے کہ سامنے جو شیش محل ہے، وہ اس کا گھر ہے۔ وہاں آ کر معافی مانگے تب وہ معاف کرے گی۔



شمس شیش محل میں جاتا ہے تو وہاں قید کرلیا جاتا ہے۔ اسے شدید اذیتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مولوی صاحب جنہیں شمس کی ماں سے عشق تھا، اس کی وفات کے بعد دنیا تیاگ دی تھی۔ شمس کے غائب ہونے سے نیم دیوانے

مکمل ناول



ہو گئے۔ یہ ان کی دعا تھی کہ شمس زندہ بچ گیا۔

چراغ کی منگنی اپنے خالہ زاد سے ہو چکی ہے، وہ اسے اوٹ پٹانگ خط لکھتی ہے تو اماں بی اس پر خفا ہوتی ہیں۔

شمس بازار جاتا ہے تو وہاں محبوب جان کو دیکھا جو خطوط نویسی کرتا ہے۔

شمس خط لکھواتا ہے۔ محبوب خان خط لکھنے کے ساتھ پہنچانے کے بھی دام مانگتا ہے لیکن وکٹوریہ کا نام سنتے ہی منع کر دیتا ہے۔ شمس دام بڑھا دیتا ہے اتنے پیسے دیکھ کر محبوب خان سکے اٹھا کر رکھ لیتا ہے۔ کئی دن انتظار کے بعد وکٹوریہ نکلتی ہے وہ اس کے پیچھے بھاگتا ہے۔ اور خط ڈال کر بھاگ جاتا ہے۔

خط پڑھ کر چراغ سمجھ جاتی ہے اور خاص ملازم سے معلوم کرتی ہے وہ بتا دیتا ہے کہ محبوب خان کوچہ جب میں بیٹھ کر خط لکھتا ہے۔ اسے بلا کر معلوم کرتی ہے اور اس سے جوابی خط لکھواتی ہے۔

اماں کو بتاتی ہے کہ فرہاد منگیتر کو خط لکھواتا ہے۔ امام صاحب کے ہاں شمس کی شکایت کرنے جاتی ہے وہاں ان کی جگہ شمس سے ملاقات ہوتی ہے۔ مسجد سے جوابی خط آتا ہے کفایت اماں کے پاس لے جاتی ہے چراغ کی لاکھ کوشش کے باوجود اماں خط حور سے پڑھوا لیتی ہیں۔ کوچوان بتا دیتا ہے کہ چراغ مسجد گئی تھی۔

چراغ شمس کو چیلنج کرتی ہے کہ ہمت ہے تو حویلی آ کر سلام کرو۔ شمس امام صاحب سے کہتا ہے کہ اسے حویلی میں نوکری کرنی ہے۔ امام صاحب بیرام سے کہتے ہیں بیرام اسے باغ کی دیکھ بھال کے لیے رکھ لیتا ہے حویلی والے پریشان ہو جاتے چراغ فرہاد کو نسبت ختم کرنے کی دھمکی دیتی ہے۔

چراغ سمجھ جاتی ہے کہ دیواروں پر اس کی تصویر شمس نے بنائی ہے۔ وہ رات میں اس کا دماغ ٹھیک کرنے جاتی ہے۔ شمس اسے کہتا ہے کہ وہ اس کی شکایت کر دے گا۔ وہ شمع دان شمس کے سر پر مارنا چاہتی کہ کوئی چراغ کا نام غصہ سے لیتا ہے وہ دھک سے رہ جاتی ہے۔

چچی چراغ سے خفا ہوتی ہیں چراغ عہد کی انگوٹھی پہنا کر انہیں اپنا بنا لیتی ہے۔ چراغ ہر ممکن حربہ آزماتی ہے پاک دامن کی شادی میں جانے کا۔ بیمار بن گئی کھانا پینا چھوڑ دیا۔ لیکن سب بے اثر رہا وہ آخری چال چالتی ہے کشتی رانی کے لیے سب کو لے جاتی ہے۔ ملازمین کے ساتھ شمس بھی جاتا ہے۔ وہ کفایت کو سیب سر پر رکھ کر نشانہ لینے کا کہتی ہے وہ نہیں مانتی۔ چراغ کی نظر شمس پر پڑتی ہے وہ اسے کھڑا کر دیتی ہے اور سیب کے بجائے اس کے سر کان آنکھ کا نشانہ لیتی ہے۔ اس سے فارغ ہو کر وہ سیر کو آگے جاتی ہے پرندوں کو کمان سے پتھر مارتی ہے کتے نظر آتے ہیں ان کو بھی مارتی ہے وہ اس کے پیچھے لگ جاتے ہیں دریا میں بمشکل کودتی ہے شمس اس کی جان بچاتا ہے۔ چراغ کا شادی میں جانے کا خواب پورا ہو جاتا ہے۔

خبر ملتی ہے کہ لاہور سے سامان لے کر ملازم آیا ہے۔ چراغ رات کو چھت پر ٹہلتے ہوئے لکھنؤ کی روشنیاں دیکھ رہی تھی کہ کوئی اس کے سامنے گھڑیال سے کودتا ہے۔

ساتویں قسط

آنکھوں کی دھند بھی دل میں اتر گئی۔ دل دھندلا گیا۔ چراغ نے ہر شے کو غیر موجود پایا، اس کا جی چاہا کہ وہ بھاگ جائے۔ جبکہ ہنستے ہنستے شمس کی آنکھیں اتنی نم ہو چکی تھیں کہ اسے انگلیوں سے مسلنا پڑیں۔ وہ یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔

”میں تم سے صرف ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔“ اس نے انگلی اٹھا کر ایک کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”پوچھو.....“ بے ساختہ اجازت دے دی۔

”تم ایسی کیوں ہو چراغ؟“

ایک ساعت خاموشی اور پھر سے اس کے وہی قہقہے۔ وہ گنوار ہی تھا، گنواروں کی طرح حلق پھاڑ رہا

تھا۔ اگر یہ اس کے ہنسنے کھیلنے کے دن تھے تو وہ سارے دن چراغ کے ساتھ گزار رہا تھا۔ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں بچوں کی طرح مسلا۔ اسے جواب نہیں چاہیے تھا، وہ صرف ہنسنا چاہتا تھا۔ اس کے دل کی تکلیف جاتی رہی ہو گی، اب نئی تکلیف لینے آیا ہو گا۔

''کیسی ہوں میں؟'' چراغ نے پوچھ لیا۔ کیا وہ بات کو طول دینا چاہ رہی تھی۔ وہ دھم دھم کرتی واپس کیوں نہیں چلی جاتی۔

اس نے ایک گہرا سانس کھینچا۔ قہقہوں سے چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں شرارت کی مشعلیں بھڑک رہی تھیں۔

''تم نہیں جانتیں، اس دیوانے کے ساتھ کیا ہوا، وہ کئی دن بے قابو رہا تھا، اسے باندھ کر رکھا گیا تھا۔ تمہارے طیش میں اس نے کئی دوسرے لوگوں کو زخمی کر دیا۔ تمہاری صورت اسے ہر طرف دکھائی دیتی تھی، وہ ہر ایک کی طرف لپکتا تھا۔ یہ قصہ بازار میں عام ہو چکا ہے کہ کسی لڑکی نے اسے پتھر مارے، یہ بھڑک گیا۔ وہ لڑکی کون تھی، یہ کوئی نہیں جانتا، لیکن میں اس لڑکی کو جانتا ہوں۔ جانتا ہوں کہ وہ تم ہو اور یہ صرف تم ہی کر سکتی تھیں۔''

''ہاں صرف میں ہی یہ کر سکتی تھی۔'' اس کے سوال کا جواب دیا۔

''کیونکہ ایک صرف تم ہی اتنی بے حس اور سنگ دل ہو۔ یہ حوصلہ تم میں ہی ہے کہ ہر بہانے سے تکلیف پہنچا کر دم لو۔''

چراغ کی نظر دھندلا گئی۔ ''یہ حوصلہ صرف مجھ میں ہی ہے۔'' آنکھیں نم ہونے لگیں، وہ رو دینے کو ہوئی۔

''کرنے کے بعد بھاگ گئی کیوں تھیں؟ خنجر کے وار سے ڈر گئی تھیں، جم کر کھڑی رہتیں وہیں۔'' وہ محظوظ ہو رہا تھا۔

''تم تھے نا وار کھانے کے لیے..... تمہاری جان نچھاور کرنے کے لیے ہی ہے۔'' غیر محسوس انداز میں آنکھیں رگڑ کر زعم سے کہا۔

وہ سر ہلا کر دیکھتا رہا کہ تمہاری شوخی ابھی بھی کم نہیں ہوئی۔

''تم سمجھتی ہو کہ دنیا کے تمام انسان ناکارہ ہیں، وہ تم پر اپنی جانیں نچھاور کرنے کے لیے مرے جا رہے ہیں۔ ہم کسی عزیز کے لیے جان دیتے ہیں، یا کسی عزیز کے لیے جان لیتے ہیں، تمہارے معاملے میں تمہاری جان تو لی تو جا سکتی ہے لیکن تمہارے لیے دی نہیں جا سکتی۔'' اس نے صاف جتا دیا۔

''میری جان لو گے؟''

''اصول اور قاعدہ یہی ہے کہ تم جیسے لوگوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے۔'' ہنس کر سفاکی سے کہا۔

اس کے کانوں سے دھواں نکلنے لگا۔ اتنے سخت الفاظ۔ اتنا زیادہ سچ۔ اتنی بے مروتی۔

''کون ہو تم جس کی لمبی زندگی کی دعا کی جائے، ورنہ کوشش ہی کر لی جائے؟'' وہ تمسخر سے ہنسا۔

''تو کیوں آئے تھے دیوانے کے خنجر کے آگے۔''

شاہجہان کے تاج کا عکس دریا میں لہرا رہا تھا۔ یہ دونوں کنارے سے ذرا دور پھولوں کے ڈھیر کے قریب آمنے سامنے کھڑے ہیں۔ دور خیموں میں مشعلیں روشن ہونے کا وقت ہوا جاتا ہے۔ رات کے انتظام میں ان کے خادم بھاگے دوڑے پھرتے ہیں۔ ایک چراغ شمس کی آنکھوں میں روشن تھا۔ ایک چراغ سامنے کھڑا بھڑک رہا تھا۔

''جواب دو..... کیوں آئے تھے دیوانے کی خنجر کی نوک کے نیچے.....''

وہ خاموش رہا۔ یہ تو صاف تھا کہ وہ جواب تراشنے میں مصروف نہیں تھا، وہ سامنے والی کے بھڑکنے پر محظوظ ہو رہا تھا۔

''کیوں پیش کیا تھا اپنا دل، کیوں ہوئے زخمی ..... کیوں دل پر وار کھایا؟''

پتا نہیں اسے جواب چاہیے تھا یا تسلی۔ کبھی

استہزائیہ ہنس دیتی کبھی لب سکیڑ لیتی۔ آنکھوں کی کمان بلند تھی۔ دل پر وار کھانے والے کی طرف سے جواب نہ آیا تو اسے جتاتی نظروں سے گھور کر وہ تکبر سے پلٹی اور خیموں کی طرف بڑھ گئی۔

''کیونکہ میں نہیں چاہتا، کوئی اور تمہیں مارے، یہ کام صرف میں کرنا چاہتا ہوں۔''

اس کی آواز سرد تھی، بالکل ٹھنڈا کر دینے والی۔

چراغ کو ہر بات کی توقع تھی سوا اس ایک بات کے۔ وہ بے اختیار گھوم کر اسے دیکھنے لگی۔

''تمہیں اپنے بارے میں بہت سی خوش فہمیاں ہیں، جلد دور ہو جائیں گی۔'' کچھ دیر پہلے وہ قہقہے لگا رہا تھا، اب دھمکا رہا تھا۔

''میری حیثیت ہے کہ میں خوش فہمیاں رکھوں۔'' اس نے زیر لب خود سے کہا۔

اب وہ پشت دکھا کر چلا گیا۔ اس کی چال میں تندی تھی۔ وہ سخت گیر تھا۔ وہ نرم دل تھا۔ وہ دل والا تھا، وہ آتش گیر تھا۔ وہ کون تھا۔

چراغ نے جھنجلا کر پھولوں کے ڈھیر میں ہاتھ مارے کہ شاید کوئی وزنی چیز ہاتھ آئے کہ وہ اس کی پشت پر دے مارے، لیکن بس پھول ہی ہاتھ آئے۔ کیا پھول ہی دے مارے؟ ایک دیوانے کو پتھر مارے تھے، دوسرے کو پھول مار کر حساب برابر کر دے۔

دور سے وہی دیوانہ جو مزدور تھا، آتا ہوا دکھائی دیا۔

وہ جانتی تھی وہ دیوانہ نہیں ہے پھر بھی ڈر کر تیز تیز قدم اٹھاتی اپنے خیموں کی طرف جانے لگی۔ اس مزدور کو بھی آوارہ گردی سے فرصت نہیں تھی، جہاں دیکھو، دکھائی دے رہا ہے، کیا سارا ہندوستان ہی دیوانہ ہو گیا۔ بال نہیں سنوارتا، منہ نہیں دھوتا، لباس گرد آلود رکھتا ہے، کیا حال سنوارنے کی فرصت نہیں رہی۔ تیز تیز چلتی بڑبڑانے لگی۔

☆☆☆

''میرا اتا پتا نہیں رکھ سکتی کہ میں کہاں ہوں۔'' جا کر کفایت کے شانے پر ہاتھ مارا۔

''آپ کہاں تھیں۔'' وہ امردو کھا رہی تھی۔ وہی چچی کا کہنا کہ جانوروں کی طرح جگالی کرتی ہے۔

''جہنم میں......''

''وہ میں پہلے سے جانتی تھی، اسی لیے پیچھے نہیں آئی۔'' وہ دانت نکال رہی تھی۔

''نصیر کو بلا کر لاؤ......فوراً......'' وہ چلائی۔

نصیر آیا، سر جھکا کر خیمے کے باہر کھڑا ہو گیا۔ وہ تن فن کرتی باہر نکلی۔

''یہ تم کسے اپنے ساتھ لائے ہو۔ اسی لمحے واپس لوٹ جاؤ، مجھے تمہاری شکلیں نہیں دکھائی دینی چاہئیں۔''

نصیر ہکا بکا سر ہلاتا رہا۔ اسے تو دیکھ نہیں سکتا تھا، کفایت کو ہی دیکھنے لگا کہ آخر ایسا کیا ہو گیا۔ اس کے پاس کیا ہوائی گھوڑا ہے کہ وہ نکالے اور غائب ہو جائے۔ چراغ کے مزاج سے واقف تھا لیکن اب آگرہ سے کہاں جائے، کالا پانی نکل جائے۔

''ہوا کیا ہے......'' کفایت نے آواز دھیمی رکھ کر کان کی طرف جھک کر پوچھا۔

''تم دور ہو جاؤ۔ میرے کام میں ٹانگ نہ اڑایا کرو، میں نے کہا، اسے ساتھ لو اور یہاں سے جاؤ، لاہور پہنچو، لکھنو میں بھی تمہاری شکلیں دکھائی نہیں دینی۔ کہیں چلے جاؤ، مجھے یہاں دکھائی نہیں دینے چاہئیں۔''

اسی خیمے کے غالیچے پر دہلی والی بہن بیٹھی بچے کے کپڑوں کو تہہ کر رہی تھی۔ بے چاری سہم گئی۔ آگرہ کا سفر بہت اچھا رہا تھا، لیکن اب یہ اچانک کیا ہو گیا۔ ایسا نہ ہو چراغ انہیں بھی چلتا کرے۔ بلکہ پورا قافلہ ہی روانہ کر دے، ابھی تو انہیں سکون کا دم آیا تھا۔ ورنہ وہی گھر ہو گا، چار دیواری اور ان کے روز و شب۔ کون انہیں آگرہ لائے گا، کہاں تاج محل کی چاندنی میں قصے کہانیاں ہوں گی۔

''کیوں اتنا غصہ کر رہی ہو چراغ!'' آبنوس

ان تینوں کے درمیان آکر کھڑی ہوئی۔

"انہیں واپس جانے کے لیے کہہ رہی ہوں۔" اس نے مشکل سے اپنی سانس کی درستی کی۔

"ایسے افراتفری میں۔"

"یہ آغائی کے ملازم ہیں، آغائی کو ضرورت ہو گی۔" پوری کوشش کی کہ آواز سے سمجھداری ظاہر ہو طیش نہیں۔

آبنوس نے کفایت کو دیکھا اس نے شانے اچکا دیے کہ ہم غریبن کو کچھ خبر نہیں، یہ اپنے فیصلے ایسے ہی کرتی ہیں۔

"رات ہونے والی ہے، اس وقت کہاں نکلیں گے، حویلی کی بیٹی ہو، محل کی بہو بننے والی ہو، ایسا کم ظرف رویہ نہ اپناؤ۔ ناراض ہوتو جانے دو، اپنے سے چھوٹے کو طیش سے زچ نہیں کرتے۔ یہ تمہاری جان ومال کی فکر کرتے ہیں، تم بھی کچھ فکر رکھو چراغ!"

کفایت کو اشارہ کیا۔ کفایت نے نصیر کو جانے کے لیے کہا۔ آبنوس نے چراغ کے شانے پر محبت سے ہاتھ رکھا۔

"تمہارا چہرہ تمتما رہا ہے، جیسے دل کو ٹھیس پہنچی ہو، اپنے دل کی ٹھیس کا بدلہ دوسروں کو چوٹ پہنچا کر نہیں لیتے۔"

"مجھے کچھ نہیں ہوا، میں ٹھیک ہوں۔" اس نے کتنی کوشش کی کہ چہرے کی تمتماہٹ جاتی رہے۔

"تم اچھی لڑکی ہو، برے فیصلے نہ کرو۔" اس کے گال پر ہاتھ رکھا، وہ دہک رہا تھا۔

"میں اچھی نہیں ہوں۔" اس کی آواز پھر سے نم ہوگئی۔ اس کے لیے جان نہیں دی جاسکتی، جان نہیں لی جاسکتی۔ کیا یہ سچ ہے، کتنا کڑوا سچ ہے۔ کتنا برا سچ ہے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ رودے۔

"تم جرات مند لڑکی ہو...... بروقت فیصلہ کرنے میں دیر نہ کرو......"

☆☆☆

بروقت فیصلہ......

دل کا فیصلہ......

چاند کی چاندنی میں، تاج محل کی خوبصورتی کے سائے میں شاہ جہاں اور ملکہ ممتاز کی محبت کی قصہ گوئی ہوئی۔ وہ غیر دلچسپی سے سنتی رہی۔ اسے ان قصوں کہانیوں سے دلچسپی نہیں تھی۔ لوگ کیسے کہہ دیتے ہیں کہ اس بادشاہ نے، اس ملکہ سے اتنی محبت کی۔ انہیں کیسے خبر ہوتی ہے۔ وہ نہیں مانتی تھی۔ یہ فارغ بیٹھنے والوں کے کام ہیں کہ کچھ نہیں ملا تو قصے تراش لیے۔ جب شاہ جہاں ممتاز سے اظہار محبت کرتے ہوں گے تو کیا یہ تاریخ دان قریب ہی بیٹھے ہوں گے۔

ایک لڑکا شاہ جہاں بنا تھا، دوسرا لڑکا نزاکت سے ممتاز محل بننے کی سرتوڑ کوشش کر رہا تھا۔ قصہ گو بیان کرتا، دونوں اداکاری کرتے۔ لڑکے کو ملکہ بنے دیکھ کر اس کی ہنسی نہیں رکتی تھی۔ یعنی اس ملکہ کے لیے کوئی قبر نہ بنائے، کہاں تاج محل بنایا جاتا۔ اس بے چارے سے ٹھیک سے آنچل ہی سنبھالا نہیں جا رہا تھا، بار بار الجھ کر گرتے گرتے بچا تھا۔ کتنے ہی لوگ ہنس دیے تھے۔ عجب تماشا ہی ہوگیا تھا۔

آبنوس نے دو فرنگی عورتوں کو بھی قصہ گوئی میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ آبنوس جہاں جاتی ہے اپنی محفل بنا ہی لیتی ہے۔ وہ ان سے انگریزی میں بات بھی کرلیتی تھی۔ دیور سے سیکھی تھی۔

"آپ کو کیا ضرورت تھی فرنگیوں کی زبان سیکھنے کی۔" اسے پہلی بار بولتے ہوئے سنا تو جیسے اس کا مان ٹوٹ گیا۔

"زبان وکلام سے کیسی دشمنی چراغ! وہ بھی ہندوستان کی زبانیں بولتے اور سمجھتے ہیں۔"

"اپنی ہی ضرورت کے لیے سیکھتے ہیں۔"

"شاید تمہیں دلچسپی نہیں ہے، لیکن فرنگیوں کی ایک بات انہیں ممتاز کرتی ہے، یہ جہاں جاتے ہیں وہاں کے موسم، ثقافت، زبان اور ماحول کو بہت جلد سمجھ جاتے ہیں۔ اسے اپنا لیتے ہیں۔ انسان میں لچک ہونی چاہیے، ضد اور ہٹ دھرمی اسے بہت پیچھے لے جاتی ہے۔ اب دیکھو کہ یہ تاج محل کی تاریخ اور

ساخت کو تم سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ یہ ان کے علم کی پیاس ہے کہ ختم نہیں ہوتی، تمہیں یقیناً شاہی قلعہ کی تاریخ بھی معلوم نہیں ہوگی۔"

قلعے سے اسے قیدی یاد آ گیا۔ زیر لب بے ساختہ ہنس دی۔ اچھی سزا رہی تھی وہ۔ کتنی زبان چلنے لگی ہے اس کی، کیسے باتیں بناتا ہے۔ اس کے پیچھے مزدور کو دیوانہ بنا کر لگا دیا کہ وہ ڈر جائے۔ کہتا ہے تمہارے لیے کوئی جان کیوں دے گا۔ ہونہہ! میرے لیے ایک زمانہ جان دے سکتا ہے۔ تمہاری جان کی حیثیت ہی کیا ہے، کوڑیوں میں بھی ملے تو نقصان ہے۔ بے وقعت۔ کم حیثیت۔

"تم مسکرا رہی ہو یا پیچ و تاب کھا رہی ہو۔"

اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ "اپنی زبان بولتے ہوئے فرنگیوں کے منہ بگڑ جاتے ہیں، کافی تکلیف دہ زبان ہے ان کی۔"

آبنوس دیر تک ہنستی رہی۔ "تمہارا مشاہدہ کمال ہے لیکن تم نے یہ مشاہدہ نظر میں بال رکھ کر کیا ہے۔ فرنگی عورتیں اعلا ذوق اور رکھ رکھاؤ رکھتی ہیں۔ ان میں سیکھنے کی صلاحیت کمال ہوتی ہے۔ جن کی شادیاں نوابوں سے ہوئی ہیں، انہوں نے اتنی تیزی سے نوابی طور طریقے سیکھے ہیں کہ پیدائشی نواب زادیوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ فارسی بولتی ہیں تو گمان ہوتا ہے کہ ان سے بہتر فارسی کوئی نہیں بول سکتا۔"

"آپ ان کی اتنی حمایت کیوں کر رہی ہیں۔"

"یہ حمایت نہیں ہے چراغ! ہر انسان اپنے اندر ایک سبق رکھتا ہے، اچھے سبق پڑھ کر سیکھ لینے چاہئیں، تعصب نے کبھی کسی کو نفع نہیں دیا۔ میں انہیں اس لیے ناپسند کروں کہ یہ میری نسل، میری سر زمین سے نہیں ہیں تو اس کا مطلب صاف ہے کہ میں تنگ دل انسان ہوں۔ ایک فرنگی لڑکی کو خالص اردو بولتے ہوئے سنا تھا، پھر میں نے بھی دیور سے کہہ کر انگریزی سیکھ لی۔"

"آپ ان کا مشروب بھی پی رہی تھیں۔"

"چائے......؟"

"وہ گرم عجیب سا سیال......" منہ ایسے بنایا جیسے کڑوی دوا کھا رہی ہو۔

"اپنی چائے عام کرنے سے پہلے انہوں نے قہوہ اور کشمیری چائے پی، اس کی تعریف کی، اسے اپنایا۔ محبت اور عزیزداری کا ایک کلیہ بتاتی ہوں، تم کسی کے کھانے پینے کو اپنا لو، وہ تمہیں اپنا لے گا۔ تم کسی اجنبی کے گھر جاؤ، وہ تمہیں کھانے کے لیے جو دے وہ کھاؤ اور اس کی تعریف کرو، وہ یہ تعریف ساری عمر نہیں بھولے گا۔ وہ آنے جانے والوں کو بتائے گا کہ ایک اجنبی آیا تھا، اس نے میرے کھانے کی تعریف کی۔ جس قوم کی ذہنی استطاعت زیادہ ہو گی، وہ دوسروں کی ہر چیز کو پسند کرے گی ورنہ احترام کرے گی۔"

اس نے بے زاری سے سر جھٹکا۔ "آپ اتنی سنجیدہ (خراب) باتیں کیوں کر رہی ہیں۔"

آبنوس نے خاموشی سے اس کا جائزہ لیا۔ "شاید تم کچھ اور سننا چاہتی ہو...... کوئی اور تذکرہ چاہتی ہو۔"

"ایسا نہیں ہے۔" وہ خود اپنے بارے میں نہیں جانتی تھی تو آبنوس کیسے جان جاتی تھی۔

"چائے پیو گی؟" اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا کہ چلو ان کے خیمے۔ شاید کوئی لکھنؤ سے تھا، آبنوس کی جان پہچان کا بھی نکل آیا تھا۔

وہ بے ساختہ ہنسنے لگی۔ "رہنے دیں......"

"تم اتنی ذہین ہو چراغ! اچھے اچھے کام کیوں نہیں سیکھتیں؟"

"آپ نے بھی کہہ ہی دیا کہ میرے سب کام برے ہی ہیں، پھر میں کیسے ذہین ہو گئی؟" چراغ نے اپنے لیے پہلی بار ذہین کا لفظ سنا تھا۔ وہ حیران ہوئی اور خوش بھی ہوئی۔ خوبی پھر خوبی ہوتی ہے۔

"شرارتیں کرنے والے ذہین ہوتے ہیں۔"

"پر میں تو فساد کرتی ہوں۔" منہ لٹکا کر کہا۔

آبنوس نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"ایک بات سچ سچ بتانا...... تم ایسی کیوں ہو؟"
آگے پیچھے ایک ہی سوال اس سے دو لوگوں نے کیے تھے۔ دونوں کی زبان ایک تھی یا سوچ۔
"اگر ایسی نہ رہوں تو کیسی ہو جاؤں؟" اس نے کسی ایک کو بھی جواب نہیں دیا، الٹا سوال کیا۔
"ایسی ہی رہو، بالکل ایسی ہی، مجھے تم ایسی پسند ہو۔ جو جرات والا ہوگا، وہ تمہیں ایسے ہی پسند کرے گا۔"
"شاید سب کو ایسی پسند نہ ہوں، کوئی جرات والا بھی نہ ہو۔" زیرلب خود کو احساس دلایا۔
"تمہیں فرہاد ایسے ہی پسند کرتا ہے اس لیے بھی تم بدلنا نہیں چاہتیں۔" آبنوس نے اس کی پیشانی پر سوچ کے بل دیکھے تو تبصرہ کیا۔
"کسی کے لیے کیوں بدلا جائے۔" جہاں بات خوبیوں کی آتی تھی اسے بات ہی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔
"محبت بدل دیتی ہے، عزیز داری تبدیلی لاتی ہے، محبت میں ایک نہیں کئی سرخاب کے پر ہوتے ہیں، لگ جائیں تو سب بدل جاتا ہے...... کچھ بھی پہلے جیسا نہیں رہتا...... محبت سب سے بڑا انقلاب ہے۔"

☆☆☆

محبت سرخاب ہے۔
دل کی چاہت اس کے پر۔
عارضی پڑاؤ کا اپنا ہی لطف ہوتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمیں یہاں ہمیشہ نہیں رکنا، اور یہی کیفیت سفر کے ہر لمحے کو پوری طرح سے جینے پر اکساتی ہے۔ ہر چیز دیکھ لی جائے۔ ہر صبح خوشی سے جاگیں۔ ہر دن مہکیں۔ خفا نہ ہوں، دوستی رکھیں۔
کئی جھگڑے اس لیے سمٹ جاتے ہیں کہ چھوڑو یہ مسافر ہے۔ کئی خوشیاں اس لیے مل جاتی ہیں کہ اچھا آپ مسافر ہیں۔ نئی جگہیں اپنا اثر رکھتی ہیں۔ کچھ جگہیں صرف جادو رکھتی ہیں، ہر دل کو آرام پہنچا دیتی ہیں۔ ہر رات میٹھی نیند سلا دیتی ہیں۔ یہ تاج محل کا اثر تھا، دریا کا، یا پھر مکمل ماحول کا کہ وہ سب صرف خوش باش تھیں۔
دہلی والی بہنوں نے تاج محل کے نام کئی اشعار کیے تھے۔ ان کا گنگنانا نکھر گیا تھا۔ کبھی چراغ ان کے بچوں کے ساتھ کھیل لیتی تھی، انہیں کشتی رانی کروا دیتی تھی۔ کسی کو گود میں بھر کر بہلا بھی دیتی تھی۔ وہ بازار میں گھومتیں، فرنگی عورتوں کے پہناوے دیکھتیں اور کتنی ہی دیر تک ان پر تبصرے کرتیں۔ ہر بات انہیں ہنسا رہی تھی۔ ہر پہلو سے شرارت عود آتی تھی۔
"میری بہت حسرت تھی کہ میں تاج محل دیکھوں چراغ تم بہت اچھی ہو۔"
ایک بہن نے اس کے ہاتھ تھام لیے، پیشانی پر پیار کیا۔ سنا تھا اس کا سسرال سخت تھا، میکے تک جانے نہیں دیتے تھے۔ خالہ سے ایسا تعلق تھا کہ انکار نہیں کر سکتے تھے، انہوں نے آنے کا پیغام بھجوایا تو ان کی سواریاں روانہ کرتے ہی بنی۔
شادی کے سات سال بعد وہ اپنی سہیلیوں، بہنوں اور رشتے داروں سے آزادی سے مل رہی تھیں۔ پھر تاج محل کے پہلو میں قیام کرنا، اس کے جیسے سارے خواب پورے ہو گئے تھے۔ شادی شدہ عورت کی زندگی میں ہزار آسائشیں ہوں، میکے آنے جانے پر پابندی سب ہیچ کر دیتی ہے۔ کوئی زیور، کوئی پہناوا نہ ملے، بس سہیلی سے دل کا حال کہہ سن لینے کا بہانا مل جائے۔
"آپ خوش ہیں۔" بہن نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا تھا، وہ اسے محبت سے تھپک رہی تھی۔
"بہت خوش ہوں...... جیسے زندگی کے سب بوجھ بہت پیچھے رہ گئے۔ تم ٹھیک کرتی ہو اپنی مرضی کرتی ہو، دوسروں کی مرضی پر اپنا دل مار لینے سے انسان خود بھی مر جاتا ہے۔"
چراغ ہنس دی۔ "آپ کی ساس صاحبہ بہت سخت گیر لگتی ہیں۔"
"وہ بہت اچھی خاتون ہیں لیکن ان کا خیال ہے کہ سختیوں کی چکی میں پسنے کی اب میری باری

ہے۔"

"ایسا بھی کیا......"

سب کی مشقتوں کے وقت ہوتے ہیں چراغ! لیکن عورت کی مشقت کے عہد ہوتے ہیں۔ بیٹی سے بیوی، بہو، ماں، ایک کے بعد دوسرا عہد آتا ہے، پھر تیسرا......"

"ایسے نہ کہیں......زندگی ایسی بھی مشکل نہیں ہے۔"

وہ اداسی سے ہنس دی۔ "مشکل یہی نہیں کہ کھانے کو نہ ملے، میں بڑے گھر میں رہتی ہوں، اچھا کھاتی ہوں، بہترین پہنتی ہوں، پھر بھی ہر دن دل مارنا پڑتا ہے۔ ہر شب اپنی اذیت پہ صبر کرنا پڑتا ہے۔"

وہ کبھی سسرال کی مشقت کو سمجھ نہیں پائی تھی۔ جب سب بہنیں مل کر اپنی اپنی سسرال کی باتیں کرتیں تب بھی اسے لگتا کہ وہ سب جھوٹ بولتی ہیں۔ چچی کہتیں کہ ان کی صحت اچھی ہو رہی ہے۔ وہ ہنستی کھیلتی ہیں تو رنگ وروپ لوٹ آتا ہے۔ اب ایسا بھی کیا کہ ایک بہن کو ان کے بھائی کے نکاح میں شرکت کی اجازت نہیں ملی۔ وہ کیا تھا جس نے دوسری والی کو والد کی تیمارداری سے باز رکھا۔ اور تیسری کو بھائی کی آزاد خیالی کی سزا تاعمر میکے نہ جانے کی سزا کے طور پر ملی۔

شادی شدہ بیٹیاں اپنے گناہوں کی سزا بھی بھگتتی ہیں اور اپنے عزیزوں کی کوتاہیوں کی بھی۔ وہ ہر سوال کے لیے کھڑی کر لی جاتی ہیں۔ وہ ہر ایک کے عمل کے لیے جواب دہ ٹھہرا دی جاتی ہیں۔ ان کے لیے لگائی عدالتیں ختم نہیں ہوتیں۔ ان کے حق میں فیصلے کم ہی ہوتے ہیں۔

کہتے ہیں شادی کے بعد لڑکیاں بدل جاتی ہیں۔ بدل جاتی ہیں یا پھر اندر سے مر جاتی ہیں۔ چچی کہتی ہیں عمر ڈھلنے کے ساتھ ساتھ عورت تلخ ہونے لگے تو جان لیں کہ ایک عرصہ پہلے اس نے خود کو اندر سے ختم کر لیا۔ اب وہ اپنا مردہ وجود اٹھاتے اٹھاتے تھک چکی ہے۔ وہ جھنجھلاتی ہے، چڑتی ہے۔ وہ اب سکون چاہتی ہے۔

اسے یہ باتیں سنائی دیتی تھیں لیکن سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ کبھی کبھی اسے لگتا تھا کہ اسے ہر چیز اتنی مکمل مل چکی ہے کہ وہ نامکمل چیزوں کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ سختیاں ہیں، مشکلیں ہیں، نا تمام حسرتیں ہیں، پر کہاں ہیں؟ سب ٹھیک ہی تو ہے۔ یہ سب جھوٹ ہے کہ کئی دل آہیں بھرتے ہیں، اور کئی حسرتیں دم توڑتی ہیں۔

☆☆☆

آبنوس نے شمس کو بلوایا تھا۔ یہ سب دریا کے رخ پر رکھی نشستوں پر بیٹھی تھیں۔ ذرا دور دہلی والی بہنوں کی جماعت قالین پر بیٹھی پھل کھا رہی تھی۔ ان کے قہقہے نقرئی گھنٹیاں تھیں کہ دریا کی ہوا سنگ بجتی ہوں۔ ان کے آنچل ڈھلکتے جاتے تھے۔ بالوں کی لٹیں دکھائی دیتی تھیں۔ لیکن چونکہ بے فکری اور آزادی کے عہد میں تھیں تو پرواہ نہیں کر رہی تھیں۔ کاجل لگاتیں، غازہ لگاتیں اور اپنی مرضی سے منہ کھول کر ہنستیں۔ خالو صاحب کو دعائیں دیتی تھیں جنہوں نے ایسی سیر کا انتظام کیا تھا۔

شمس آیا تو آبنوس اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "سب ٹھیک ہے......"

اس نے صرف سر ہلا دیا۔

"نام کیا ہے تمہارا، تم نے اس وقت بھی میرے کسی سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔" آبنوس اس کا نام جان چکی تھی، اس کے منہ سے جاننا چاہتی تھی۔ یا شاید دیکھنا چاہتی تھی کہ اس کی ضد کا حال اب کیسا ہے۔

"شمس......"

"صرف شمس......؟"

اس نے آبنوس کے پیچھے بیٹھی چراغ پر ایک نظر ڈالی۔ اس کالی زبان والی نے شمس کے بعد والے نام کو کہیں کا نہیں رہنے دیا تھا۔

"شمس امیری......شمشیری......فقیری......اور

چور......"

آبنوس بے ساختہ قہقہہ لگانا چاہتی تھی لیکن رک گئی۔ "چور......خوب......کیا چرایا ہے......؟"

"شمس چرایا اور تبریز چرانا بھول گیا۔" جیسے طوطا ہو اور یہ سبق یاد کیا ہو، پھر منہ پر دے مارا ہو۔

مسکراہٹ روکنے کے لیے اس نے لب کچلے۔ "تمہارے سینے (دل) کا زخم کیسا ہے؟"

"معمولی تھا، ٹھیک ہو گیا۔"

"کیا اس سے پہلے گہرا زخم کھا چکے ہو جو خنجر سینے پر اتر جانے پر بھی اسے معمولی کہہ رہے ہو۔"

اس نے بے زاری سے آبنوس کی طرف دیکھا کہ اتنی تحقیق کس لیے۔

"مرہم لگا رہے ہو؟"

نظر پھر چراغ کی طرف اٹھ گئی۔ سامنے والی کے سوال ختم نہیں ہو رہے تھے۔ دو تیز زبان لڑکیاں اس کے سامنے موجود تھیں۔ یہ لڑکیاں اتنی باتیں کہاں سے سیکھتی ہیں۔ اتنا بولتی کیوں ہیں۔ یہ لڑکیاں چپ کیوں نہیں ہوتیں۔ ایک اسے گھور رہی ہے، دوسری زخم اور دل کی بات کھلے عام کر رہی ہے۔ دونوں ہی اسے اچھی نہیں لگ رہیں۔ کاش دنیا سے ساری لڑکیاں ختم ہو جائیں۔ دنیا میں کتنا سکون ہو جائے۔ بیل بکریاں ہوں، چڑیاں ہوں، صرف لڑکیاں نہ ہوں۔

"مرہم ایک نظر دیکھ لینا رہا؟" آبنوس نے اس کی نظر کا تعاقب کیا۔

شمس کا جی چاہا اپنا سر پیٹ لے۔ نصیر کہہ رہا تھا کہ زبان دراز عورتوں کی عمر بہت لمبی ہوتی ہے۔ ساری بھڑاس باہر نکال کر وہ خود لمبی عمر پا جاتی ہیں۔ سننے والے سماعت سے جاتے ہیں یا جان سے۔

"میں تمہیں پسند کرتی ہوں۔"

وہ دیکھ کر رہ گیا کہ میں کیا کروں۔ بلکہ تم شاید چراغ کو بھی پسند کرتی ہو گی، پھر تمہاری پسند پر کیسے بھروسا کیا جائے۔

"میں یہ بتا دوں کہ مجھے ایک عرصے بعد کوئی پسند آیا ہے۔" اپنی بات کا اثر نہ دیکھ کر اسے افسوس ہوا۔

"میں ناپسند کیے جانے کو بھی پسند کرتا ہوں۔" اسے چڑ کر جتانا ہی پڑا۔

وہ اس کے تکبر کو دیکھ کر رہ گئی۔ "خوب اتم نے خود کو کافی اہمیت دے رکھی ہے، سنا ہے لاہور میں تم قلعے میں قید کر لیے گئے تھے۔ کیسے ہوا تھا سب؟"

پھر ایک بے زار کن نظر چراغ کی طرف اٹھ گئی۔ چراغ نے الٹا چراغ پا نظر سے اسے گھورا کہ اگر تم نے زبان کھولی تو تمہاری زبان کاٹ دوں گی۔ کفایت ہاتھ جھلاتی ہوئی آبنوس کے پاس آ کر کھڑی ہو چکی تھی، جیسے فارغ تھی تو سوچا یہاں آجاؤں۔ حقیقت میں دور سے شمس کو آتے ہوئے دیکھا تھا تو سارے کام چھوڑ کر ان تینوں کی طرف بھاگ کر آئی تھی۔ اسی کفایت نے دونوں کی نظر کو دیکھا، جی چاہا کہ حلق پھاڑ کر سب بتا دے، لیکن کیا کرتی نمک اس نے چراغ کا کھایا تھا، مار بھی اسی سے کھانی پڑتی۔

"قیدیوں کو صرف قید سے باہر آنے کی کہانی سنانے میں دلچسپی رہ جاتی ہے۔"

اس چور کا بھی تو یہی حال تھا، کچھ کہتا ہی نہیں ہے۔ اچھا ہے پھر سہے سینے پر وار۔ خنجر اتروائے دل میں۔ عجیب انسان ہے، منہ سے کچھ پھوٹتا ہی نہیں۔

کفایت بڑبڑا رہی تھی۔ آبنوس نے کفایت کی بڑبڑاہٹ دیکھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ ساری لڑکیاں شمس کی حمایت میں کیوں ہیں، ایک سوائے چراغ کے۔

"باہر آنے کی کہانی کیا تھی۔"

"پہرے دار نے سر کے بالوں کو مٹھیوں میں جکڑ کر کھینچا، منہ پر پانی کے چھینٹے مارے، اور پوچھا، "تم امام صاحب کے بیٹے ہو؟" اپنی زخمی پیشانی سے اس نے پہرے دار کے چہرے کی تختی کو محسوس کیا۔ اس کا سر جھٹک کر واپس پھینک دیا گیا۔ اسے

احساس ہوا کہ لوگ اباجی سے محبت کرتے ہیں۔ اتنی کہ اس جلاد پہرے دار کی آنکھوں میں بھی نرمی آ گئی تھی۔

''کتنا پوچھا تم سے، تم نے ایک بار نہیں بتایا کہ تم امام صاحب کے بیٹے ہو۔'' وہ تاسف سے شمس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''جو پیدا ہونے پر چھوڑ گئے تھے، ان کے نام پر قید سے کیوں چھوٹتا۔'' اس نے یہ جواب دیا تھا لیکن آبنوس کو نہیں بتایا۔

''میں جاؤں؟'' بے زاری سے پوچھا۔

''میں پھر کہوں گی، میں تمہیں پسند کرتی ہوں۔''

''کتنا پسند کرتی ہیں...... میرے لیے جان پر کھیل سکتی ہیں؟''

پوچھا، جواب کا انتظار کیا اور چلا گیا۔

آبنوس کو اس سوال کی قطعی توقع نہیں تھی۔

''یہ جب بات کرتا ہے جان کی کرتا ہے، اس کے پاس ایک یہی قیمتی شے ہے، اوپر نیچے چھلانگیں لگاتا ہے، مرتا ہے، مارتا ہے، ڈرتا نہیں۔ ان کی زندگی کا یہی دستور ہے، پھر منظور ہے منظور ہے بہت کرتا ہے۔'' کفایت نے شمس نامہ اگل دیا۔

''یہ تم اس کی تعریف میں کہہ رہی ہو یا نفرت میں؟'' آبنوس نے کفایت کی طرف دیکھا۔

''میں آپ کو پسند کرتی ہوں، جس جس کو آپ پسند کرتی ہیں ان سب کو میں بھی پسند کرتی ہوں۔'' کفایت نے دوپٹے کے پلو کو انگلی پر لپیٹ کر شوخی سے لہرا کر کہا۔ ''ابھی آپ نے کہا کہ آپ اسے پسند کرتی ہیں، اسی لیے میں بھی۔'' جھوٹ بولتے ہوئے کفایت کی زبان میں ایک بھی بل نہیں پڑتا تھا۔

چراغ بے زاری سے سب سن اور دیکھ رہی تھی۔ اسے آبنوس بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی، کیا ضرورت تھی غیر ضروری لوگوں کو بلا کر حال احوال پوچھنے کی۔ الٹا چار سنا گیا وہ۔ جب سے لکھنو آیا ہے خود کو نواب سمجھنے لگا ہے۔ یہ وہی ہے جو ایک پتنگ کے لیے جنگ و جدل کر رہا تھا۔ اب کہتا ہے میرے لیے جان دے سکتی ہیں آپ۔

چراغ کی نظر آسمان کی طرف اٹھ گئی، پرندوں کے غول تھے۔ دریا کی طرف دیکھا، بنجاروں کی عورتیں گیت گاتی تھیں۔ سب اپنی جگہ پر تھا تو اس کی زندگی کیوں خالی خالی تھی۔ بے مزا زندگی کا کیا فائدہ، کھاؤ پیو، سو جاؤ، اٹھو اور پھر وہی مشق دہراؤ۔ کوئی ہنگامہ تو رہے، کچھ تو ہو۔

☆☆☆

کچھ نہیں بلکہ اس دن بہت کچھ ہوا تھا۔ وہ اپنے خیموں سے باہر نکل کر میدان میں ادھر ادھر چہل قدمی کر رہی تھیں۔ فرنگی عورتیں گھڑ سواری کر رہی تھیں۔ ان کے لمبے لمبے آنچل لہرا رہے تھے، جبکہ وہ چست لباس میں گھوڑے کی پشت پر سوار تھیں۔ ایک قریب سے گزری تو کفایت نے سر اٹھا کر دیکھا اور دیکھتی رہ گئی۔

''کسی نواب کی نظر ان پر پڑ جائے تو اپنا دل ہار دیں۔'' کفایت نے اسی فرنگی لڑکی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اس کے بال سنہری تھے۔ ان ہی بالوں کی وجہ سے دور سے پہچان لی جاتی تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی اور گہری نیلی تھیں۔ چراغ صرف اس کے سنہری بال دیکھنے میں ہی کامیاب ہو سکی تھی۔ اگلی بار ان کے قریب سے گزری تو اس کی آنکھیں بھی دیکھ لیں۔

''خوب صورت ہے۔'' پہلی بار چراغ نے کسی کی تعریف کی تھی۔

''ہمارے لاہور کے گھڑ سوار نے ان ہی کے گھوڑے درست کیے تھے۔'' کفایت کی زبان اور دماغ دونوں بہت چلتے تھے۔ چراغ نے سنہری بالوں والی لڑکی کی پشت پر تیز نظر کا وار کیا۔ اس کا گھوڑا دور جا چکا تھا۔

''ہمارے لاہور کے گھڑ سوار نے؟'' حور کفایت کو عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی کہ تمہارا دماغ بہک گیا ہے۔

''ایک ہی شہر کے رہنے والے عزیز ہی ہوتے ہیں، ہمارا ہی ہوا شمس!''

تاج محل دیکھ لینے کے بعد کفایت عجیب ہانکنے لگی تھی۔ نوبہار کا کہنا تھا کہ وہ آزاد خیال ہو چکی ہے۔ اسے ہوا لگ چکی ہے۔ وہ پہلی خاتون شریف تھیں جس نے شمس کو باقاعدہ ''ہمارا'' کا لقب عطا کر دیا تھا۔ چراغ نے پوری قوت سے اپنے پیر کو اٹھا کر اس کے پیر پر دے مارا۔

''ہمارا شمس؟ تمہارے ماموں جان کا بیٹا ہے یا خالہ جان کا...... ہمارا شمس......'' منہ بنا کر اس کی نقل اتارتی رہی۔

کفایت بلبلا کر رہ گئی۔ ''میں نے ایک بار ہمارا کہا، آپ نے دو بار کہا، میں بھی آپ کو ضرب لگاؤں؟'' جھک کر پیر مسلنے لگی۔

''تم شمس کی بہت تعریفیں کرنے لگی ہو کفایت! یہ اچھی علامت نہیں ہے۔'' حور نے بڑی بوڑھیوں کی طرح کہا۔

''اچھا انسان ہے، سب کو اچھا لگتا ہے، یہ سنہری بالوں والی فرنگی لڑکی ہنس ہنس کر اس سے باتیں کر رہی تھی، میں نے سوچا یہ خیال مجھے کیوں نہیں آیا، آخر ہم نے اسے جن بھوت کیوں سمجھ لیا ہے۔'' کفایت کے خیالات یا اللہ!

''چراغ نے ہی اسے چور بنا دیا ہے، اچھا ہی انسان ہے۔''

چراغ کو چڑانے کے لیے کہا۔

''کفایت تو بے حیا تھی ہی حور! تم بھی پیچھے نہیں رہیں۔''

''بے حیائی کیسی۔'' کفایت نے لہک کر کہا۔ ''عزیز داری کے یہی قاعدے ہیں کہ ہر اچھے انسان کو اپنا لیا جائے، اس سے سلام دعا رکھی جائے، حال احوال پوچھا جائے، فرصت ملے تو اس کے پاس بیٹھ، میرا مطلب آتے جاتے ہنسی مذاق کر لیا جائے۔ چار دن کی زندگی ہے، دو دن ہنسنے بولنے کے، باقی دو بڑھاپے کے۔''

''کفایت! فکر نہ کر، تیری زندگی کے پورے آٹھ دن ہوں گے، جی بھر کر زندہ رہنا۔'' حور نے شانہ تھپکا۔

چراغ کی آنکھیں کفایت پر گڑی تھیں کہ وہ ہر وقت شمس نامہ کیوں پڑھتی رہتی ہے۔

''پوچھا پھر حال احوال؟'' آنکھیں سکیڑ لیں۔ کفایت کے تاثرات دیکھنے چاہے۔

''پوچھا تھا...... وہ بھی آپ پر گیا ہے، کسی بات کا سیدھا جواب نہیں دیتا، پوچھا زخم کیسا ہے تو مجھے ایسے دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو کہ میں انسان ہی ہوں یا کوئی اور مخلوق۔ آپ نے اسے ہر انسان سے باغی کر دیا ہے۔ وہ ہر لڑکی کو ''چراغ'' سمجھتا ہے۔ سخت نفرت ہے اسے آپ سے۔ یہ بھی آپ کا ہی کمال ہے کہ اسے ہر لڑکی سے بددل کر دیا۔ دعا دیں فرنگی لڑکی کو، کم سے کم وہ کچھ تو بہتری لائی ہے۔''

حور منہ چھپا کر ہنسنے لگی۔ چراغ نے لب بھینچ لیے۔ کفایت البتہ اپنی ہانکتی رہی۔

''یا اللہ مجھے چراغ نہیں بنایا کوئی بات نہیں، مجھے فرنگی لڑکی جیسا بنا دیتے، میں خوش ہو جاتی۔ میرا بھی گھوڑا ہوتا، سنہری بال ہوتے۔ چہرے پر تل کم ہوتے لیکن آنکھیں نیلی ہوتیں کہ بس دل کھینچ لیتیں۔ میرے ہاتھ میں بھی چھاتا ہو، میری پوشاک ہوا سے لہراتی ہو۔ میرا گھوڑا بدک جائے...... اور کوئی آئے...... مطلب...... آہ......''

☆☆☆

دل کی ہر حسرت پر آہ......

ہر لڑکی کو چراغ سمجھنے والا فرنگی لڑکی کے گھوڑے کی پیٹھ تھپتھپا رہا تھا، لڑکی جوش میں باتیں کر رہی تھی، چہرہ تمتما رہا تھا۔ یہی لڑکی شام سے پہلے پھر گھوڑے پر تھی۔ کفایت اپنی دوربین سے دریا کا نظارہ کر رہی تھی۔

''آہا! ہمارا گھڑ سوار اور فرنگیوں کی پری جمال!'' کفایت نے کچھ ایسے چلا کر کہا کہ حور سے

باتیں کرتے ہوئے اس نے سر گھما کر کفایت کی طرف دیکھا۔ بہت دور میدان میں دو گھوڑے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے۔

"یہ دوربین مجھے دو۔" وہ کفایت کے پاس آئی۔

"آپ کا اس سے کیا کام؟" آئینہ چھوڑ دیا اب دوربین کو توڑیں گی۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر دوربین چھین لی۔ آنکھوں پر رکھی۔ فرنگیوں کی پری جمال کا گھوڑا شاید ناراض تھا۔ وقفے وقفے سے بدک رہا تھا۔ قلعے کا قیدی گھوڑے کو قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں دونوں گھوڑے ساتھ ساتھ بھاگنے لگے۔

دوربین چراغ کی آنکھوں پر رکھی تھی، اس کے ہونٹ بھنچ گئے۔ دور...... بہت دور سے بھی اس نے سنہری بالوں والی کی ہنسی دیکھ لی تھی۔ دائرے میں گھوم کر گھوڑے واپس گھومے تو اس نے شمس کے تمتماتے چہرے کو دیکھا۔ آغائی کا ملازم، مسجد کے امام کا بیٹا! یہ وہ شمس تو نہیں تھا۔ وہ نواب نہیں ہے، سردار بھی نہیں ہے۔ وہ کیا چیز ہے۔ اس کی حیثیت تھی یا پھر اوقات۔ وہ بتاتا کیوں نہیں کہ وہ کون ہے۔

دونوں گھوڑوں کی رفتار کم ہو چکی تھی، وہ ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ گھڑ سوار باتیں کر رہے تھے۔

"میری دوربین دے دیجیے۔" کفایت کا دل دھڑک رہا تھا۔

چراغ کے ہونٹ سختی سے بھنچے رہے۔

"چراغ بی بی!" کفایت کو شانہ ہلانا پڑا۔ "خدارا اسے مجھے دے دیجیے۔"

چراغ بی بی نے چونک کر کفایت کی طرف دیکھا۔ پھر دور میدان کی طرف جہاں دو گھڑ سوار تھے۔

"کیا ہوا...... ایسا کیا دیکھ لیا......؟"

جواب دینے کے بجائے اس نے دوربین کو زمین پر دے مارا اور پاؤں پٹختی ہوئی چلی گئی۔ دوربین کفایت کے پیر کے انگوٹھے پر لگی۔ بے چارا یہ پیر دو بار زخمی ہو چکا تھا، وہ جھک کر مسلنے لگی۔ آئینے پر بھی غصہ، دوربین پر بھی۔ آئینہ ٹوٹا، دوربین گئی، اب دل کی باری ہو گی، مجھے دل کے ٹوٹنے سے پہلے ہی مر جانا چاہیے۔

دوربین اٹھا کر گرد صاف کی۔ اس کے عدسے جانچے، ٹھیک ہی تھے۔ بیٹھے بیٹھے آنکھوں پر رکھ کر اس طرف دیکھا جس طرف چراغ دیکھتی رہی تھی۔ وہاں سنہری بالوں والی فرنگن اور قلعے کا قیدی تھا۔ اس کے چہرے پر فکرمندی در آئی۔ پھر سر گھما کر اس خیمے کی طرف دیکھا جس میں ابھی چراغ گئی تھی۔

چچی کی طرح اس نے گہرا سانس لیا۔ خود سارا معاملہ دیکھ رہی تھی، وہ چراغ کا پاؤں پٹخ کر جانا بھی دیکھ چکی تھی۔

"کس چیز نے تمہیں سیخ پا کر دیا" وہ چراغ سے پوچھنا چاہتی تھی لیکن جیسے ڈر گئی۔ اس ایک سوال کا جواب مل گیا تو مزید سوال کھڑے ہو جائیں گے۔ سب سوالوں کے جواب اٹھ کر کھڑے ہو گئے تو قیامت آ جائے گی۔

وہ حویلیوں اور محلوں میں رہتی تھیں، ہزار آسائشیں تھیں، آزادی تھی لیکن صرف ایک چیز نہیں تھی، نہ ہو گی "دل کی مرضی"۔

☆☆☆

دل کے کئی سوال، اور ادھورے خواب......

فرنگیوں کے یہاں چاند کی چودھویں میں رقص کی تقریب تھی۔ آبنوس ان کے ساتھ شام کی چائے پی چکی تھی، انہیں لکھنؤ کے خاص ملائی کباب کھلا چکی تھی، بے قاعدہ دوستی ہو چکی تھی، اسی لیے وہ انسے رقص میں شرکت کے لیے کہہ چکی تھیں۔

"چلو گی چراغ؟" آبنوس، چراغ سے پوچھ رہی تھی۔

"میں تیار ہوں، انہیں فرنگیوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، آپ دیکھ سکتی ہیں کہ انہیں تو اپنے عزیزوں سے انس نہیں ہے، کہاں غیر نسل کے سفید لوگوں سے

ہوگا۔ مجھے لے چلیے، میں نے بھی قریب سے فرنگی نہیں دیکھے۔" چراغ کی جگہ کفایت نے فوراً کہا۔

آبنوس نے تحمل سے کفایت کی تقریر سنی۔ "تم صبح اٹھ کر دوربین سے قریب سے فرنگی دیکھ لینا۔"

کفایت کا منہ لٹک گیا۔ وہی غریبن کی قسمت، ہر چیز نصیب نہیں، ہر کسی سے فرمائش نہیں۔ انسان کم حیثیت اور غریب نہ ہو۔ یا اللہ ہر انسان کی دو آنکھیں دو کان اور ایک ناک ہے، پھر نصیب ایک جیسا کیوں نہیں۔ ایسی تفریق کیوں۔ خیر کفایت کی دل ہی دل میں تقریر شروع ہو چکی۔ اب وہ کتنی ہی دیر تک یا اللہ، یا اللہ کرتی رہے گی۔

"کفایت نے ٹھیک کہا، مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بے حیا، بے شرم لوگ، کھلے آسمان تلے رقص کریں گے۔ تاج ہو، چاند ہو، چودھویں ہو، نہ جانے کن کن قصے کہانیوں کو سر پر سوار کیا ہوا ہے۔ یہاں ناچیں گے، وہاں کودیں گے، جہاں دیکھو، اپنا جہاں آباد کر لیتے ہیں۔ جاؤ اپنے دیس میں، وہاں کرو، یہاں کیوں تماشے لگاتے ہو۔" وہ بلند آواز سے بڑبڑانے لگی۔

"یہ ان کی ثقافت ہے۔"

"ہماری یہ ثقافت نہیں کہ ہم ایسے کھلے عام ان کے رقص دیکھیں، ان کی عورتوں کی طرح کسی کے ساتھ بھی گھڑ سواری کے لیے نکل جائیں، بال لہرائیں، منہ سر کھول کر ادھر ادھر گھومیں۔"

وہ سب حیران تھیں کہ چراغ چچی یا اماں کی زبان کیوں بول رہی ہے، جبکہ وہ خود بہت آزاد خیال تھی۔

"منہ سر تو تم بھی کھول کر رکھتی ہو، کسی سے بھی بات کر لیتی ہو، جبکہ لکھنؤ کا یہ رواج نہیں۔"

"میری بات اور ہے۔"

"تمہاری بات کیا ہے؟"

وہ گڑبڑا گئی۔ "میں فرنگی نہیں ہوں۔"

"جو فرنگی ہوگا، وہ بے حیا ہوگا؟"

"یہ شاید خاص اس سنہری بالوں والی لڑکی کے لیے کہہ رہی ہیں، وہ ہر وقت اپنا گھوڑا شمس سے درست کروالی ہے، شاید نئی نئی گھڑ سواری سیکھی ہے۔"

کفایت کی زبان بالکل کاٹ دینی چاہیے۔ فوراً۔ چراغ کا دل چاہا کہ کاش اس کے ہاتھ میں دیوانے کا خنجر ہوتا اور وہ کفایت کے سینے میں اتار دیتی۔

"سنہری بالوں والی لڑکی؟" آبنوس یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ چراغ نے کفایت کو ایسے گھورا کہ وہ سنہری نیلا پیلا سب بھول گئی۔

"ایسے ہی زبان سے نکل گیا، میرا مطلب چراغ بی بی بالکل ٹھیک کہتی ہیں انہیں ان فرنگیوں سے دور رکھیے۔ بلکہ کوشش کر کے چور سپاہی سب کو دور رکھ دیجیے۔" (مجھے لے جائیے کہا نہیں گیا)۔

"دل میں اتنی برائی نہ رکھو، میرا خیال تھا تمہیں اچھا لگے گا۔ ہر جگہ کی سیاحت کرتی ہو، فرنگیوں کے رقص کو بھی دیکھنا چاہو گی۔ میرا خیال ہی غلط تھا۔ کفایت تمہیں جانا ہے، تمہیں فرنگیوں کی بے حیائی سے کوئی مسئلہ تو نہیں؟"

کفایت نے آنچل کو انگلی پر لپیٹ لیا۔ کمر کو لہرا دیا۔ "نہیں! میں خود بھی بہت بے...... نا نہیں! کاش میرے بھی بال سنہری ہوتے۔"

جس کے بال سیاہ تھے، لمبے تھے، آبنوس کے ساتھ وہ آ گئی تھی۔ چراغ۔ اس نے خالہ کا دیا خاص کرتا پہنا تھا۔ آبنوس نے ہی کہا تھا وہ ہلکے رنگ کا کوئی لباس پہن لے۔ اس نے تقریباً سفید اور ذرا سا گلابی کرتا پہن لیا۔ دوپٹہ اتنا لمبا تھا کہ لاکھ کوشش پر بھی فرش پر ہی بچھتا چلا جاتا تھا۔ اور وہ کیوں آئی تھی؟ سنہری بالوں والی لڑکی کو قریب سے دیکھنے۔ نہیں...... ہاں، ہاں۔ آخری وقت پر آبنوس کفایت کو بھی ساتھ لے آئی تھی۔ آتے ہوئے وہ کوئی دو تین فرنگیوں سے ٹکرا گئی تھی۔

"کیوں بوکھلا رہی ہو اتنا، کھا نہیں جائیں گے تمہیں۔"

"یہ ڈر تو مجھے ہے کہ میں ہی انہیں نہ کھا

جاؤں۔“ اس نے دانت نکالے۔

”کفایت! اگر تم نے یہاں کوئی تماشا کیا تو تمہیں واپس لکھنؤ نہیں لے جاؤں گی۔“

”تماشا کرنے تو شاید آپ آئی ہیں، کیوں آئی ہیں؟“ کفایت نے سنجیدگی سے جتا دیا۔

”ہر کسی کو انکار نہیں کیا جا سکتا۔“ آبنوس کی طرف اشارہ کیا۔

”سنہری فرنگن کو کچھ مت کہیے گا۔“ کفایت کی زبان کاٹ دینی چاہیے۔

”میرا اس سے کیا لینا دینا۔“ اس نے منہ بگاڑ لیا۔

اوئی اللہ.....“ کفایت کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکلی۔ چراغ نے بے اختیار اس کی نظر کے تعاقب میں دیکھا تھا۔

☆☆☆

دیکھا اور دیکھ لیا......

اس نے زندگی میں بہت کچھ دیکھا تھا لیکن یہ نہیں کہ سنہرے بالوں والی ایک فرنگی لڑکی، ایک گنوار سے ہنس ہنس کر بات کرتی ہو۔ وہ کچھ چیزوں کی طرف اشارے کرتی ہو اور اسے ان کے بارے میں بتاتی ہو۔ اس نے یہ بھی نہیں دیکھا تھا کہ وہ اسے چند دوسرے فرنگیوں کے پاس لے گئی ہو اور ان سے سلام دعا کروائی ہو۔ چھتیں پھلانگ کر اپنی دو کوڑی کی پتنگ لینے والا، فرنگی لڑکی کے ساتھ دو بدو کھڑا تھا۔ جیسے اسے صدیوں سے جانتا تھا۔

”پہلے انہیں دیکھ کر آپ نے میری دوربین زمین پر دے ماری تھی، اب کیا دیں ماریں گی؟“

وہ نشست پر بیٹھ چکی تھی، چند لوگوں سے اس کا تعارف ہو چکا تھا، آبنوس اپنی جگہ پر مصروف تھی، باتیں کر رہی تھی۔ کفایت اس کے سر پر کھڑی تھی۔ جھک کر اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔ اس کی کان کی لوئیں سرخ ہو رہی تھیں۔

”ہاتھ میں پکڑا یہ مشروب کسی پر مت اچھالیے گا، یہ آپ کا لاہور یا لکھنؤ نہیں ہے، یہ فرنگیوں کی محفل ہے، سنا ہے یہ لوگ حیثیت کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے، سیدھا کر دیتے ہیں، آپ ان کے ہاتھوں سیدھی ہوئیں تو مجھے اچھا نہیں لگے گا۔ مجھے ان کی زبان بھی نہیں آتی، آپ کو کیسے بچاؤں گی۔ میں کہوں گی چھوڑ دو انہیں، جانے دیں۔ وہ سمجھیں، اور سیدھا کرو انہیں، جانے نہ دیں۔“ کفایت اپنے دل کے ارمان پورے کر رہی تھی۔

”دیکھیں حیثیت دیکھتے تو ہمارے چور کو ایسے اپنی محفل میں جگہ دیتے۔“ کفایت مسلسل بول رہی تھی۔

ہمارا چور......

اس چور کی حالت ہی بدلی ہوئی تھی، وہ فرنگن کے ساتھ فرنگی لباس میں تھا۔ نہ وہ امام صاحب کا گنوار بیٹا لگ رہا تھا، نہ آغائی کا ملازم۔ وہ اتنی شکلیں کیسے بدل لیتا ہے۔

”میں نے کہا تھا چراغ! لوگ اور جگہیں کب اپنی حیثیت بدل لیں، کچھ نہیں کہہ سکتے، آج کے بھکاری کل کے تخت نشین ہوں، کون جانتا ہے۔“ آبنوس بھی شمس کو دیکھ چکی تھی۔

”یہ جلد سمجھ جاتا ہے، اور سیکھ جاتا ہے، اس میں آگے بڑھنے کی زبردست صلاحیت ہے۔“

کفایت کی طرح آبنوس بھی مسلسل بول رہی تھی۔ کیا ان دونوں کی کوئی بازی لگی ہوئی تھی؟ کیا یہ سب شمس کی رشتہ دار تھیں۔ وہ سب چراغ کو نیچا کیوں دکھانا چاہتی تھیں۔ وہ چور تھا، اسے چور ہی رہنا چاہیے تھا، فرنگیوں میں گھس کر سردار نہیں بن جانا چاہیے تھا۔

ان کے ساز بجنے لگے۔ حد نظر تک خیموں کا شہر تھا۔ ہر خیمہ روشن تھا۔ ایک بڑے دائرے میں ان کے رقص کا اہتمام تھا۔ چودھویں کا چاند تھا، اور کہتے ہیں تاج محل کا حقیقی حسن دیکھنے کے لیے چودھویں کے چاند کا انتظار ضرور کیا جائے۔ وہ دائرے میں گھومنے لگے۔ سنہری بالوں والی اپنی بدنما پوشاک لہراتے ہوئے بل کھانے لگی۔ اس کی شکل بالکل

ویسی ہی تھی جیسی فرہاد نے خط میں بنا کر بھیجی تھی۔ لمبی ناک، بد نما پوشاک، اور جادو گرنی جیسے خد و خال۔ بس ایک جھاڑو کی کمی تھی۔ وہ ہنستی تھی تو خوف آتا تھا۔ وہ رقص کے لیے لہرائی تھی تو سانپ لگتی۔ وہ اس محفل کی سب سے منحوس صورت شکل لڑکی تھی۔ وہ سر گھما کر پیچھے کھڑے شمس کو دیکھتی جاتی تھی۔

''اسے دل ہی دل میں گالیاں دینا بند کریں، سنا ہے نظر لگنے سے انسان مر بھی جاتا ہے۔''

کفایت نے پھر جھک کر اس کے کان میں سرگوشی کی۔ اس نے پوری قوت سے نشست پر گھوم کر اس کے پیر پر اپنا جوتا مارا۔ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ آبنوس روکتی ہی رہ گئی لیکن وہ وہاں سے چلی گئی۔ تقریباً بھاگتی ہوئی۔ ہر شے تہس نہس کرتی ہوئی۔ اپنے خیمے کے باہر رک کر گہرے سانس لیے۔ پیشانی پر گہرا پسینہ تھا۔ دور دریا میں چاند کا عکس لہرا رہا تھا۔ دل تھا دریا میں کود جائے۔ اس کے پینڈے میں اتر جائے۔

ورنہ یہ آگ کیسے بجھے گی......
ورنہ یہ آگ کتنا بھڑک جائے گی......

☆☆☆

''سنو چراغ!''

رات بھر اسے تیز بخار رہا تھا، اس نے کسی کو نہیں بتایا تھا۔ کفایت نے پیشانی پر ہاتھ رکھ کر جانچنا چاہا تو اس نے ہاتھ جھٹک کر پرے کر دیا۔ ناشتے کے بعد وہ چہل قدمی کے لیے آئی تھی۔ دور نہیں گئی تھی قریب ہی تھی، فرنگیوں کے رقص کا سماں رات بھر رہا تھا۔ دلی والی بہنیں اس طرف سے جتنا دیکھ سکتی تھیں دیکھتی رہی تھیں۔ پھر وہ کفایت کو بٹھا کر پوچھتی رہیں۔ ہر طرف اس رقص کے قصے تھے، وہ بے زار ہو گئی۔ اس کا حلق تک کڑوا تھا۔ کفایت بار بار شمس نامہ شروع کر دیتی تھی کہ اس کی کیسے حالت ہی بدلی ہوئی تھی، وہ پہچانا نہیں جا رہا تھا۔ شمس کون امام صاحب کا بیٹا۔ کون، گھڑیال ٹھیک کرنے والا۔ وہ نقاہت سے دریا کے کنارے کنارے ٹہل رہی تھی کہ پیچھے سے آواز آئی۔ اسے لگا اس کا گمان ہے۔ اس کا خیال ہے۔ گردن گھما کر دیکھا تو گمان حقیقت تھا۔ وہ عین پیچھے کھڑا تھا۔ شاید کل کی تقریب کے لیے بال تراشے تھے، فرنگیوں جیسے بال، پوری شکل ہی بدل گئی تھی۔ اسی لیے رات پورا فرنگی لگ رہا تھا۔ کچھ کچھ فرہاد کے حلیے کا۔ تھوڑی اور محنت کرتا تو نواب بھی لگنے لگتا۔ جاگیر پیش کر دی جاتی تو سلطان بھی۔

''سنو چراغ......سنو چراغ......'' ہوا میں منتشر رہا۔ اس کے کانوں میں دیر تک گونجتا رہا۔

''تم مجھے سنو چراغ ایسے کہتے ہو جیسے میں تمہاری سہیلی ہوں، تمہاری عزیز ہوں۔''

''پھر کیا کہنا چاہیے، بد دماغ چراغ، بد کلام چراغ......دنیا پر مصیبت اور قہر چراغ!'' وہ محظوظ ہو رہا تھا۔

اس نے ایک تلخ سانس گھونٹ کی طرح اندر کیا۔ ''مجھے ایسے آواز نہ دیا کرو، اپنی حد میں رہو، میرا تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''تم سے تعلق بد نصیب رکھیں۔'' صاف، سیدھا، منہ پھٹ جواب۔

تلخی سی تلخی تھی۔ ''بہتر......کس سلسلے میں ''سنو چراغ'' پکارا تھا؟'' اس کی نقل اتاری۔

''انسان سفر پر نکلتا ہے تو اپنے کھیل کے ساتھی یاد کرتا ہے، اسے شہر یاد آتا ہے، گھر یاد آتا ہے، مجھے بھی ابا جی یاد آ رہے ہیں۔'' وہ چلتا ہوا اس کے قریب آ چکا تھا۔ چراغ نے توجہ نہیں دی کہ اس نے کھیل کے ساتھی سے بات شروع کی تھی۔

''مجھے کیوں بتا رہے ہو، کس نے روکا ہے ابا جی سے ملنے سے، جاؤ، جاتے بھی نہیں ہو۔''

''تمہیں کوئی یاد نہیں آتا۔''

''میں آغا جی کو کوئی خط لکھ چکی ہوں۔'' وہ بات پر آمادہ ہو گئی۔ بخار سے پیشانی جل رہی تھی کچھ ٹھنڈک اترنے لگی۔

''ایسا خط جیسا مجھے لکھتی ہو۔''

وہ اس سے کیوں اتنی باتیں کرے، وہ جائے

سنہری بالوں والی کے پاس۔ اس جادوگرنی کے پاس۔

"تم شاہ جہاں کو جانتی ہو؟" اس کے پاس آج بہت سوال تھے۔

"ہاں ......" فخر سے کہا کہ جیسے ہمارے ابا حضور اور شاہ جہاں ساتھ ساتھ کھیل کود کر بڑے ہوئے تھے۔

"کیا جانتی ہو......"

"یہی کہ یہ تاج محل انہوں نے تعمیر کروایا ہے۔" (وہی جو سب جانتے ہیں)

"اور......"

"اور ......تم کیوں پوچھ رہے ہو......" جب انسان کی معلومات اور علم ختم ہو جاتا ہے تو وہ جواب دینے کے بجائے تکرار کرنا شروع کر دیتا ہے، چراغ کا بھی یہی حال تھا۔ چار کتابیں اس نے ضرور پڑھی تھیں لیکن انہیں یاد رکھنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

"یعنی تم کچھ نہیں جانتیں۔ آخری وقت میں شاہ جہاں یہاں قید ہوئے تھے۔" دریا کے دوسرے کنارے قلعے کی طرف اشارہ کیا۔ "جس جگہ وہ قید تھے وہاں ان کی خواہش پر ایک سوراخ بنوایا گیا تھا کہ وہ تاج محل کو دیکھتے رہیں۔ یہ بھی سنا ہے کہ اس سوراخ پر سونے کی پرت لگوائی گئی تھی۔"

"تم وہ سونا چرانا چاہتے ہو؟"

"میں چرانا چاہتا تو تمہیں چراتا۔"

دریا کے اس طرف تاج محل میں، دریا کے دوسری طرف شاہ جہاں کے قلعے میں بگل کی آواز گونج کر رہ گئی۔ جادوگر جیسے چھڑی گھمائے اور سب ٹھہرا دے۔ ہر چیز رک گئی۔ ٹھہر گئی۔ پرندوں کی آوازیں تک آنا بند ہو گئیں۔

"لیکن پھر دور لے جا کر کہیں پھینک دیتا، یہ میرا لاہور شہر پر احسان ہوتا۔" تحمل سے بات مکمل کی۔

جادوگر نے جادو واپس کھینچ لیا۔ چراغ کی سانس میں انگارے بھر گئے۔ لیکن اس نے زبان کو قابو میں رکھا۔

"بہتر......" پیر پٹخنے سے باز رہی اور طریقے سے واپسی کا ارادہ کیا۔ وہ سونا چاہتی تھی۔ "لکھنو واپس لوٹ جانا چاہیے اب۔"

"کیا تم شاہ جہاں کا وہ قید خانہ اور دیوار دیکھنا چاہو گی؟"

وہ شمس کو دیکھ کر رہ گئی۔ "تم مجھے کس جال میں پھنسا رہے ہو۔"

"تم ڈر رہی ہو......اس جگہ کو دیکھنے کی کسی کو اجازت نہیں ہے، وہاں تک صرف چند خاص لوگوں کی رسائی ہے۔"

"اور تم خاص ہو؟" وہ طنز سے خود کو روک نہیں سکی۔

"نہیں......تم خاص ہو......" مسکرا کر کہا۔

"میں لکھنو آ رہا تھا تو سفر میں ایک دوست ملا، لکھنو میں بھی اس سے ملاقات ہوتی رہی تھی، اس کے چچا یہاں قلعے کے پہرے داروں میں سے ہیں، میں ان سے مل چکا ہوں، وہ مجھے شاہ جہاں کی مقید کی جگہ دکھا چکے ہیں۔"

وہ اس چال باز کی شکل دیکھ رہی تھی۔ "ہر جگہ تمہارے دوست بن جاتے ہیں، ان کے چچا بھی نکل آتے ہیں، وہ چچا اتنے اچھے ہوتے ہیں کہ تمہاری آؤ بھگت کرتے ہیں، تمہیں اپنے گھوڑے پیش کرتے ہیں، پھر اپنے یہاں رقص میں بلاتے ہیں، تمہیں سب سے ملواتے ہیں۔ تم نے مجھے اتنا بے وقوف سمجھا ہے۔" وہ کہاں کی بات کہاں لے گئی تھی۔ چچا کو جادوگرنی تک کھینچ لیا۔

چراغ کے ساتھ بات چیت کے دوران دو کام کرنے بہت مشکل ہوتے تھے۔ یا اعصاب کو قابو میں رکھنا یا قہقہوں کو۔ اس وقت شمس قہقہے کو قابو میں رکھنے کی کوشش میں ناکام تھا۔

"اتنا نہیں کافی بے وقوف سمجھا ہے۔ تم ڈر رہی ہو الگ بات ہے، شاہ جہاں کی آخری رہائش گاہ صرف نوابوں اور خاص لوگوں کے لیے کھولی جاتی

ہے، انہیں دکھائی جاتی ہے، میں نے سوچا تم بھی نواب زادی ہی ہو، شاید تمہیں بھی دلچسپی ہو۔ لیکن تمہارا مسئلہ اعتبار ہے، تم نے ہمیشہ دوسروں کے اعتبار توڑے ہیں، اس لیے خود بھی کسی پر نہیں کر سکتیں۔ دل توڑنے والا سب توڑ دیتا ہے، اپنا اور دوسروں کا یقین اور اعتماد بھی۔"

"مجھے تم پر اعتبار کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔"

"بہتر......"

"مجھے بادشاہوں، شہزادوں میں بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"ابا جی ٹھیک کہتے ہیں، ہم میں سیکھنے کا جذبہ کم ہے، ورنہ......"

وہ جانتی تھی وہ کہنے والا ہے کہ وہ فرنگی لڑکی ہوتی تو قلعے کا کونا کونا دیکھتی۔ سوال کرتی، جواب لیتی۔ وہ سب کچھ جان لینا چاہتی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس جادوگرنی کا نام اس کے سامنے لیا جائے۔ اس بدہیت لڑکی کے ساتھ اسے ملایا جائے۔

"میرے آگے چلو...... میں دیکھنے کے لیے تیار ہوں۔" ایسے کہ چلو تمہیں عزت بخشتی ہوں۔

☆☆☆

مسکراہٹ چھپا کر وہ سر جھکا کر اس سے دو قدم آگے چلنے لگا۔ تھوڑا فاصلہ طے کیا تو دونوں ساتھ ساتھ آ گئے۔ چلتے رہے چلتے رہے، فاصلہ زیادہ نہیں تھا، فاصلہ کم بھی نہیں تھا، دریا ہی تو پار کرنا تھا لیکن وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ وہاں واقعی چچا کھڑے تھے، انہیں ہاتھ کے اشارے سے سلام کر کے وہ ایک طرف بڑھ گیا۔ وہ بھی ساتھ تھی۔ جیسے وہ ہمیشہ سے ساتھ ساتھ تھے۔ جیسے قلعے اور محل تعمیر ہوتے رہے، اور وہ ہر عہد میں ایسے ہی چلتے آئے، ہر داستان سنتے، ہر داستان مکمل کرتے۔

ان کی داستان کا نام کیا تھا؟

مشک بام......

شاہ جہاں کے قلعے میں سب کچھ ویسا ہی تھا، ایک شاہ جہاں ہی نہیں تھا۔ ایسا بھی کیا تھا کہ وہ اپنی داستان اتنی مکمل چھوڑ گئے۔ سامنے تاج محل اور یہاں ملکہ ممتاز کی یادیں۔ ایک دل جو ہر پل اپنی محبوبہ کے لیے دھڑکتا رہا تھا۔ ایک دل جو ہر لمحہ اس کی یادگار کو دیکھتا رہا تھا۔ جدائی جسے عورتوں سے زیادہ منسوب کیا جاتا ہے، اس کی آہیں ایک بادشاہ نے سوراخ سے آنکھ لگا کر بھریں۔

وہ کئی سیڑھیاں اتر کر نیچے تہہ خانے میں آ چکے تھے۔ وہ کتنی دور آ چکے تھے۔ یہاں کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا یہاں تک آنے کی کسی کو اجازت نہیں تھی۔ ایک بادشاہ کو قید کر لیا، پھر اس کے قید خانے کو اتنا خاص بنا دیا کہ عام کی رسائی سے دور کر دیا۔ یہ وقت کا کیسا عجیب انداز ہے۔ یہ لوگوں کے دستور کتنے برے ہیں۔

آخری سیڑھیاں اتر کر وہ نیچے آئی تھی۔ وہ پہلے ہی اتر کر نیچے کھڑا تھا۔ یہاں ایک کمرا تھا اس کا دروازہ کھلا تھا۔ نیم اندھیرا تھا۔ یہ قید خانے جیسا ہی لگتا تھا۔ وہ چل کر اندر گیا۔ پھر وہ پیچھے گئی۔ وہ ایک دیوار کی طرف بڑھ گیا، وہ بھی اسی دیوار کی طرف بڑھ گئی۔ دیوار میں ایک سوراخ دکھائی دیتا تھا، وہ اس طرف بڑھی، اس پر اپنی آنکھ رکھی، لیکن دوسری طرف کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہاں سے دریا، تاج محل کسی چیز کا نظارہ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ حیران ہو کر پیچھے پلٹی تو شمس دروازے کی دہلیز میں کھڑا تھا۔

"یہ وہ کمرا نہیں ہے جہاں شاہ جہاں کو بند رکھا گیا تھا۔"

اس نے آرام سے بتایا اور دروازے کے پٹ جو کھلے تھے، ان کو ہاتھ بڑھا کر سمیٹ لیا۔ ہلکی سی درز میں شمس کا چہرہ دکھائی دیتا تھا۔ اس کے چہرے پر سختی تھی۔

"تم نے مجھے شاہی قلعے میں قید کروایا تھا، میں تمہیں شاہ جہاں کے قلعے میں قید کر رہا ہوں۔"

دروازہ مکمل بند ہو گیا۔ ایک اندر رہ گیا، ایک قلعے سے باہر نکل گیا۔

☆

۔وہ ٹائی ڈھیلی کیے' آستین اوپر چڑھائے' کام میں غرق دکھائی دیتا تھا۔

ہلکی سی دستک کے بعد مالک اندر داخل ہوا تو اسے تعجب سے دیکھا۔

"تم کسی نئے آئیڈیا پہ کام کر رہے ہو؟" وہ سامنے کرسی کھینچ کے بیٹھا۔ ماہر نے سر اٹھا کے اسے دیکھا اور ہلکا سا مسکرایا۔ مالک اس مسکراہٹ کو پہچانتا تھا۔

"تمہیں یاد ہے ہم نے یہ بزنس ایمپائر کیسے کھڑی کی تھی؟"

"تمہارے ابا اور میں نے قطر کی رئیل اسٹیٹ ،بیرون ملک بیچنا شروع کی تھی۔"

مالک کو چند لمحے لگے شاک سے باہر آنے میں۔

"لندن کی رئیل اسٹیٹ بہت مہنگی ہے۔ ہم افورڈ نہیں کر سکتے۔"

"کر سکتے ہیں۔ میں بتاتا ہوں کیسے۔" اس نے ایک نقشہ اس کے سامنے رکھا۔ پھر قلم سے ایک جگہ اشارہ کیا۔

"میں ویسٹ اینڈ' مے فیئر' نائٹس برج اور belgravia کی پرانی اور تھکی ہوئی پراپرٹیز کی نیلامی میں حصہ لے کر انہیں خریدوں گا۔ یہ اٹھارہ سو سے دو ہزار پاؤنڈز فی مربع میٹر کے حساب مل جائیں گی۔" وہ اس کو سمجھا رہا تھا۔ "میں ہر گھر پہ فی

نمرہ احمد

مالا

"ہاں اور اس وقت کی ٹائمنگ نے ہماری مدد کی تھی۔ ہم نے ایک اپارٹمنٹ سے شروع کر کے ،ایک ایک وقت میں پوری پوری عمارتیں ، مہنگے داموں بیچی تھیں۔ لیکن آج یہ اتنی بڑی انڈسٹری بن چکی ہے کہ ہمارا کام بہت سست ہو چکا ہے۔ کسی نے ڈائریکٹ انویسٹ کرنا شروع کر دیا ہے۔ کوئی خود بروکر بن چکا ہے۔ اس لیے میں اس کام کو بند کرنا چاہتا ہوں۔"

مالک کے چہرے پہ بے یقینی ابھری۔ "کیا کہہ رہے ہو؟"

"ہم کب تک لندن کے لوگوں کو قطر کی رئیل اسٹیٹ بیچتے رہیں گے؟ کیوں نا ہم اس کے الٹ کریں؟ یعنی ہم قطر کے لوگوں کو لندن کی رئیل اسٹیٹ بیچیں۔"

مربع میٹر دو سو سے تین سو پاؤنڈز کا خرچہ کر کے اس کو رینوویٹ کروں گا۔"

مالک نے ذہن میں جمع تفریق کی۔ "یعنی تمہیں پراپرٹی بائیس سو سے تیئس سو پاؤنڈز فی مربع میٹر کے پڑے گی۔"

"اور یہ تقریباً تین ہزار پاؤنڈ پہ فروخت ہو جائے گی۔"

"لیکن لوگ ہم سے کیوں خریدیں گے؟"

"کیونکہ لندن کی ہائی اینڈ پراپرٹیز اس وقت بتیس سو پاؤنڈز فی مربع میٹر پہ فروخت ہو رہی ہیں۔ ہم مارکیٹ سے دو سو پاؤنڈز سستے میں فروخت کریں گے تاکہ ہمارے قطری کلائنٹس بھی خوش ہوں اور ہم بھی پیسہ بنائیں۔"

مالک چند لمحے اس کی بات پہ غور کرتا رہا لیکن



۸

آٹھویں قسط

وہ متاثر نہیں نظر آتا تھا۔

"یہ پراپرٹیز بہت پرانی ہیں۔ تم ان میں ایسا کیا کرو گے جو یہ مہنگے داموں فروخت ہو جائیں؟"

وہ دھیرے سے مسکرایا۔

"اس روز مجھے ایئرپورٹ پہ ایک لڑکی ملی۔ اس نے مجھے ایک بات کہی تھی۔ ہر تبدیلی کے پیچھے ایک کہانی ہوتی ہے۔ میں ہر پرانے گھر کی کہانی نکالوں گا اور پھر اس گھر، کو اس میں رہنے والی قدیم انگلش فیملی کی روایات اور اقدار کو، سامنے رکھتے ہوئے رینوویٹ کیا جائے گا۔ مجھے صرف وہ کہانی بیچنی ہے جو اس گھر کے ساتھ جڑی ہوگی۔"

"ہم اس بارے میں مزید بات کریں گے۔"

وہ قدرے غیر مطمئن نظر آتا تھا۔ پھر اس نے پہلو بدلا۔

"ویسے تم کس لڑکی کے ساتھ آج کل ڈنرز پہ جاتے ہو۔"

وہ چونکا۔ اور نا سمجھی سے مالک کو دیکھا۔

"لڑکی؟ اچھا وہ... (اسے تو وہ بھول ہی گیا تھا۔) مجھے بیربل نے کسی سے ملوایا تھا۔"

"ہاں مجھے معلوم ہے۔ اس کو شمس نے ہی اس سے ملوایا ہوگا۔" مالک نے لہجہ سرسری بنا لیا۔ "میں صرف جاننا چاہتا ہوں کہ اگر تم اس سے شادی کرنا چاہ رہے ہو تو...."

"ایک منٹ، ایک منٹ...." وہ چونکا۔ ساری رئیل اسٹیٹ سارے نقشے اسے بھول گئے۔

"شمس؟ شمس کہاں سے آ گیا درمیان میں؟"

اس کی دکھتی رگ پہ ہاتھ پڑا تھا۔
"اوہ...." مالک نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "تمہیں بیربل نے نہیں بتایا کہ وہ لڑکی شمس کے فیملی فرینڈز میں سے ہے اور...."
وہ ایک دم اٹھا۔ سارا خون چہرے میں سمٹ آیا تھا۔ اس نے موبائل اٹھایا اور ایک نمبر ملاتے ہوئے تیزی سے بالکونی کی طرف چلا گیا۔ شیشے کا دروازہ بند کر دیا۔ اب وہ فون کان سے لگائے غصے سے بات کر رہا تھا۔ وہ یقیناً بیربل کو کھری کھری سنا رہا تھا اور بیربل آگے سے اس بات سے انکاری ہوگا۔ کیونکہ یہ سچ نہیں تھا۔ لیکن مالک نے کہہ دیا تھا تو ماہر نے مان لیا تھا۔ وہ اپنے باپ کے بھائی پہ سب سے زیادہ بھروسہ کرتا تھا۔
مالک خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پہ تکلیف تھی۔ اس کی مٹھی بھنچی ہوئی تھی۔
(یہ آخری بار ہے۔ میں اسے دوبارہ دھوکہ نہیں دوں گا۔) اس نے ماہر کو دیکھتے ہوئے خود سے کیا وعدہ دہرایا۔

☆☆☆

اگلے چند دن شمس پہ بہت بھاری گزرے تھے۔ وہ ماہر کا سامنا نہیں کر رہا تھا۔ جب وہ ہلال کو لینے آتا تو وہ کہیں غائب ہو جاتا۔ سرکار سے رابطہ بھی نہیں ہو رہا تھا۔ آج جیسے ہی رابطہ ہوا' شمس فوراً سے فون لیے گھر سے باہر آ گیا۔
"کیا فائدہ ہوا مجھے اس سب کا سرکار؟ ماہر میرے بہت قریب آ گیا ہے۔"
شمس سڑک کنارے ایک سنگی بنچ پہ بیٹھا ناخوشی سے کہہ رہا تھا۔
"یہی تو تم چاہتے تھے۔ کہ وہ تم لوگوں سے تعلقات درست کر لے۔ اب کیا مسئلہ ہے' شمس؟" سرکار نے اکتا کے پوچھا۔
"مجھے کمپنی میں شراکت داری چاہیے نہ کہ ماہر کی اپنے گھر میں مداخلت۔ میں اس کو ہینڈل نہیں کر سکوں گا۔"
"چھوٹے بھائی کو جیسے رام کیا ہے' اسے بھی کر لو۔"
"وہ تو باپ کی توجہ سے محروم بے وقوف لڑکا ہے۔ ماہر ایسا نہیں ہے۔ اسی نے مجھے برسوں پہلے ملازمت سے نکالا تھا۔ وہ پھر سے میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔" شمس کی حالت کسی ایسے نشئی کے جیسی ہو رہی تھی جسے اپنے نشے کی ڈوز نہ مل رہی ہو۔ بے چین۔ مضطرب۔
"ہوں۔" سرکار نے ہنکارا بھرا۔ "مجھے کچھ اور بتاؤ اس ماہر کے بارے میں۔"
"کیا بتاؤں؟" شمس چڑ گیا۔ "ماں' دادا' دادی سب کے نام دے دیئے۔ سارا شجرہ ہے تمہارے پاس۔ اپنے موکلات سے پتہ کروا لو۔"
"ان موکلوں کو اتنی عقل ہوتی تو یہ انسان نہ بن جاتے؟" سرکار نے چھوٹا سا قہقہہ لگایا۔ "انسانوں والی بات بتاؤ' شمس! ماہر فرید کی سب سے بڑی کمزوری کیا ہے؟"
شمس ٹھہر گیا۔ اس کا دماغ تیزی سے کام کرنے لگا۔
"اس کا غصہ۔ وہ بہت جلدی بھڑک اٹھتا ہے۔ جب سے اس کی ماں نے اسے چھوڑا ہے' یہ تب سے ہے۔"
"بہت خوب۔ اور اس کی سب سے بڑی طاقت کیا ہے؟"
"اس کا پیسہ۔ بلکہ نہیں۔ اعتبار۔" اس نے طنز سے ماہر کے الفاظ دہرائے۔ "واللہ ماہر فرید پہ ہر کوئی اعتبار کرتا ہے۔"
"یہ ہوئی نا بات۔" سرکار کی آنکھیں چمکیں۔ "اور اگر سب ماہر فرید پہ اعتبار کرنا چھوڑ دیں؟"
"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" شمس ہکا بکا رہ گیا۔
"ہم اس پہ یہیں سے حملہ کریں گے۔ کچھ عرصے کی بات ہے.... اور پھر ماہر فرید پہ کوئی اعتبار نہیں کرے گا۔ بس تم دیکھتے جاؤ۔"
شمس ٹھہر کے سننے لگا۔ اس کی آنکھیں خوش

گوار حیرت سے پھیلتی جا رہی تھیں۔

☆☆☆

اسلام آباد کے اس کھنڈر جیسے ریستوران میں اس وقت رینوویشن کا کام جاری تھا۔ ہر طرف مٹی اور سیمنٹ کے ڈھیر تھے۔ کہیں پینٹ والے لگے تھے۔ کہیں بجلی کا کام ہو رہا تھا۔ ریستوران کے ہر حصے کو اکھاڑا ہوا تھا۔

ایسے میں ایک چھوٹے سے کمرے میں اس نے اپنی میز کرسی بچھائی ہوئی تھی۔ اور اس وقت وہ ایک امریکی پوسٹل سروس کا پارسل کھول رہی تھی جو اسے ماہی نے بھیجا تھا۔ اندر ایک نوٹ بھی تھا۔ نہ جانے ماہی نے اسے میسج یا ای میل کرنے کی بجائے نوٹ کیوں بھیجا تھا؟ وہ تعجب سے اسے پڑھنے لگی۔

(مالا میں تمہارے لیے خوش ہوں کیونکہ تم نے اپنی زندگی خود بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں یہ نہیں کہوں گی کہ تم غلط ہو۔)

ماہی کا خط پڑھ کے اس نے پارسل میں موجود دوسری چیز نکالی۔ وہ ایک چھوٹا سا پیکٹ تھا جو ببل ریپ میں لپٹا تھا۔

(لیکن غلط میں بھی نہیں ہوں۔ میں اپنی پڑھائی جاری رکھوں گی۔ لیکن میں کیریئر نہیں بناؤں گی کیونکہ مجھے اس کا شوق نہیں ہے۔)

مالا قینچی سے ببل ریپ کو کاٹنے لگی۔

(میں اپنا گھر بناؤں گی۔ ایک بچہ کھو دیا تو کیا ہوا۔ میں دوبارہ کوشش کروں گی۔ مجھے گھر اور بچوں کا شوق ہے۔ اور میں وہی کروں گی جو میرا دل چاہتا ہے۔)

ببل ریپ الگ ہوا تو اندر سے ایک پیکٹ نکلا۔ بیجوں کا پیکٹ۔ مالا نے اچنبھے سے انہیں اوپر اٹھا کے دیکھا۔

(ہم دونوں غلط نہیں ہیں۔ شادی کرنا اور نہ کرنا عورت کی اپنی چوائس ہونی چاہیے۔ تمہیں وہ کرنا ہے جو تمہارا دل چاہے۔ لیکن اس سب میں تمہیں ماں کو نہیں بھولنا چاہیے۔)

وہ پیکٹ کو اوپر اٹھائے دیکھ رہی تھی۔ کھڑکی سے آتی سورج کی روشنی اس میں سے منعکس ہو رہی تھی۔ مالا مسکرا دی۔

(جب تم وہاں سے آئی تھیں تو انہیں تین چار دن، بخار رہا تھا لیکن انہوں نے تمہیں بتانے سے منع کیا تھا۔ اب وہ ٹھیک ہیں۔ لیکن تمہاری کمی کوئی بھی پوری نہیں کر سکتا۔)

وہ اب باہر کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا گملہ تھا جس کی مٹی کو وہ چمچ سے اوپر نیچے کر رہی تھی۔

(تمہارے آنے کے چھ دن بعد ماں کی برتھ ڈے تھی۔ تم نے ان کو ایک ہفتے بعد وش کیا۔ جانتی ہوں تم مصروف ہو۔ لیکن امید کرتی ہوں کہ تم اس سب میں خود کو کھو نہیں دو گی۔ بلکہ ایک بہتر انسان بن کے نکلو گی۔)

مٹی نرم ہو چکی تھی۔ وہ بیجوں کو مٹی میں چھڑکنے لگی۔ اس کے چہرے پہ مسکراہٹ تھی۔

(میں تمہیں ایک تحفہ بھیج رہی ہوں۔ یہ بیج مجھے ائیرپورٹ پہ ملنے والے ایک مہربان انسان نے دیے تھے۔ یاد ہے میں نے تمہیں بتایا تھا نا' وہ امیر آدمی جس نے میرا ٹکٹ پے کیا تھا۔)

مالا اب مسکراتے ہوئے بیجوں کے اوپر مٹی ڈال رہی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے چھپتے جا رہے تھے۔

(تمہارے جانے کے بعد ماں نے چند نئے پودے لگائے ہیں۔ میں جانتی ہوں' وہ ان پودوں میں تمہیں ڈھونڈیں گی۔)

اس نے بوتل سے ذرا سا پانی مٹی پہ ڈالا اور اس کو ہلکا سا نم کیا۔

(تم بھی ان بیجوں کو بو دینا۔ اور ان میں اپنا آپ ڈھونڈنا۔)

اس نے گملے کو اپنے آفس کی کھڑکی میں رکھ دیا۔ وہ ہر صبح اس میں سے اگنے والی کونپلوں کا انتظار کرے گی۔ پھر اس نے سوچا کہ ماں کو کال کرے۔ نہ جانے اس وقت ان کے ہاتھ گرم ہوں گے یا

ٹھنڈے۔ اسی وقت کنٹریکٹر اسے باہر بلانے لگا۔ وہ فون گملے کے پاس چھوڑ کے باہر چلی گئی۔

دفعتاً اس کا فون تھرتھرانے لگا۔ ماں کالنگ۔

لیکن وہ دور جا چکی تھی۔

گملے کے اندر دفن بیج خاموشی سے فون کی تھرتھراہٹ سننے لگے۔

☆☆☆

پانچ سال بعد۔

موجودہ دن۔

کشمالہ نے آنکھیں کھولیں۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھی تھی۔ جوگرز والا باکس اس کی گود میں تھا۔ اس کا چہرہ ابھی تک گیلا تھا۔ البتہ اس کی جلد بے داغ تھی اور بال لمبے تھے۔

پانچ برس گزر چکے تھے۔ زندگی آگے بڑھ گئی تھی اور بہت کچھ پیچھے رہ گیا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ باہر نکلی تو ماں لاؤنج میں اکیلی بیٹھی تھیں۔ وہیل چیئر پہ بیٹھے بیٹھے وہ اونگھنے لگی تھیں۔ وہ چپ چاپ ان کے ساتھ بیٹھ گئی اور دھیرے سے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے۔

وہ ٹھنڈے تھے۔

"میری پیاری ماں...." وہ گیلی آنکھوں سے انہیں دیکھے گئی۔ "میں اب کبھی آپ کو چھوڑ کے نہیں جاؤں گی۔ میں نے بہت سال ضائع کر دیے۔ اب نہیں۔"

وہ ان کو دیکھتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔ وہ گردن ترچھی کیے سو رہی تھیں۔

☆☆☆

مالک کا لاہور والا اپارٹمنٹ ویسا ہی تھا جیسے وہ چھوڑ کے گیا تھا۔ وہ اس میں داخل ہوا تو اندھیرے نے اس کا استقبال کیا۔ ماہر نے بتی نہیں جلائی۔

چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا وہ کھڑکی کے سامنے رکھی کرسی تک آیا۔ وہاں سے روشنیوں سے جگمگاتا سارا شہر نظر آتا تھا۔

اس نے جیب سے لائٹر نکالا اور کھڑکی کے کنارے رکھی ایک موم بتی کے دھاگے کو شعلہ دکھایا۔ اسٹرابری۔ ہلال کی پسندیدہ۔

پھر اس نے پیر چھوٹی میز پہ رکھ لیے اور ٹیک لگائے باہر دیکھنے لگا۔ کھڑکی کے شیشے پہ اس کا عکس بھی دکھائی دے رہا تھا۔ ہلکی بڑھی شیو والا مرد۔ کیا وہ وہی تھا جو پانچ برس پہلے ہوتا تھا؟ یا وہ بدل گیا تھا؟

ہر تبدیلی کی ایک کہانی ہوتی ہے۔ تب ماہر فرید کا سب اعتبار کرتے تھے۔ اور اب.... وہ تلخی سے مسکرایا۔ اب ماہر فرید کا کوئی اعتبار نہیں کرتا تھا۔ کشمالہ مبین بھی نہیں۔

تب ہی اس کا موبائل بجنے لگا۔ اسے کوفت ہوئی۔ وہ اس وقت بیربل کی بکواس نہیں سن سکتا تھا۔ اکتا کے موبائل نکالا تو تاثرات بدلے۔ ون ان ففٹی کالنگ۔

اس نے کال موصول کی۔ ماہی کا چہرہ اسکرین پہ ابھرا۔ یہ اس لڑکی سے کہیں میچور اور سمجھدار لڑکی کا چہرہ تھا جو اسے پانچ برس پہلے دوہا کے ائیر پورٹ پہ ملی تھی۔

اور اس کے بعد بھی وہ اس سے ملا تھا۔ اسے ماہی اور اپنی دوسری ملاقات بھی یاد تھی۔

"آپ نے میسج کیا تھا کہ آپ مالا سے ملنے پاکستان آئے ہیں۔" وہ تشویش سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"ہاں۔ میں ملا تھا تمہاری بہن سے۔ اور...." اس نے الفاظ ڈھونڈنے چاہے۔ لیکن وہ ہمیشہ کی طرح تیزی سے بات کاٹ کے بولی۔

"تب ہی اس نے زیاد سے شادی سے انکار کیا ہے۔ میں کہوں اسے ایک دم کیا ہو گیا ہے۔"

ماہر فرید تیزی سے سیدھا ہوا۔ "اس نے زیاد سے شادی سے انکار کر دیا ہے؟"

ایک دن ہمارے مورچے پہ
آئی ایک گولی اڑتی ہوئی
اور جان لے گئی میرے ایک سپاہی کی
اس کی موت کے غم نے
میرے دل کو ڈبو دیا جیسے۔

میں نے کھودا اس جگہ کو
جہاں گرا تھا وہ
اور ڈھونڈا اس ٹکڑے کو
جو نہ تھا میرے انگوٹھے سے بڑا
گرم دھات سے بنا گولی کا ایک خول۔
میں نے پگھلایا اس کو اور بنایا ایک سانچا
اور اس میں ڈالا ابلتے خول کو
اور ڈھال دیا اس کو ایک انگوٹھی کی صورت میں۔
اور جب میری انگوٹھی ہو گئی ٹھنڈی اور ہموار
میں نے ایک الجیرین سپاہی سے
لکھوایا یہ لفظ اس پر عربی میں
"مکتوب"۔
یعنی ... یہ لکھا جا چکا تھا۔
کیونکہ تقدیر کی کتاب میں
جس کے صفحے ہیں زمان
اور سرورق ہے مکاں۔
اس کتاب میں سب پہلے سے درج شدہ ہے۔
جس دن تم اپنا وجود کھودو گے
وہ گھڑی، وہ جگہ، وہ وجہ
سب اس کتاب میں نشان زدہ ہے۔
اور تمہیں نہ خیال سے نہ عقل سے
اس تقدیر کو بدلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔
بس ڈر کو دل سے بھگانا سیکھ لو۔
اگر ایک دن مرنا ہی ہے
تو جان لو اے انسان
کہ یہ حصہ ہے ایک بڑے مکتوب منصوبے کا
جس سے تم بچ نہیں سکتے۔
سو تم ایسے مرو کہ جیسے تمہارا جنازہ
تمہیں ان شاہانہ دروازوں کی طرف لے گیا ہے
جن کے اس پار منتظر ہیں
بہت سے عظیم لوگ۔
فرق بس اتنا ہے کہ وہ تمہارا استقبال کرتے ہیں
یا ملامت سے تمہیں خود سے الگ کر دیتے ہیں۔

ساری بات اتنی سی ہے کہ
تم آقا بن کے جاتے ہو اس دنیا میں
یا غلام بن کے۔
اس لیے جب جنگ میں حکم آتا ہے کہ حملہ کرو
اور دل کانپتا ہے یاد کر کے
زندگی کے پرلطف ماہ و سال
تو اس جنگی شور اور افراتفری میں
کچھ سپاہی دھیان بٹانے کو
صاف کرتے ہیں اپنی بندوقیں
کچھ گنگناتے ہیں جنگی نغمے
اور کچھ اپنی سرنگیں کھودتے جاتے ہیں۔
ایسے میں۔
میں دیکھتا ہوں اپنی انگوٹھی کو
اور میرے تنے اعصاب ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔
اور موت کا فرشتہ خاموشی سے قریب آ جاتا ہے
اور میں سوچتا ہوں اس دوسری دنیا کے بارے میں
ان شاہانہ دروازوں کے بارے میں
اور اس شور میں یہ خیال
کسی مرہم کی طرح راحت لے آتا ہے۔
میرے دل کی پھڑپھڑاہٹ
خاموش ہو جاتی ہے۔
اور ہر طرف چھا جاتا ہے
ہتھیار ڈالنے کا احساس۔
سکینت۔
اور مشرق کی دانائی۔
(ایلن سیگر کی نظم "مکتوب" سے اقتباس)

"اس نے زیاد سے شادی سے انکار کر دیا ہے؟" وہ ایک جھٹکے سے سیدھا ہو بیٹھا۔ وہ نیم اندھیر اپارٹمنٹ میں کھڑکی کے ساتھ کرسی ڈالے بیٹھا تھا۔ اطراف کو خوشبودار موم بتی کی خوشبو نے معطر کر رکھا تھا۔

"آپ کا اس میں کوئی ہاتھ نہیں ہے؟" ماہی چہرے کو ہاتھوں کے پیالے میں گرائے بغور اسے دیکھے گئی۔

ماہر نے غائب دماغی سے سر دائیں بائیں ہلایا۔ پھراس کی نگاہوں کے احساس سے چونکا۔ سنبھل کے سر جھٹک دیا۔

"مجھے پرسوں استنبول واپس پہنچنا ہے۔" لہجے کو سرسری بنالیا۔ "کچھ دن تک تم سے ملنے آؤں گا۔"

"اتنی دور آکے کیا کریں گے؟ جو پوچھنا تھا' ویڈیو چیٹ پہ پوچھ لیا۔ میں آپ کی بہن کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔"

ماہر نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے۔ پھر ناخنوں سے بڑھی شیو مسلی۔ اس کے انداز میں اضطراب تھا۔

"تم سے ملے بغیر میری تسلی نہیں ہوگی۔"

ماہی نے ترحم سے اسے دیکھا۔ یہ ایک ایسے شخص کا چہرہ تھا جو اپنی بہن کے زندہ ہونے کی امید کھونا نہیں چاہتا تھا۔ یقیناً وہ مرچکی تھی اور وہ Dinal (جھٹلانے کی نفسیاتی کیفیت) میں تھا۔

"کیا آپ نے کبھی اس سرکار کو دیکھا ہے؟" اس کا نام لینا بھی عجیب لگ رہا تھا۔

ماہر نے نفی میں گردن دائیں بائیں ہلائی۔

"مالا نے دیکھا ہے۔"

وہ جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ سانس تک رک گیا۔

"مالا نے کچھ روز قبل ،خواب میں ایک بوڑھا جادوگر دیکھا ہے۔ جس کے سر پہ نارنجی رومال بندھا تھا اور وہ مالا اور زیاد کی تصاویر پہ جادو کررہا تھا۔ یقیناً وہ ان کا رشتہ ختم کروانا چاہتا ہے۔ اور دیکھیں ہو بھی گیا۔"

"کیا مالا نے اس کا چہرہ دیکھا تھا؟" ماہر اب سامنے جلتی موم بتی کے شعلے کو دیکھ رہا تھا۔ ذہن تیزی سے چل رہا تھا۔

"ہاں۔ وہ اس چہرے کو جانتی ہے۔ بس شناخت نہیں کرپارہی۔"

"اپنی بہن سے کہو اس آدمی کا اسکیچ بنائے۔ پھر وہ اسکیچ مجھے دو۔ ہم اس اسکیچ سے اس کو ڈھونڈیں گے۔ کیا معلوم میں اسے پہچان لوں۔ شاید ہمارے راستے کبھی ٹکرائے ہوں۔ شاید وہ میرے قریب ہو۔ یاد ہے مجھے کشمالہ کی تصویر سرکار کے البم سے ملی تھی۔"

"آپ کو وہ البم کیسے ملا تھا؟" اسکرین پہ نظر آتی ماہی آنکھیں چھوٹی کرکے اس کو دیکھ رہی تھی۔

ماہر کچھ کہنے لگا' پھر رک گیا۔

"بس اتنا جان لو کہ وہ آدمی میرا دشمن ہے۔ اس کو میرے سوتیلے باپ نے میرے خلاف ہائر کیا تھا۔ میں اس تک کبھی پہنچ نہیں سکا البتہ میرے ہاتھ اس کی کچھ چیزیں لگی تھیں۔ ان میں یہ البم بھی تھا۔ وہ ایک لمبے عرصے سے کشمالہ کے پیچھے پڑا ہے۔ کیوں؟ میں نہیں جانتا۔" اس نے شانے اچکائے۔

"شاید اس کی تمہارے خاندان سے کوئی ذاتی دشمنی ہو۔"

"ہم کون سا نیوکلیئر بم بنارہے ہیں جو ہمارے اتنے دشمن ہوں گے۔" وہ برا مان گئی۔ "ایک کبیرہ تائی ہی ہیں ہماری دشمن۔" پھر ایک دم اسے خیال آیا۔ وہ سیدھی ہو بیٹھی۔

"آپ کے کہنے پہ پیٹر میسج نے کبیرہ تائی کا مزید کام کرنے سے انکار کردیا تھا نا۔"

"ہاں۔ لیکن وہ کسی اور عامل کو ہائر کرچکی ہوں گی۔" "ہوسکتا ہے وہ نیا عامل سرکار ہی ہو۔ وہی سرکار جو کسی وجہ سے برسوں سے مالا کے پیچھے لگا ہو۔ اتفاق سے اب اس کی نئی کلائنٹ ،کبیرہ بیگم بھی مالا اور ماں کی تصویر لے کر اس کے پاس آگئی ہوں۔" ماہی چمکتی آنکھوں سے تیز تیز کہہ رہی تھی۔

ماہر چند لمحے خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر کھنکھارا۔

"تم جاب وغیرہ نہیں کرتیں؟ سارا دن گھر بیٹھ کے یہی اسٹار پلس سوچتی رہتی ہو؟"

ماہی کے کندھے ڈھیلے پڑے۔ ابرو بھنچ گئے۔

"ماہی کے اندازے کبھی غلط نہیں ہوتے۔ میں بتارہی ہوں کبیرہ تائی کا نیا عامل یہی سرکار ہوگا۔ وہی چاہتی ہیں کہ مالا اور زیاد کی شادی نہ ہو، تاکہ ان کی بیٹی سے زیاد کی شادی ہوجائے۔"

ماہر نے کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی اور بولا تو آواز میں اکتاہٹ تھی۔

''کیا بچگانہ باتیں کرتی ہو تم۔ ایسے اتفاق کہاں ہوتے ہیں۔ اور یہ عامل صرف اپنی طاقت بڑھانے کے لیے بھی کسی پہ جادو کرتے ہیں۔ ان کے جنات...''

''ایک منٹ ایک منٹ، جنات کی باتیں نہ کریں۔ مجھے رات کو لائٹ آن کر کے سونا پڑتا ہے۔''

ماہی نے ہاتھ جوڑ کے اسے دکھائے۔ وہ ہلکا سا ہنس دیا۔ پورے دن میں وہ پہلی دفعہ ہنسا تھا۔

''تم ڈرتی ہو ان چیزوں سے؟''

''آپ بھی ڈرتے تھے، جب ہم آخری دفعہ ملے تھے۔'' وہ برا مان کے بولی۔ وہ اپنی اور ماہر فرید کی دوسری ملاقات کی بات کر رہی تھی۔ ''اب آپ بدل گئے ہیں۔ تب آپ خوف زدہ تھے۔'' پھر غور سے اس کا چہرہ اسکرین پہ دیکھا۔ ''آنکھوں تلے حلقے تھے۔ اور آپ کی گلابی اردو میں بہت گاڑھا انگریزی لہجہ تھا۔ ہاتھ میں سگار ہوتا تھا۔ آپ کوئی دوا بھی کھاتے تھے۔ مجھے یاد ہے۔ پھر یہ تبدیلی کیسے آئی؟ آپ نے اپنا لہجہ اپنے خوف اور اپنے سگار کہاں کھوئے؟''

''بس کھو دیے۔'' وہ مدھم سا مسکرایا۔ ''یہ میرے حصے کی کہانی ہے۔ تم سے مل کے سناؤں گا۔ تم اس آدمی کا اسکیچ حاصل کر کے مجھے بھیجو۔''

''مگر...'' وہ کچھ کہنے لگی تھی لیکن ماہر نے بٹن دبا کے کال کاٹ دی۔ وہ مزید بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

اس کا فون بجنے لگا۔ بیربل کا نام جگمگا رہا تھا۔ اب اس کی بک بک سنو۔

''پیسے ختم ہو گئے؟'' اس نے آڈیو کال کا اسپیکر آن کر دیا۔ اسے بیربل کی تقریر یاد تھی۔

''کیا میں اپنے بھائی کو پیسوں کے علاوہ فون نہیں کر سکتا؟''

''نہیں۔''

بیربل آگے سے ہنس دیا۔ ''لگتا ہے باغبان لڑکی نے دروازہ دکھا دیا ہے۔''

''صرف مجھے نہیں۔ اس ٹال اور ڈارک کو بھی۔'' اس کی نظریں کینڈل کے شعلے پہ جمی تھیں۔

''وائی بے۔ چلو وہ تو راستے سے ہٹا۔'' بیربل کی آواز میں جوش در آیا۔ ''تم پیچھے مت ہٹنا۔ دوبارہ جاؤ اس کے پاس۔ پھر سے معافی مانگو۔''

''میں اس آدمی سے مشورے نہیں لیتا جو صرف کیکس بناتا ہے۔ اپنی بیکری پہ دھیان دو۔''

اس نے فون آف کر دیا۔ اب وہ تنہا تھا۔ نیم اندھیر اپارٹمنٹ تھا۔ اسٹرابری کی خوشبو تھی اور ایک ٹمٹماتا ہوا شعلہ۔

دوسری جانب، فون کاٹ دینے پہ بیربل فرید نے برا سا منہ بنا کے موبائل کو دیکھا۔ ''وہ آدمی جو صرف کیکس بناتا ہے۔ ہونہہ۔ مشین۔'' آواز بھاری کر کے نقل اتاری اور سر جھٹک دیا۔

وہ اس وقت، اپنے گھر کے سیاہ سفید لونگ روم میں بڑے صوفے پہ ٹانگیں لمبی کیے بیٹھا تھا۔ جوتے بے پروائی سے کارپٹ پہ رکھے تھے۔

''کیا کروں؟'' وہ موبائل لبوں پہ رکھے سوچنے لگا۔ دفعتاً آنکھیں چمکیں۔

''دوشبنم!'' کال ملاتے ہی وہ چہکا۔

''بات مت کرو مجھ سے۔ اپنی بیکری پہ نیا ڈیزرٹ لانچ کیا ہے اور مجھے نہیں کھلایا؟''

''تمہارا معدہ صرف قبر کی مٹی سے بھرے گا۔'' وہ بھی جواباً خفا ہوا۔ پھر اونہوں کر کے سر جھٹکا۔ ''ماہر اپنے دوستوں میں سب سے زیادہ کس کے قریب ہے؟''

''زارا۔''

بیربل نے موبائل کان سے ہٹا کے اسے گھورا۔

''اللہ کا خوف کرو۔ کسی مرد کا بتاؤ۔'' (منہ بگاڑ کے نقل اتاری۔ زارا۔ ہونہہ)

''ماہر کے بہت سے دوست ہیں۔ یونی ورسٹی کے، بزنس کے، سفر کے۔'' وہ واقعی مصروف لگ رہی

تھی۔ "اور ہر وقت انسان کے دوست ایک جیسے نہیں رہتے۔ کچھ پیچھے رہ جاتے ہیں۔ کچھ آگے بڑھ جاتے ہیں۔ دوست وہی ہوتا ہے جو ہمارے موجودہ حال کو سمجھتا ہو۔ جس سے ہم آج کے دن بات کر سکیں۔"

"ہوں۔ ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھو۔"

"ناشتے میں کوئی فلسفے کی کتاب تو نہیں کھائی تھی؟" "میں فون رکھ رہی ہوں، بیربل!" وہ غرائی۔

"اچھا اچھا، ایک منٹ۔" جلدی سے لہجے کو خوش آمدی بنایا۔ "ماہر کا ایسا کون سا دوست ہے جو اسے درست مشورہ دے سکے؟"

"ڈاکٹر کنعان۔"

شبنم نے سوچنے کے لیے ایک لمحہ بھی نہیں لیا۔ لیکن بیربل کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی۔

"جو اسے درست مشورہ دے اور ماہر اس کی بات مان لے..."

"اچھا پھر آرکیٹیکٹ انیس۔ وہ اس کے مشورے مان لیتا ہے۔"

"جو اسے درست مشورہ دے، ماہر اس کی بات مان لے.... اور..." اس نے بال کھجائے۔ "اور اس کو ماہر کی ذاتی زندگی میں انوالوڈ کرنے پہ وہ میرے کریڈٹ کارڈز کینسل نہ کر دے۔"

شبنم نے گہری سانس لی۔

"ایسا دوست تو صرف چنگیز ہے۔ پولیس کمشنر۔ وہ اس سے مہینے میں ایک دفعہ ضرور ملتا ہے۔ وہ ہلال کے بارے میں بھی سب جانتا ہے۔"

"آف کورس۔" بیربل نے ماتھے کو چھوا۔ "مجھے پہلے کیوں خیال نہیں آیا۔"

"میرا ڈیزرٹ صبح مجھے آفس بھجوا دینا اور...."

"بائی بائی۔" اس نے مسکرا کے سنے بغیر فون رکھ دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ لونگ روم میں ٹہل ٹہل کے فون پہ چنگیز سے بات کرتا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور ان میں بہت سی شرارت چھپی تھی۔ بات مکمل کر کے وہ فون پہ میسج دیکھتے ہوئے آتش دان کے پاس رکھی، ونگ چیئر تک گیا اور ایک پہ مزے سے ڈھیر ہو گیا۔ پیر اوٹومن اسٹول پہ رکھ لیے۔ وہ بہت آرام دہ تھی۔

کچن میں کام کرتی، فیضی خانم نے پلٹ کے اسے گھورا۔ "بیربل بے۔"

لیکن وہ ڈھٹائی سے مسکراتا رہا۔

"ماہر بے نہیں دیکھ رہے۔" پھر ونگ چیئر کے بازو تھپتھپائے۔ "پتہ نہیں ماہر اتنی آرام دہ چیئر پہ بیٹھنے سے منع کیوں کرتا ہے۔"

"اس نے تمہیں نہیں بتایا؟" وہ پلٹ کے حیرت سے پوچھنے لگیں۔ بیربل نے چونک کے انہیں دیکھا۔ پھر گردن دائیں بائیں ہلائی۔

"وہ ہر دفعہ ٹال دیتا ہے۔ میں خود بھی نہیں پوچھتا۔ وہ تھوڑا (کنپٹی پہ انگلی سے اشارہ کیا) سائیکو ہے نا۔" "دراصل جب ماہر نے استنبول میں یہ اپارٹمنٹ لیا تھا تو ان سے پہلے سے یہاں رہتے تھے۔"

"کون؟"

"ایک بیوہ جنی اپنے دو بچوں کے ساتھ یہاں رہتی ہے۔ وہ ماہر کو شروع میں تنگ کرتے تھے۔ پھر اس نے ان کے ساتھ ڈیل کر لی کہ وہ انہیں، اس ونگ چیئر کے پیچھے رہنے دے گا اور گھر میں موسیقی نہیں چلائے گا۔ اور جواباً وہ اس کو کام کرتے وقت ڈسٹرب نہیں کریں گے۔"

بیربل زور سے ہنس دیا۔ "اس نے کہا اور آپ نے یقین کر لیا؟"

فیضی خانم نے پیچھے مڑ کے سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ "تمہیں واقعی نہیں معلوم؟ تم نے کبھی نوٹس نہیں کیا کہ یہ جگہ بغیر آگ جلائے بھی گرم کیوں ہوتی ہے؟"

بیربل نے ونگ چیئر کے بازوؤں کو دوبارہ چھوا۔ وہ واقعی گرم تھے۔ اگلے ہی لمحے وہ کرنٹ کھا کے وہاں سے اٹھا۔

"اللہ اللہ" وہ تیزی سے لونگ روم کے دوسرے دہانے پہ آرکا اور پیچھے مڑ کے آتش دان کو

دیکھا۔ آنکھیں پھیل چکی تھیں، اور رنگت زرد ہو رہی تھی۔ وہ دونوں ونگ چیئرز خاموش پڑی تھیں۔

"وہ دو سو سال سے یہاں رہ رہے ہیں۔ ماہر کہتا ہے کہ وہ مسلمان ہیں اور۔"

"اف۔ بند کریں اپنا نیوز بلیٹن! مجھے ساری رات نیند نہیں آئی۔" اس نے دونوں ہاتھ ان کے سامنے جوڑے۔ پھر پلٹ کے گھبرا کر آتش دان کی طرف دیکھا۔

"پہلے میں ایک سائیکو مشین کے ساتھ رہ رہا تھا۔ اب اس گھر میں جن بھی ہیں۔ اللہ اللہ۔" وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا، تیزی سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ دروازہ جلدی سے بند کیا۔ فیضی جانم مسکرا کے واپس اپنے کاموں کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ انہیں یقین تھا بیر بل فرید آج نماز پڑھ کے سوئے گا۔

☆☆☆

کشمالہ نے مٹیالے سفید جوگرز کو واپس باکس میں ڈالا۔ بیجوں کا خالی پیکٹ ان کے ساتھ رکھا۔ پھر باکس کو بند کیا۔ اس باکس نے ماضی کے سفر پہ روانہ کر دیا تھا اور اب، اسے واپس حال میں پلٹنا تھا۔

وہ باکس لیے اوپر اسٹوڈیو میں چلی آئی۔ مطلوبہ کیبنٹ کھولی اور باکس کو اندر کر کے رکھ دیا۔ وہ چیزیں ماضی کی کشمالہ کے ساتھ وہیں دفن ہو گئیں۔ وہ سیدھی ہوئی ہی تھی کہ ماہی کی کال آنے لگی۔

"میں ابھی تمہارے بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔" اس نے مسکرا کے فون کان سے لگایا۔

"میری عمر لمبی ہے یا میں شیطان ہوں؟"

مالا ہنس دی۔ "آج مجھے اتنے برس بعد وہ بیجوں کا پیکٹ نظر آیا جو تم نے مجھے امریکہ سے بھیجا تھا۔" مالا یاد کر کے کہہ رہی تھی۔ "جو تمہیں ایئرپورٹ پہ کسی مہربان آدمی نے دیا تھا۔ وہ جس نے تمہارا ٹکٹ بھی پے کیا تھا۔"

"اوہ۔" ماہی ایک لمحے کے لیے سانس نہیں لے سکی۔ وہ اس بات کو بھول چکی تھی۔ اسے اہم تفصیلات یاد تھیں۔ لیکن وہ پیکٹ ذہن سے فراموش ہو چکا تھا۔

"تم اس سے دوبارہ بھی ملی تھیں نا۔ اسی ایئرپورٹ پہ جب..." مالا عام سے انداز میں ایک پرانی بات یاد کر رہی تھی۔

"مجھے تم سے ایک بات کرنی ہے۔" ماہی جلدی سے بولی۔ اسے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ وہ مالا سے باتیں چھپایا نہیں کرتی تھی لیکن اب یہ بات کیسے بتائے۔ وہ ماہر فرید کے ساتھ اس سرکار کو ڈھونڈنا چاہتی تھی، اس کو اپنے خاندان پہ جادو کرنے سے باز رکھنا چاہتی تھی۔ ماہر کے علاوہ، کوئی اس کی مدد نہیں کر سکتا تھا اور مالا اسے ایسا کبھی نہیں کرنے دے گی۔

"کیا تم اس جادوگر کا اسکیچ بنا سکتی ہو جسے تم نے خواب میں دیکھا تھا؟"

"اسکیچ سے کیا ہو گا؟" مالا کو حیرت ہوئی۔

"شاید میں اسے پہچان لوں۔ میں ویسے بھی خاندان میں سب کو جانتی ہوں۔"

کشمالہ کو آئیڈیا برا نہیں لگا۔ شاید اس طرح اسے معلوم ہو جائے گا، کہ کون حور جہاں بیگم اور شاید خود اس پر بھی جادو کر رہا ہے۔

فون بند کر کے اس نے اسٹوڈیو کی ساری بتیاں روشن کیں۔ پھر بال جوڑے کی شکل میں باندھے اور ان میں برش اٹکا دیا۔ اب وہ اسٹول پہ بیٹھی اور سامنے اسٹینڈ پہ کورا صفحہ لگایا۔ پھر پنسل اٹھائی اور اس کو تراشا۔ وہ تیار تھی۔

کورے صفحے کو دیکھتے ہوئے اس نے آنکھیں بند کیں۔ اس کو وہ چہرہ پوری جزئیات کے ساتھ یاد تھا۔ اس کی جھریاں، سفید بال، سر پہ بندھا نارنجی رومال، وہ آنکھیں، کہاں دیکھا تھا اس نے اسے پہلے؟ یاد کیوں نہیں آ رہا تھا۔

اس نے آنکھیں کھولیں اور پورے انہماک سے ایک لکیر کھینچنے لگی۔ دفعتاً ایک جھٹکے سے پنسل کا سکہ ٹوٹ گیا۔ ساتھ ہی زور سے ہوا چلی۔ کھڑکی کا پٹ پوری قوت سے کھل کے بند ہوا۔

وہ ایک دم سیدھی ہو کے بیٹھی۔ اطراف میں دیکھا۔ تمام بتیاں روشن تھیں۔ وہ اکیلی تھی اور باہر

رات پھیلی تھی۔

اس نے سر جھٹکا اور پنسل دوبارہ تراشنے لگی۔ پھر سے کاغذ پہ لکیر کھینچی۔ اوپری شیلف میں رکھا، پینٹ کا ایک کارٹن ٹھک سے نیچے گرا۔ سارا پینٹ فرش پہ بہہ گیا۔ وہ تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ تھوک نگلا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا لیکن کوئی تھا۔

اس نے جلدی سے پنسل رکھ دی۔ پھر آیت الکرسی پڑھتے ہوئے سر پہ دوپٹہ لیا اور تیزی سے باہر نکلی۔

سیڑھیاں ویران تھیں۔ باہر کے نائٹ بلب جل رہے تھے لیکن لان کے تمام درخت خاموش کھڑے تھے۔ وہ کسی بھی طرف دیکھے بنا تیز قدموں سے تقریباً بھاگتی ہوئی سیدھی اندر آئی اور اپنے کمرے میں جا کے دم لیا۔ دل بری طرح سے دھڑک رہا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ وہ اس کا چہرہ دیکھ چکی ہے۔ اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس کا اسکیچ بنائے۔ کیوں؟ وہ خوفزدہ تھا اور اسے خوفزدہ کرنا چاہتا تھا۔

میں صبح کے وقت جاؤں گی اور اس اسکیچ کو ضرور مکمل کروں گی۔ اس نے دل ہی دل میں عزم دہرایا۔ دل ابھی تک زور زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔

☆☆☆

اس صبح اس کی آنکھ دیر سے کھلی۔ شاید دیر تک جاگتی رہی تھی۔ جب سوئی تو وہی خواب پھر سے آیا۔ وہ منحوس شکل مسکرا کے اسے دیکھ رہا ہے۔ وہ بھاگ رہی ہے اور وہ اس کے تعاقب میں ہے۔ فجر کے قریب وہ سوئی تو اب جاگی۔ بستر سے نکلنے سے پہلے عادتاً موبائل اٹھایا تو زیاد کا میسج جگمگا رہا تھا۔

"آج میں آپ کو سرپرائز وزٹ کروں گا۔"

وہ نیند سے بھری آنکھوں سے مسکرا دی۔ اس کا میسج کرنا یا اس سے ملنے آنا اسے کچھ بھی برا نہیں لگا تھا۔ زیاد کا ظرف بڑا تھا۔ اور اس نے کیا کیا تھا۔ اس کو قریباً ہاں کہہ کے گھر بلا کے ناں کہہ دی۔ پھر بھی زیاد اس بات کو درمیان میں لائے بغیر اس سے اسی احترام سے بات کرتا تھا۔

اس نے کہا تھا، وہ جانے سے پہلے ایک دفعہ اس سے ملنا چاہتا ہے۔ شاید وہ آج ریستوران آئے۔ وہ پیروں کو سلیپرز میں گھسیڑتی بستر سے اٹھی اور بالوں کو گول مول جوڑے میں باندھ لیا۔

ابھی وہ کمرے سے نکلی ہی تھی کہ بخت بی، ماں کی وہیل چیئر ڈرائنگ روم سے باہر لاتی دکھائی دیں۔ اسے دیکھتے ہی ڈرائنگ روم کی طرف اشارہ کیا۔

"آپ کے مہمان آئے ہیں۔" بخت بی کے دانت نکل رہے تھے۔

"زیاد آیا ہے؟" وہ مسکرا دی۔ (اتنی جلدی سرپرائز دے دیا؟) اور ڈرائنگ روم کی طرف چہرہ موڑا۔ دروازہ نیم وا تھا۔ بڑے صوفے پہ بیٹھا شخص یہاں سے دکھائی دیتا تھا۔

کشمالہ کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔

صوفے پہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کے بیٹھا شخص اپنے موبائل کی طرف متوجہ تھا۔ سیاہ پینٹ پہ سفید ڈریس شرٹ پہنے بال جیل سے جمائے بڑھی شیو اور چمکتے سیاہ بوٹس والا آدمی زیاد نہیں تھا۔

"نہیں بیٹے۔ کیف آیا ہے۔ کب سے تمہارا انتظار کر رہا ہے۔"

وہ تیزی سے ماں کے سامنے پنجوں کے بل بیٹھی اور بے چینی سے ان کا چہرہ دیکھا۔

"کچھ کہا ہے اس نے آپ کو؟" اس کی آواز سے جھلکتا خوف چھپ نہیں سکا تھا۔

"ہاں بیٹے۔ اپنی کہانی سنا رہا تھا۔"

"کیسی کہانی؟" اس نے ماں کے ہاتھ تھام لیے۔ وہ اتنی دیر تک اس سائیکو پیتھ اور خطرناک آدمی کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھی رہی تھیں۔ اسے کیوں معلوم نہ ہو سکا؟

"بتا رہا تھا کہ چچا سے ناراضی تھی۔ لندن میں خاندانی بزنس چھوڑ کے الگ ہو گیا تھا۔ وقت گزارنے کے لیے تمہاری نوکری کر رہا تھا۔ اب صلح ہو گئی ہے چچا سے تو جلد ہی لندن واپس چلا جائے گا۔ معذرت کر رہا تھا کہ پہلے نہیں بتا سکا۔"

وہ انہیں دیکھتی رہ گئی۔ ماہر فرید کیسے جھوٹے انداز میں سچ بول لیتا تھا۔ اور ماں... وہ ایسے بتا رہی تھیں جیسے انہیں اس بات سے فرق ہی نہ پڑا ہو۔

"بڑی بی بی پہلے ہی کہتی تھیں۔ یہ کسی اچھے گھر کا لگتا ہے۔" بخت بی کے چہرے کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ اس نے ایک کاٹ دار نظر ان پہ ڈالی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا رخ ڈرائنگ روم کی طرف تھا۔

آہٹ پہ اس نے نظریں اٹھائیں۔ اسے دیکھ کے ہلکا سا مسکرایا۔ یہ وہ مسکراہٹ تھی جو وہ ڈیڑھ ماہ تک ہر صبح گھر سے نکلتے ہی اپنی کار کے آس پاس دیکھا کرتی تھی۔ دل کو کچھ ہوا۔

"تم یہاں کیوں آئے ہو؟" وہ اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ آنکھوں میں غصہ اور آواز میں بے بسی تھی۔

"کہا تھا نا۔ بات کرنی ہے۔ تم نے اپنے ورک پلیس پہ آنے سے منع کیا تھا۔ اور کہاں آتا؟" وہ ٹانگ پہ ٹانگ جما کے بڑے اطمینان سے بیٹھا تھا۔ میز پہ چائے کے برتن رکھے تھے اور سارے میں کڑک چائے اور الائچی کی خوشبو پھیلی تھی۔

کشمالہ نے مٹھی بھینچ لی۔ پھر پلٹ کے ادھ کھلے دروازے کو دیکھا۔ بخت بی ماں کو واش روم لے کر گئی تھی۔ وہ ابھی واپس آتی ہی ہوں گی۔ اسے ان کی واپسی سے پہلے اس آدمی کو اپنے گھر سے نکالنا تھا۔

"مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی۔"

"کیا یہ تمہارا ڈیفنس میکنزم ہے؟ سامنا کرنے کے بجائے فرار اختیار کرنا؟ لڑنے کے بجائے کہیں دور چلے جانا؟" وہ بغور اس کو دیکھ رہا تھا جیسے اس کا مطالعہ کر رہا ہو۔

کشمالہ نے ایک گہری سانس لی۔ اندر ابلتے غصے کو نیچے دھکیلا۔ پھر اس کے سامنے والے صوفے پہ بیٹھی۔ "مجھے لڑنا آتا ہے کیف! لیکن میں اپنی لڑائیاں سوچ سمجھ کے منتخب کرتی ہوں۔"

"پھر لڑو مجھ سے، حساب مانگو، میں حساب دوں گا۔ لیکن وہ نہ کرو جو ظہیر کے ساتھ کیا تھا۔ بغیر سنے یا کہے لڑائی چھوڑ کے مت جاؤ۔"

"ظہیر کو درمیان میں مت لاؤ۔ ورنہ پچھتاؤ گے۔" اس نے انگلی اٹھا کے تنبیہہ کی۔ اس کی آنکھوں میں کچھ تھا جو ماہر چونکا۔ پھر سر جھٹکا۔ ٹانگ سے ٹانگ ہٹائی اور قدرے آگے ہوا۔

"میں صرف تم سے ایک دفعہ بات کرنا چاہتا ہوں۔" اس کی آواز دھیمی تھی۔

"اس کے بعد کیا ہوگا؟"

ماہر نے ہلکے سے کندھے اچکائے۔

"جو تم کہو گی وہی ہوگا۔ لیکن میری بات سننے کے بعد۔"

وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ درمیان میں میز پہ رکھی، ٹھنڈی چائے اور الائچی کی خوشبو حائل تھی۔

"میں کہوں میری زندگی سے چلے جاؤ تو ایسا کرو گے؟" "ایک لمحے کی دیر کیے بغیر چلا جاؤں گا۔"

وہ چند لمحے کے لیے کچھ بول نہیں سکی۔ وہ اسی سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

"میں پیچھے بھاگنے والوں میں سے نہیں ہوں' کشمالہ بی بی۔ نہ میں بار بار صفائیاں دیتا ہوں۔ لیکن ایک دفعہ..." انگشت شہادت اٹھا کے دکھائی۔ "ایک دفعہ میں اپنی صفائی ضرور دوں گا۔ کب اور کہاں یہ تم طے کرو گی۔"

وہیل چیئر کے پہیوں کی آواز پہ، ماہر نے چہرے پہ مسکراہٹ طاری کر لی اور پیچھے ہو کے بیٹھ گیا۔ بخت بی، ماں کی وہیل چیئر دھکیلتی اندر آ رہی تھیں۔

"آپ کے گھر میں فیملی فوٹوز نہیں لگے ہوئے۔" وہ چہرہ دائیں بائیں گھماتے ہوئے سرسری انداز میں بولا۔ غالباً ان کے جانے سے پہلے گفتگو کا سلسلہ یہیں سے ٹوٹا تھا۔

"ماں کو پسند نہیں ہے۔ کہتی ہیں تصویریں لگانے سے گھر میں فرشتے نہیں آتے... لیکن..." وہ انہی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ "شیاطین پھر

بھی آجاتے ہیں۔"

"شیاطین ہر جگہ ہیں' کشمالہ بی بی! بس پہچاننے میں وقت لگتا ہے۔"

وہ مسکرایا۔ انداز میں ڈھٹائی تھی۔ اس کو ان باتوں سے فرق نہیں پڑتا تھا۔

کشمالہ نے ایک گہری سانس اندر کھینچی' پھر اسی کے انداز میں پیچھے ہو کے بیٹھی اور ٹانگ پہ ٹانگ جمالی۔

"ماں بتا رہی تھیں کہ تم انہیں اپنی فیملی کے بارے میں بتا رہے تھے۔" اب کے وہ بولی تو آواز ٹھنڈی تھی۔ "تمہارے والد کی ڈیتھ کا سن کے مجھے بہت افسوس ہوا تھا۔"

"ہاں بیٹے! اللہ ان کو جنت نصیب کرے۔" ماں نے خلوص دل سے دعا دی۔

ماہر نے سر کو ہلکا سا خم دیا' جیسے تعزیت وصول کی ہو۔

"لیکن تمہارے ایک دوسرے فادر بھی تو تھے نا۔" سادگی سے پلکیں جھپکا کے پوچھا۔

کچھ تھا جو ماہر فرید کے چہرے میں پل بھر میں بدل گیا۔ مسکراہٹ غائب ہوئی۔ آنکھوں میں بہت کچھ ابھر کے ڈوبا۔

"سنا ہے وہ بہت اچھے انسان تھے۔ تم دونوں بھائیوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔" وہ جوڑے سے نکلی ایک لٹ انگلی پہ لپیٹ رہی تھی۔ "ان کی بھی ایکسیڈنٹ میں ڈیتھ ہو گئی تھی نا۔ تم ان کو بہت مس کرتے ہو گے۔"

"بہت زیادہ۔" وہ دبی آواز میں بڑبڑایا۔ مٹھیاں بھینچ لیں۔ ایک دم کمرے میں گھٹن بڑھ گئی تھی۔ اسے ہوا چاہیے تھی۔

ماں نے چہرہ موڑ کے کشمالہ کو تادیبی نظروں سے گھورا۔ لیکن وہ کہے جا رہی تھی۔

"سنا ہے تمہارے اسٹیپ فادر..."

وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔ "میں تم سے ملنے ریستوران آؤں گا۔ دوپہر میں۔ اوکے؟" ایک کاٹ دار نظر اس پہ ڈالی۔ وہ پہلی دفعہ ہلکا سا مسکرائی۔ بیٹھے بیٹھے کندھے اچکائے۔

"شیور۔" پھر زیر لب بڑبڑائی۔ "پچھتاؤ گے۔"

وہ جو ماں کو جھک کے خدا حافظ کہہ رہا تھا' پھر سے چونکا۔ ایک نظر اسے دیکھا۔ چھٹی حس نے سرخ بتی جلائی اور بجھائی۔ کچھ تھا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

"بیٹے آتے جاتے رہا کرو۔ یہ تمہارا اپنا ہی گھر ہے۔" ماں اس کو اپنے ازلی مہمان نواز انداز میں کہہ رہی تھیں۔

"خدا حافظ کیف!" وہ پیچھے سے پکار کے بولی۔ پھر رکی۔ "یا ماہر... جو بھی نام تم آج کل استعمال کر رہے ہو۔"

اس نے جاتے جاتے، بس ایک خاموش نظر اس پہ ڈالی اور باہر نکل گیا۔ حور جہاں بیگم نے خفگی سے اپنی بچی کو دیکھا، جو سینے پہ بازو لپیٹے بیٹھی ان سے زیادہ خفا لگ رہی تھی۔ مسکراہٹ اب غائب ہو گئی تھی۔

"اس کے سوتیلے باپ کا ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ کس کو پسند ہوتا ہے یہ رشتہ؟"

"اور آپ کو کیا ضرورت تھی اس کی اتنی خاطر کرنے کی؟ میں نے اسے کسی وجہ سے نوکری سے نکالا تھا۔"

"تم تو کہہ رہی تھیں اس نے خود استعفیٰ دیا تھا۔"

"میرے الفاظ نہ پکڑیں۔" وہ جھنجلا کے اٹھی اور باہر نکل گئی۔ صبح ہی صبح سارا موڈ خراب ہو گیا تھا۔

زیاد کا سرپرائز ریستوران میں موجود تھا۔ وہ جیسے ہی مین ہال میں داخل ہوئی' لبوں پہ خود بخود مسکراہٹ بکھر گئی۔ ماہر فرید سے ملاقات کی ساری کلفت دور ہونے لگی۔

آنسوؤں سے لبریز، شیشے کی دیوار کے ساتھ ایک میز پہ چار افراد بیٹھے تھے۔ ان میں ایک زیاد بھی تھا۔ وہ چاروں اپنے سامنے کافی' چند کاغذ اور لیپ ٹاپس کھولے بیٹھے گفتگو میں مصروف تھے۔ یقیناً زیاد کی کوئی ورک میٹنگ چل رہی تھی جسے اس نے مالا کے ریستوران میں منعقد کیا تھا۔

وہ اسی دیوار کے ساتھ بیٹھے تھے جسے وہ پینٹ

کر رہی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے آگے آئی اور دیوار کے ساتھ اپنا میٹ بچھایا۔ پھر زمین پہ بیٹھی اور اپنے رنگ سامنے پھیلا لیے۔ سر پہ سبز سلک کا رومال باندھے وہ مسکرا کے چہرہ جھکائے اپنے رنگ مکس کرنے لگی۔ پھر نگاہیں اٹھائیں تو شیشے کی دیوار میں پیچھے بیٹھے زیاد کا عکس دکھائی دیا۔

وہ کریم کلر کی پولو شرٹ میں ملبوس اسے ہمیشہ کی طرح ہینڈسم لگ رہا تھا۔ دونوں ہاتھ اٹھا کے وہ بریفنگ دے رہا تھا جب نظر کشمالہ کی پشت پہ پڑی۔ وہ ان کے سامنے ہی زمین پہ بیٹھی تھی۔ زیاد کے لبوں پہ مسکراہٹ ابھری جسے اس نے فوراً سے سنجیدگی میں بدل دیا۔

اب اس کے سامنے بیٹھا آدمی کچھ کہہ رہا تھا۔ بظاہر اس کی بات دھیان سے سنتے ہوئے، زیاد سلطان نے موبائل اٹھایا اور چند بٹن دبائے۔ وہ جو پیلیٹ پہ رنگ ڈال رہی تھی، موبائل کی تھرتھراہٹ پہ مسکرادی۔ جانتی تھی کس کا میسج ہوسکتا ہے۔

''ایک پوٹینشل کلائنٹ سے میٹنگ میں ہوں۔ دعا کیجیے گا یہ ہماری کمپنی کو اپنی کیمپین کے لیے ہائر کرلیں۔''

کشمالہ کی انگلیاں کی پیڈ پہ چلنے لگیں۔

''اور اتفاق سے آپ کے کلائنٹس نے آپ کو میری ورک پلیس پہ مدعو کرلیا۔''

''نہیں۔ میں نے خود یہاں میٹنگ رکھی تھی تاکہ آپ سے ملاقات بھی ہوجائے۔''

زیاد سلطان کا جواب ہمیشہ کی طرح سچا اور صاف تھا۔ کوئی ٹیڑھ نہیں۔ کوئی کہانی نہیں۔ اس نے مسکرا کے سر اٹھا کے اسے دیکھا۔ وہ سنجیدگی سے اب ان افراد کے سامنے ایک آئیڈیا پیچ کررہا تھا۔ گاہے بگاہے میز پہ رکھی موبائل اسکرین پہ بھی نظر ڈال لیتا۔ وہ اس کی طرف پشت کیے زمین پہ بیٹھی اپنے رنگوں میں مصروف تھی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ آپس میں بات کررہے ہیں۔

''ڈیجیٹل میڈیا کیمپین کے لیے آپ کی اسٹریٹجی میں ایسا کیا ہوگا جو دوسری پی آر کمپنیز سے مختلف ہوگا؟'' اس کا مہمان سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ ''کیونکہ انعم میڈم موسم بہار کی کلیکشن کو لے کر بہت پکی ہیں۔ وہ عام کپڑا نہیں بناتیں۔ وہ بہترین لگژری ایڈٹ لا رہی ہیں۔ اس لیے انہیں کسی کا آئیڈیا پسند نہیں آرہا۔''

(ابھی گرمیاں ختم نہیں ہوئیں اور کپڑوں کے برانڈز اگلی موسم بہار کی تیاری کررہے ہیں۔ کمپیٹیشن۔) کشمالہ نے مسکرا کے سر جھٹکا اور برش کے بالوں میں پینٹ پھنسایا۔ دفعتاً وہ چونکی۔ (انعم؟) پھر پلٹ کے ان افراد کو غور سے دیکھا۔

''کیا یہ انعم پرویز کا Clothing برانڈ ہے؟'' اس کی انگلیوں نے تیزی سے موبائل پہ پیغام لکھا۔ زیاد کی اسکرین چمکی تو اس نے ایک نظر پیغام کو دیکھا۔ پھر ہلکے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ سامنے شیشے کی دیوار میں اس کا عکس دیکھ سکتی تھی۔ لبوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے برش رکھ دیا اور تیزی سے ٹائپ کرنے لگی۔

ادھر زیاد کہہ رہا تھا۔

''ڈیجیٹل میڈیا کیمپین دو طرح سے چلائی جاتی ہے۔ ایک Infwencer مارکیٹنگ اور دوسری.....'' موبائل کی اسکرین دوبارہ روشن ہوئی تو اس نے گفتگو کی رفتار سست کرتے ہوئے اسکرین کو دیکھا۔ پھر ہلکا سا چونکا۔ جیسے متذبذب ہوا ہو۔

''یو نو واٹ . . . میرا خیال ہے آپ کی باس... انعم میڈم... تمام آئیڈیاز کو اس لیے ریجیکٹ کررہی ہیں کیونکہ وہ بتا نہیں رہیں کہ انہیں کیا چاہیے۔'' وہ آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ کنکھیوں سے اسکرین پہ کھلے ایک ایک سطر کے نئے میسجز کو بھی دیکھ رہا تھا۔

کشمالہ چہرہ جھکائے مسکراتے ہوئے ٹائپ کررہی تھی۔

''کیا مطلب؟'' سامنے بیٹھے آدمی نے پہلو بدلا۔

''میں اپنا ہوم ورک کرکے آیا ہوں۔ آج سے

چار سال پہلے انعم نے ووگ ٹاورز میں ایک شاپ کھولی تھی۔ اس میں وہ ایلان اور ثانیہ مسکاتیہ کے کپڑے اسٹاک کرتی تھیں۔ اصل برانڈ پہ آرٹیکلز ختم ہوجاتے لیکن انعم کے پاس دستیاب ہوتے۔ یہ کپڑے لاہور کی ایلیٹ میں ہاتھوں ہاتھ بک جاتے تھے۔ انعم ایڈوانس پے منٹ لیتی تھیں۔ لیکن ان کا بزنس ماڈل Sustainable نہیں تھا۔ اس لیے دو سال بعد ایک اسکینڈل بنا تھا۔"

ایک غیر آرام دہ سی کیفیت اس ٹیبل پہ چھاتی گئی۔

"یہ تب ہوا جب انعم نے بہت سے آرٹیکلز انڈیا بھیجنا شروع کر دیے۔ تھینک یو۔" اس نے رک کے ویٹر سے کہا جو تازہ کافی کے کپ ان کے سامنے رکھ رہا تھا۔

"لاہور کی بہت سی "آنٹیز" (زیاد نے دو انگلیوں سے کوٹ ان کوٹ کا اشارہ کیا) کو پے منٹ کرنے کے باوجود جب کپڑے نہیں ملے تو انہوں نے ایک دن انعم کی شاپ پہ حملہ کیا۔ بہت گالم گلوچ اور لڑائی ہوئی۔"

ان افراد نے ایک دوسرے کو دیکھا لیکن کہا کچھ نہیں۔ خاموشی سے کافی کے کپ اپنی طرف کھسکائے۔ چمچوں کے کانچ سے ٹکرانے کی آوازیں آئیں۔

"آخر میں انعم نے سب کے پیسے واپس کیے۔ آرٹیکلز وہ پہلے ہی دگنی پرائس پہ انڈیا بیچ چکی تھیں۔ اس حملے کی ویڈیو نہیں لیک نہیں ہوئی کیونکہ انعم کے والد ایک بااثر آدمی ہیں۔ لیکن اس واقعے نے انعم کی کریڈیبلٹی بہت خراب کی۔"

"ہم نے سب کے پیسے واپس کر دیے تھے۔ سارا مسئلہ ری اسٹاک کا تھا۔ برانڈز ہمیشہ..."

"میں ان کو جج نہیں کر رہا۔ اپنے آئیڈیے کی بنیاد بتا رہا ہوں۔" زیاد سلطان نے نرمی سے ان کی بات کاٹی۔ پھر نظر اسکرین پہ ڈالی۔ اس پہ ایک کے بعد ایک میسیج ابھر رہا تھا۔ اس نے گہری سانس لی۔

"انعم نے اس کے بعد دو دفعہ اپنی لان لانچ کی ہے۔ دونوں دفعہ انہوں نے سارا اسٹاک دیا لیکن لاہور کی آنٹیز اپنی کٹی پارٹیز میں آج بھی انعم کو گوسپ کا موضوع بناتی ہیں۔ انعم کو کوئی آئیڈیا اس لیے نہیں پسند آرہا کیونکہ وہ اپنی کلیکشن صرف بیچنا نہیں چاہتیں۔ ان کو اپنی کھوئی ہوئی Crealibility واپس چاہیے۔"

"اور آپ کے پاس اس کے لیے کیا پلان ہے؟"

زیاد سلطان نے ایک منٹ کہہ کے اپنا فون اٹھایا۔ سامنے موجود چیٹ کھولی۔ سنجیدہ چہرے کے ساتھ وہاں لکھی چند سطور پڑھیں۔ پھر اپنے لیپ ٹاپ کو دیکھا۔ وہاں ایک پریزنٹیشن اس کی منتظر تھی۔ کن انکھیوں سے اس نے شیشے کی دیوار کو دیکھا۔ وہ اس کے عکس کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ بنا آواز کے حرکت کیے۔

"ٹرسٹ می۔"

اور زیاد سلطان نے کشمالہ مبین پہ اعتماد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے لیپ ٹاپ اسکرین فولڈ کر دی اور سنجیدگی سے ان کی طرف متوجہ ہوا۔

"ہم اس کیمپین کے لیے خوب صورت چہروں اور گوری رنگت والی ماڈلز نہیں لیں گے۔ ہم Inclusirity پہ مبنی کیمپین چلائیں گے۔ ہماری ماڈلز عام لڑکیاں ہوں گی جن کی رنگت (اس نے تھوک نگلا) سانولی ہوگی۔ ان کے فگرز پرفیکٹ نہیں ہوں گے۔ وہ دبلی بھی ہوں گی اور فربہ بھی۔ ان کے چہرے صاف بھی ہوں گے اور ان چہروں پہ ایکنی بھی ہوگی۔ تاکہ ہر وہ لڑکی جو خود کو نامکمل سمجھتی ہے اس کو لگے کہ انعم کے بنائے کپڑے اس کے لیے ہیں۔ وہ ان کو پہن کے خوبصورت دکھ سکتی ہے۔"

کشمالہ نے مسکرا کے فون واپس رکھ دیا۔ اس کی بے توجہی کے باعث برش کے بالوں میں پھنسا رنگ جم رہا تھا۔ اس نے برش کو پانی کے پیالے میں ڈبویا۔ رنگ گھلنے لگا۔ بال نرم ہوئے۔ وہ پھر سے نیا رنگ بنانے لگی۔ لبوں سے مسکراہٹ جدا نہیں ہو رہی تھی۔

دار چینی اور کافی کی مہک دھیرے دھیرے ختم

ہوتی گئی۔ گفتگو دم توڑ گئی اور وہ لوگ اٹھ گئے۔ اسے اپنے قریب آتے قدم سنائی دیے۔ پھر دو جوتے نظر آئے۔
وہ مگن انداز میں پینٹ کیے گئی۔ یہاں تک کہ وہ اس کے ساتھ زمین پہ بیٹھا۔
"کہاں سے آتے ہیں آپ کو ایسے آئیڈیاز؟"
وہ ستائشی انداز میں پوچھ رہا تھا۔ کشمالہ نے چہرہ موڑ کے اسے دیکھا۔ گلاس وال سے آتی دھوپ میں وہ اس کے ساتھ بیٹھا بہت ممنون لگ رہا تھا۔
"آئیڈیاز ہی ہیں میرے پاس۔ ان پہ عمل کرنے کے لیے بہت سا پیسا نہیں ہے۔"
"آپ انعم کو کیسے جانتی ہیں؟"
"لاہور Enterpreneure ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ انعم کی کہانی سب کو معلوم ہے۔" اس نے مسکرا کے شانے اچکا دیے۔
"میرے باس بہت خوش ہوں گے۔" وہ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے بیٹھا تھا۔ چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ وہ بھی پورے دل سے مسکرا دی۔ پھر ایک چبھن سی محسوس ہوئی۔ ایک پھانس کے نہ نکلنے کی چبھن۔
"آئی ایم سوری۔"
زیاد کے ابرو اچنبھے سے اکٹھے ہوئے۔
"کس چیز کے لیے؟"
"آپ کو معلوم ہے کس چیز کے لیے۔"
وہ دھیما سا مسکرایا۔ "کیا میں بغض پالنے والوں میں سے لگتا ہوں؟"
سبز رومال والی لڑکی نے مسکرا کے دائیں بائیں گردن ہلائی۔ دھوپ سے اس کی آنکھیں سنہری لگ رہی تھیں۔
"جو بات شروع ہی نہیں ہوئی اس کے ختم ہونے کا کیا افسوس کرنا۔ ہم کزنز تو ہیں ہی۔ اچھے دوستوں بھی بن سکتے ہیں۔"
اس نے مسکرا کے سر ہلا دیا۔ "جی۔ ہم اچھے دوست بن سکتے ہیں۔"
(مرد اور عورت کبھی دوست نہیں بن سکتے۔) ماں کی آواز کسی نشتر کی طرح دماغ میں چبھی۔ لیکن کشمالہ نے اسے جھٹک دیا۔ پرانے زمانے کی باتیں۔
"ارے ہاں، کل میں ریستوران آیا تھا بکنگ کروانے تو اسٹاف نے بتایا کہ آج، آپ کی سالگرہ ہے۔ میں آپ کے لیے کچھ لایا تھا۔" وہ یاد کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ہلکا سا ہنس دی اور اسے باہر جاتے دیکھتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک شاپنگ بیگ تھا۔ وہ واپس اس کے ساتھ زمین پہ بیٹھا اور بیگ درمیان میں رکھا۔
"آپ نے بتایا تھا کہ آپ کو اچھے جوتے پسند ہیں۔ مجھے یہ اچھے لگے۔ کچھ دن پہلے لیے تھے۔ آج دینے کا موقع بن گیا۔"
کشمالہ نے مسکرا کے بیگ میں ہاتھ ڈالا۔ اندر چاکلیٹس کا ایک باکس تھا اور ساتھ ایک جوتوں کا ڈبہ۔ سیاہ کھسے۔ سادہ مگر بہت خوب صورت۔
"میں کھسے نہیں پہنتی لیکن یہ ضرور پہنوں گی۔ تھینک یو۔ لیکن . . ." اس نے مسکراہٹ دبائی۔ "آج میری سالگرہ نہیں ہے۔"
زیاد نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔ "اسٹاف نے بتایا تھا کہ آپ کے ڈاکومنٹس کے مطابق آج آپ کی سالگرہ ہے۔"
"میرے ڈاکومنٹس پہ میری سالگرہ غلط لکھی ہے۔ برتھ سرٹیفکیٹ پہ غلط درج ہو گئی تھی اور پھر او لیولز تک بدلی نہیں جا سکی۔ بعد میں سارے ڈاکومنٹس اسی تاریخ کے ساتھ بنتے گئے۔ اب کیا تبدیل کرواتی۔"
"یعنی اس سب کا کوئی فائدہ نہیں ہوا؟"
زیاد نے افسوس سے اس کے ہاتھ میں پکڑے جوتوں کو دیکھا۔
"تاریخ سے کیا ہوتا ہے؟ سالگرہ کسی بھی دن منائی جا سکتی ہے۔ اور یہ جوتے بہت خوبصورت ہیں۔ سیاہ رنگ ویسے ہی مجھے پسند ہے۔"
"ہر ایک کو نہیں ہوتا۔" وہ اداسی سے مسکرایا۔
وہ دونوں شیشے کی دیوار کے ساتھ بیٹھے تھے۔ دھوپ سیدھا ان کے اوپر پڑ رہی تھی لیکن اے سی کی

ٹھنڈ کے باعث وہ بے ضرر لگ رہی تھی۔

"آپ کو اب بھی اپنی رنگت کا کمپلیکس ہے زیاد!" وہ جوتے واپس پیک کرنے لگی۔ انداز سادہ تھا۔ زیاد کی گردن میں گلٹی سی ابھر کے معدوم ہوئی۔

"شاید۔"

"ایک زمانے میں مجھے بھی اپنے چہرے کا کمپلیکس تھا۔"

اب کی دفعہ حیران ہونے کی باری زیاد سلطان کی تھی۔ اس نے بے یقینی سے کشمالہ مبین کے خوب صورت، سپید چہرے کو دیکھا۔

"ناممکن۔"

"میرے چہرے پہ بہت ایکنی تھی اور میں نے، اس کی وجہ سے بہت تکلیف اٹھائی تھی۔" اس نے سر جھکایا۔ لہجے میں کرچیاں سی ابھریں۔ "لیکن پھر میں نے خود کو اس کمپلیکس سے نکالا۔ ایکنی کا علاج کروایا۔ کہیں دور اندر میں اب بھی خوف زدہ ہوں کہ وہ واپس نہ آجائے۔ میں ہر صبح اٹھ کے اپنا چہرہ دیکھتی ہوں۔"

"میں پوری طرح خود کو اپنی رنگت کے کمپلیکس سے نہیں نکال پایا۔ حالانکہ اب میں اس بارے میں زیادہ نہیں سوچتا۔ لیکن میرے ابو..." وہ سر جھکائے یہ سب کہتے ہوئے ایک عام انسان لگا تھا۔ اس کے اپنے جیسا۔

"میری ماں کی رنگت کے باعث ان کو ساری عمر میرے والد سے باتیں سننی پڑی تھیں۔ ابو خوب صورت تھے۔ گورے اور خوب صورت۔ امی سے ان کی شادی زبردستی ہوئی تھی۔ امی نے اپنے رنگ کی وجہ سے بہت تکلیف سہی ہے۔" وہ اب سامنے شیشے کی دیوار پہ چپٹے ہوئے آنسو دیکھ رہا تھا۔

"میری ماں بہت صابر اور سمجھدار عورت ہے کشمالہ۔ ان کی ساری زندگی کا محور میں ہی ہوں۔ وہ اپنے لیے نہیں میرے لیے جیتی ہیں۔ میں ایک زمانے میں خود کو بدصورت سمجھتا تھا۔ پوری طرح نہ سہی، لیکن جتنا بھی میں اس کمپلیکس سے نکلا ہوں امی کی وجہ سے نکلا ہوں۔ انہوں نے ہی میری شخصیت بنائی ہے۔"

وہ تحیر سے اسے دیکھے گئی۔ کیا اتنے پرکشش آدمی کو بھی اپنی شخصیت کا کمپلیکس ہو سکتا تھا؟

"کیسی ہیں آنٹی؟"

زیاد نے ایک ٹھنڈی سانس باہر خارج کی۔

"کوئی عجیب سی بیماری ان کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ ایسے لگتا ہے کوئی بددعا ہے جو ہمارے خاندان کا پیچھا کر رہی ہے۔"

"شاید وہ بددعا میں ہوں۔ میری وجہ سے آپ کے اوپر کوئی جادو کر رہا ہے۔" اس نے دل میں سوچا۔ کہا نہیں۔

وہ زیاد کو بتانا چاہتی تھی کہ اس نے خواب میں زیاد کی تصویر پہ بھی خون دیکھا تھا۔ اس کے انکار کی وجہ صرف ماں کی صحت نہیں تھی۔ وہ جادو بھی تھا جو کشمالہ سے جڑے ہر انسان کو اپنی لپیٹ میں لے گا۔ اس کے قریب رہ کے زیاد سلطان کو صرف نقصان ہوگا۔ نگینہ بیگم کی طبیعت تب سے خراب رہنے لگی تھی جب سے انہوں نے زیاد اور مالا کے رشتے کا سوچا تھا۔

لیکن وہ یہ سب بتا کے اسے پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"آپ واپس کب جا رہے ہیں؟" سوال ابھی لبوں میں ہی تھا جب اسے ایک احساس ہوا۔

ایک احساس جو پہلے سے ہو جاتا ہے۔ کسی کے اندر آنے سے پہلے۔ کسی کے آپ کو دیکھنے سے پہلے۔ کسی خواب کی سی کیفیت میں کشمالہ نے چہرہ مین ہال کے داخلی حصے کی طرف موڑا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔

زیاد کچھ کہہ رہا تھا لیکن وہ سن نہیں رہی تھی۔ وہ وہیں دیکھتی رہی۔ ایک سیکنڈ۔ دو سیکنڈ۔

گھڑی کی ٹک ٹک...

اور پھر وہ اندر داخل ہوا۔ موبائل پہ بٹن دباتے،

متلاشی نظروں سے اطراف میں دیکھ رہا تھا۔ اور وہ اس کو۔
دفعتاً ماہر کے قدم زنجیر ہوئے۔ نظریں شیشے کی دیوار کے ساتھ بیٹھے دو چہروں پہ جا رکیں۔
ایک زخمی سا تاثر بھوری آنکھوں میں ابھرا۔ جسم کے سارے اعصاب تن گئے۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ پھر الٹے قدموں پلٹ گیا۔ جیسے کوئی فلم ریوائنڈ ہو جاتی ہے۔ جیسے وہ وہاں آیا ہی نہیں تھا۔
موبائل کی تھرتھراہٹ پہ وہ چونکی۔ زیاد اب بھی کچھ بتا رہا تھا۔ مگر اس کا ذہن بٹ چکا تھا۔
"میں سامنے ایک کیفے میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"
یہ ایک نیا نمبر تھا۔ انگلینڈ کے ۴۴ کوڈ والا واٹس ایپ نمبر۔ یقیناً ماہر فرید کا اصل نمبر۔
وہ بات کرنا چاہتا تھا۔ اور بات تو اسے بھی کرنی تھی۔
"زیاد مجھے کہیں پہنچنا تھا۔ بس ایک چھوٹا سا کام ہے۔"
"اوہ۔ میں ڈراپ کر دوں؟ میرے پاس کمپنی کی کار ہے۔" وہ وقت دیکھتے ہوئے زمین سے اٹھ کھڑا ہوا۔ لباس کی نادیدہ گرد جھاڑی۔
"نہیں۔ مجھے یہ خود ہی کرنا ہوگا۔" اس نے زیاد کی دی چاکلیٹس اور جوتے وہیں اپنے سامان کے ساتھ رکھ دیے۔ اسے ماہر فرید سے ملاقات میں زیادہ دیر نہیں لگنی تھی۔

☆☆☆

جس ریستوران میں وہ اس کا انتظار کر رہا تھا، وہ ایک چھوٹا سا بریک فاسٹ کیفے تھا۔ اونچی چھت سے فانوس لٹک رہے تھے۔ دیواروں پہ ماڈرن گریفٹس بنی تھیں۔ اور سارے میں انگریزی ناشتے کی خوشبو پھیلی تھی۔ یہاں ابھی ناشتہ اور برنچ چل رہا تھا۔
سبز رومال اور ڈھیلے ڈھالے کرتے ٹراوزر والی لڑکی سنجیدہ چہرے کے ساتھ، اندر داخل ہوئی اور سیدھی لکڑی کے زینے کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے دوپٹہ گردن میں مفلر کی طرح لے رکھا تھا اور پرس کا اسٹریپ ایک کندھے سے گزار کے دوسرے پہ لٹکا رکھا تھا۔ وہ آج غصے میں نہیں تھی۔ وہ پرسکون تھی۔
بالائی منزل کی روشنیاں مزید مدھم تھیں۔ خوب ناک سا ماحول بنا ہوا تھا۔ وہ ایک کونے والی میز پہ بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ گلاس وال تھی جہاں سے نیچے سڑک اور سامنے ریستورانوں کی قطار نظر آتی تھی۔ اسے دور سے آتے دیکھ کے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ چلتی ہوئی اس کے عین سامنے آ رکی۔ اب ان دونوں کے درمیان صرف لکڑی کی ایک میز تھی۔
وہ دونوں کتنے عرصے بعد یوں آمنے سامنے تھے۔ مالا نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔
کیا یہ وہی شخص تھا جو اس کے ہینڈ بیگز اٹھا لیتا تھا؟ اس کے لیے کار کا دروازہ کھولتا تھا؟ بیٹھنے سے پہلے اس کے لیے کرسی کھینچتا تھا؟ شاید نہیں۔ یہ کوئی اور تھا۔ اس کا لباس بھی الگ تھا اور کلاس بھی۔
"یہاں بیٹھو اور تحمل سے میری بات سنو۔" ماہر آگے بڑھا اور ایک کرسی کھینچی۔ پھر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
مالا نے اس کے ہاتھوں کو دیکھا جو کرسی کے دہانے پہ جمے تھے۔ (شاید یہ وہی تھا۔)
"میں معافی مانگنے نہیں آیا۔ جانتا ہوں تم مجھے معاف نہیں کرو گی۔"
وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ میز کے وسط میں ایک ادھ پیے کافی کپ کے ساتھ ایک مصنوعی پودا رکھا تھا۔ زرد روشنی میں اس کے پتے بھورے لگ رہے تھے۔
"میں صرف صفائی دینے آیا ہوں۔ کیا تم میری صفائی سن سکتی ہو؟"
کشمالہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی نظریں پودے کے پتوں پہ تھیں۔ ان پہ ہلکی ہلکی سی گرد جمع تھی۔
"میری ایک بہن ہے۔ ہلال شمس۔ وہ لاپتہ ہے۔ میں اس کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ یاد ہے میں نے تمہیں اس کی تصویر دکھائی تھی؟"

وہ اگلے چند منٹ بولتا رہا۔ مختصر فقرے۔ تکلیف سے لیا گیا نام۔ ہلال اس کے لیے کیا تھی اور وہ کیسے کھوئی تھی۔

وہ چہرے پہ ایک ہی جیسے تاثرات لیے سنے گئی۔

''میرا دشمن بہت حساس ہے۔ وہ میری ہر حرکت سے آگاہ ہوتا ہے۔ میں نے وہ لائٹر تمہارے پرس میں نہیں رکھا تھا۔ یہ اس نے کیا ہے۔ میری بہن اس کے پاس ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ میں اس تک پہنچوں۔''

وہ کچھ نہیں بولی۔ پودے سے نظریں اٹھا کے اسے دیکھنے لگی۔

''ہاں میں نے جھوٹ بولے ہیں۔ لیکن میں نے ہمیشہ تمہاری حفاظت کی ہے۔ میں نے کبھی تمہیں نقصان نہیں پہنچایا۔ میں تمہارا تعاقب کار نہیں ہوں۔ کوئی اور ہے جو...''

وہ بولتے ہوئے اس کے تاثرات کو بغور دیکھ رہا تھا۔ جیسے اسے سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ ٹیک لگائے سینے پہ بازو لپیٹے اسے دیکھ رہی تھی۔

''تمہیں میرا یقین نہیں آیا نا۔'' وہ زخمی سا مسکرایا۔ ''کسی کو ماہر فرید کا یقین نہیں آتا۔''

''تم نے مجھے بھی نقصان نہیں پہنچایا؟'' وہ پہلی دفعہ بولی۔ اس کی آنکھوں میں دیکھ کے۔ کچھ تھا وہاں جو وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

''ہاں۔'' وہ صاف گوئی سے بولا۔

''کیا تم نے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا؟'' اس کی آواز بلند ہوئی۔

''نہیں، کشمالہ!''

کچھ تھا جو کشمالہ مبین کی آنکھوں میں چھن سے ٹوٹا تھا۔

''میں نے تمہیں سچ بولنے کا دوسرا موقع دیا تھا، کیف! اس لیے نہیں کہ تمہیں معاف کر دوں۔ بلکہ اس لیے کہ شاید میرے دل میں تمہاری نفرت کچھ کم ہو سکے۔ لیکن نہیں۔'' وہ تاسف سے نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

وہ چونکا۔ کچھ تھا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

''کیا مطلب؟''

''تم نے میرا ریستوران کیوں خریدا؟'' وہ دبا دبا سا غرائی۔

وہ سناٹے میں رہ گیا۔

''اوشن؟ میں نے اسے نہیں....''

''میں نے کہا تھا ظہیر کو درمیان میں مت لاؤ۔ پچھتاؤ گے۔'' ماہر پہ جمی اس کی آنکھیں گلابی پڑ رہی تھیں۔ ''تمہارے جانے کے بعد میں نے ظہیر سے بات کی تھی۔ اتنے ماہ بعد میں نے سوچا کہ میں اس سے پوچھوں تو سہی کہ اس نے اوشن... میرا اوشن کیوں بیچا؟'' میرا کہتے ہوئے اس نے سینے پہ انگلی رکھی۔ آنکھوں کے کنارے پہ آنسو اٹکے تھے۔

''اور جانتے ہو مجھے کیا معلوم ہوا؟ کہ وہ اوشن جس کو میں نے اپنی زندگی کے پانچ سال دیے، اسے تمہاری انویسٹمنٹ ہولڈنگ کمپنی نے ایک لبنانی فوڈ چین کو بیچ دیا تھا۔''

وہ بالکل ساکت بیٹھا تھا۔ (مالک...)

''اور پھر مجھے سمجھ میں آیا کہ تمہارے چچا، عبدالمالک فرید اس روز مجھ سے خود کیوں نہیں ملے تھے۔ انہوں نے تمہارے بھائی کو مجھ سے ملنے کیوں بھیجا تھا۔ تاکہ میں انہیں پہچان نہ جاؤں۔ وہ اس لبنانی گروپ کے ساتھ اوشن میں آتے رہتے تھے۔ یہ سب تمہارا پلان تھا۔ مجھے جاب لیس کرنے کا۔''

''میں فرید ہولڈنگ نہیں چلاتا۔'' وہ آگے ہوا اور تیز لہجے میں بولا۔ ''وہ کمپنی مالک چلاتا ہے۔''

''میں نے اس بارے میں بھی معلوم کروایا ہے۔ اس کمپنی کے سی ای او تم ہو، کیف۔ صرف تم۔''

''ہماری کمپنی ساری دنیا میں انویسمنٹ کرتی ہے۔ میں اوشن کی ڈیل کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' میز پہ رکھی اس کی مٹھیاں بھنچ چکی تھیں۔ آواز میں بے بسی تھی۔ غصہ تھا۔

''تمہارے دستخط ظہیر کے اس کانٹریکٹ پہ موجود ہیں۔''

''مالک مجھ سے ہر مہینے دو سو کاغذات سائن کرواتا ہے' کشمالہ! میں ہر کاغذ نہیں پڑھتا۔ یہ پرانی بات ہوگی۔'' اس کا دماغ چکرا رہا تھا لیکن بظاہر اس نے آواز ہموار رکھی۔

اس نے افسوس سے اس کو دیکھ کے نفی میں سر ہلایا۔

''تم جانتے ہو وہ ریسٹوران میرے لیے کیا تھا؟ وہ میری پوری ورک لائف تھا۔ وہ میرا خواب تھا۔ تم نے اسے مجھ سے چھین لیا کیف! تمہارے دھوکے نے مجھے غصہ دلایا تھا۔ لیکن اس بات نے مجھے تم سے نفرت کرنے پہ مجبور کر دیا ہے۔ اب تم مجھے یہاں آکے اپنی بہن کی کہانی سنا کے سمجھتے ہو کہ میں پھر سے بے وقوف بن جاؤں گی؟ نہیں کیف! تم نے مجھ سے اوشن بھی چھینا ہے اور میرا انسانوں پر سے اعتبار بھی۔''

''تمہیں نوکری سے ظہیر نے نکالا تھا۔ میں نے نہیں۔ شاید تمہیں جاب کرنے سے پہلے ایک کانٹریکٹ سائن کرنا چاہیے تھا۔ اپنی بے وقوفی پہ میری کمپنی کو الزام مت دو۔ ظہیر نے اپنی مرضی سے ریسٹوران بیچا ہے۔ گن پوائنٹ پہ نہیں۔''

کشمالہ کا چہرہ سرخ ہوا۔ لیکن اس نے لب بھینچ لیے۔

یہ الفاظ کہتے ہوئے وہ جانتا تھا وہ حالات کو کس طرف لے کر جا رہا ہے۔ لیکن کیا فرق پڑتا تھا۔ وہ اب اس کا یقین نہیں کرے گی۔ کیا نیا تھا اس میں۔

''تم نے کہا تھا اگر میں کہوں کہ میری زندگی سے چلے جاؤ تو ایسا ہی کرو گے۔'' وہ پرس کی اسٹریپ کندھے پہ پہننے لگی۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔

''تم واقعی یہی چاہتی ہو؟''

اس نے ان بھوری آنکھوں میں دیکھا اور اثبات میں سر ہلایا۔

''میں یہی چاہتی ہوں۔ تم میری زندگی سے چلے جاؤ۔ اتنی دور کہ.....''

''کہ؟''

''کہ ہمارے راستے کبھی نہ ٹکرائیں۔''

وہ اسے دیکھ کے رہ گیا۔ سبز آنکھوں والی لڑکی کے ہر انداز میں بے اعتباری تھی۔ (مالک... یہ تم نے کیا کیا؟)

''میں اوشن کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا' مالا!'' اب کے اس کی آواز دھیمی تھی۔

''اب آسمان سے فرشتے اتر کے گواہی دیں' تب بھی میں تمہارا اعتبار نہیں کروں گی' ماہر! تم میری نظر میں ایک برے انسان تھے اور رہو گے۔ اور یہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے۔'' اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ ''میں نے تمہیں بہت دفعہ کہا تھا کہ میرا اعتبار مت توڑنا کیونکہ مجھے معاف کرنا نہیں آتا۔'' ایک آنسو پلک سے ٹپکا اور گال پہ لڑھک گیا۔ ''یہی ہے میرا ڈیفنس میکنزم۔ میں لڑائی کر کے صلح نہیں کیا کرتی۔ میں ایسے لوگوں کو ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی سے دور کر دیتی ہوں جو مجھے تکلیف دیتے ہیں۔ ختم۔ ڈیلیٹ۔''

''ڈیلیٹ؟''

''ڈیلیٹ۔'' اس نے اثبات میں ہلایا۔ پھر ہتھیلی کی پشت سے رخسار رگڑا۔

''تمہاری بدگمانی کی دیوار بہت اونچی ہوگئی ہے' مالا! اب میرا کوئی سچ اس کو پھلانگ نہیں سکتا۔ لیکن....'' اس کی آواز ٹوٹ گئی۔ وہ اسے سن رہی تھی۔

''میں لوگوں کے پیچھے نہیں بھاگا کرتا' مالا! میں چلا گیا تو واپس نہیں آؤں گا۔ کیا تم واقعی ایسا چاہتی ہو؟''

''ہر چیز سے زیادہ۔'' اس کی آواز میں دبی دبی سی بے بسی تھی۔ منت تھی۔ غصہ تھا۔

''اوکے۔ تمام۔'' اس نے دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔

''تمام۔'' عربی میں دہراتے ہوئے اس نے میز سے اپنا موبائل اٹھایا۔ پھر والٹ سے چند نوٹ نکال کے ادھ پیے کافی کپ کے ساتھ رکھے۔ والٹ جیب میں رکھا۔ جیسے غائب دماغی سے یہ کر رہا

ہو۔
وہ دونوں ایک ساتھ کھڑے ہوئے۔ وہ اس کے برابر سے گزر کے آگے بڑھا لیکن قدم زنجیر ہوگئے۔ وہ اب اس کے کندھے کے برابر کھڑا تھا۔ وہ دونوں مخالف سمتوں میں دیکھ رہے تھے۔ وہ اس کے جانے کی منتظر تھی۔ اور وہ اس کے روکنے کا۔
''زندگی میں کبھی ضرورت پڑے...''
''نہیں پڑے گی۔'' وہ زیرلب بڑبڑائی۔
''تو تم مجھے پکار سکتی ہو۔ میں آجاؤں گا۔'' ذرا دیر کو ٹھہرا۔ ''لیکن تمہارے پکارے بغیر میں کبھی نہیں آؤں گا۔''
اور پھر وہ آگے بڑھ گیا۔ بہت سے فاصلے خود بخود عبور ہوگئے۔ کشمالہ نے رکی ہوئی سانس بحال کی۔ وہ اب دور جا رہا تھا۔ وہ اس کے قدم سن سکتی تھی۔ اس نے سینے پہ ہاتھ رکھا۔ دل اس کے ہر قدم کے ساتھ دھڑک رہا تھا۔
ایک۔ دو۔ تین۔
☆☆☆
ریستوران کی لکڑی کی سیڑھیاں اترنا ماہر فرید کے لیے سب سے تکلیف دہ کام تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا رہا تھا۔ اس کی سماعتیں اوپر کھڑی کشمالہ مبین پہ لگی تھیں۔ شاید وہ اسے پکارے۔ شاید ایک دفعہ۔
لیکن کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ اس کے بھاری بوٹ نیچے اترتے گئے۔
ایک زینہ۔ دوسرا زینہ۔ پاتال تک کا سفر تھا۔ بدقت کٹ ہی گیا۔
وہ ریستوران کے سامنے باہر نکل آیا۔ باہر تیز دھوپ تھی۔ سورج عین سر پہ چمک رہا تھا۔ اس نے کالر کا اوپری بٹن کھول دیا۔ گھٹن سی محسوس ہو رہی تھی۔
''م... مجھے آج کی کوئی فلائٹ بک کروادو۔ کمرشل۔ اکانومی۔ واٹ ایور۔ مجھے واپس پہنچنا ہے۔'' وہ فون پہ کہہ رہا تھا۔ انگلیاں بے چین تھیں۔ بہت عرصے بعد شدت سے محسوس ہوا تھا کہ اس کے ہاتھوں کو سگار چاہیے۔ لیکن اس نے سگار چھوڑ دیا تھا۔
اور جسے چھوڑ دیا' اسے چھوڑ دیا۔
☆☆☆
اس کے بعد وہ ریستوران واپس جا کے رنگوں کو ہاتھ نہیں لگا سکی۔ بس جلدی جلدی اپنی چیزیں سمیٹیں۔ جوتوں کا ڈبہ اور چاکلیٹس اٹھائیں۔ ٹپ ٹپ بہت سے قطرے چاکلیٹس کے ڈبے پہ گرنے لگے۔ اس نے گیلی سانس ناک سے اندر کھینچی اور آنکھیں رگڑتی ہوئی باہر نکل آئی۔
وہ ایک دھوکے باز آدمی تھا۔ میں چند دن میں اس کو بھول جاؤں گی۔
وہ بے توجہی سے ڈرائیو کر رہی تھی۔ آنکھیں مسلسل بہہ رہی تھیں۔
کاش تم نے مجھ سے پہلے دن سے سچ بولا ہوتا' کیف۔ آدھے جھوٹ۔ ادھورے سچ۔
کار گھر کے قریب ایک سگنل پہ رکی ہوئی تھی اور وہ آنکھیں بند کیے، سر سیٹ کی پشت سے ٹکائے ہوئے تھی۔ آنسو ٹپ ٹپ گرتے جا رہے تھے۔
کھڑکی کا شیشہ بجا تو وہ ایک دم سے ڈر گئی۔
باہر ایک بچہ کھڑا تھا۔ مالا کی اٹکی سانس بحال ہوئی۔ بٹن دبایا۔ شیشہ نیچے ہوتا گیا۔
''آپ مالا باجی ہیں نا۔'' وہ مسکرایا۔ وہ پٹھان بچہ تھا۔ اس کی آنکھیں سبز تھیں۔ ایسی سبز آنکھیں جو مغربی فوٹوگرافرز اپنا کیریئر بنانے کے لیے شوٹ کرتے ہیں۔
''ہاں۔ اور تم؟'' اس نے جلدی سے گیلے رخسار رگڑے۔
''میری امی آپ کے سامنے والے گھر میں کام کرتی ہے۔ میں یہ بناتا ہوں۔'' اس نے موتیے کے بنے گجرے سامنے کیے۔
وہ بھیگی آنکھوں سے مسکرادی۔
''میری ماں کے لیے۔'' اس نے پیسے دیے

اور گجرے تھام لیے۔ آنکھیں بند کر کے ان کی خوشبو سونگھی۔ اندر تک جیسے ایک تازگی سی اترتی گئی۔

"مالا باجی! آپ پینٹنگ کرتی ہیں؟"

بتی ابھی سرخ تھی اور وہ کھڑکی سے لٹک کے اندر جھانک رہا تھا۔

"ہاں کیوں؟ تمہیں رنگ اچھے لگتے ہیں؟" اس نے گجرے فرنٹ سیٹ پہ رکھے۔ ساتھ ہی چاکلیٹس کا باکس رکھا نظر آرہا تھا۔ بچے کی نظر چاکلیٹس پہ گئی اور پھر واپس اس تک۔

"جی۔ آپ کے پاس فالتو رنگ ہوں تو مجھے دے دینا۔" بتی زرد ہوگئی۔

"یہ بھی فالتو ہیں۔ لے جاؤ۔" اس نے مسکراتے ہوئے چاکلیٹس کا باکس اٹھایا اور اسے تھما دیا۔ بچے کے چہرے پہ پہلے شاک ابھرا اور پھر.. لامحدود خوشی۔ اس نے کار آگے بڑھا دی۔ وہ چاکلیٹس نہیں کھاتی تھی اور آج تو شاید وہ کچھ نہیں کھا سکے گی۔ طبیعت عجیب مکدر ہو رہی تھی۔

میں اسے بھول جاؤں گی۔ بس چند دن کی بات ہے۔ مجھے اپنے کام پہ فوکس کرنا ہے۔ ماں کو توجہ دینی ہے۔

وہ زیر لب بار بار دہرا رہی تھی۔

"کیا وہ میرا تعاقب چھوڑ دے گا؟" دل سے ایک ڈری سہمی آواز سنائی دی۔

"ہاں۔ وہ کسی اور لڑکی کی طرف بڑھ جائے گا۔" دماغ نے سمجھایا۔ "اس کے پاس لڑکیوں کا پورا البم تھا۔"

اور یہ آواز دل کا بوجھ سرکانے لگی۔ اس نے زور سے آنسو رگڑے۔

وہ کس آدمی کا غم لے رہی تھی؟ ماہر فرید کی دنیا الگ تھی۔ وہ پرفیکٹ زندگی سے اٹھ کے آیا تھا۔ اس کو کیا معلوم کہ چہروں کی رنگت اور داغوں والے نامکمل لوگ کیسے ہوتے ہیں۔ کیسے وہ اپنے وجود کے سارے حصوں کو جوڑ کے بدقت خود کو اس مقام تک لاتے ہیں۔ اس کے کشمالہ مبین اور زیاد سلطان جیسے کمپلیکس کہاں ہوں گے۔

امیر لوگ۔ الگ دنیا۔ انہیں ہائی ہیلز کا ایک جوڑا لینے کے لیے بڑے بڑے فیصلے نہیں کرنے پڑتے۔

اس نے کار آگے بڑھا دی۔ وہ اسے بھول جائے گی۔ بس چند دن لگیں گے۔

☆☆☆

چند دن بعد...

سریار (استنبول) کی اس اونچی عمارت کا ٹاپ فلور روشن تھا۔ اپارٹمنٹ کی اونچی کھڑکیوں کے باہر ، ایک ٹیرس بنا تھا جس کے چھجے سے برقی قمقمے لہروں کی صورت لٹک رہے تھے۔

ٹیرس پہ ایک کاؤچ رکھا تھا، جس پہ ماہر بیٹھا نظر آرہا تھا۔ پیر لمبے کر کے قینچی کی صورت سامنے اسٹول پہ جما رکھے تھے۔ اور وہ خاموشی سے نیچے نظر آتی سڑک اور اس کے پار بہتے باسفورس کو دیکھ رہا تھا۔ رات کی تاریکی میں باسفورس کنارے کھڑے کشتیوں کی بتیاں جلی ہوئی تھیں۔ کہیں سے ہلکی سی موسیقی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

اس پرسکون ماحول میں خلل ، دستک نے ڈالا۔ اس نے چہرہ اٹھا کے دیکھا۔ ٹیرس سے اندر کھلتے دروازے کی چوکھٹ میں بیربل کھڑا تھا۔ ٹی شرٹ ٹراؤزر پہنے گھنگریالے بال ماتھے پہ بکھیرے وہ تازہ دم سا نظر آرہا تھا۔

"جب سے واپس آئے ہو اسی طرح خاموش ہو۔ لیکن آج نہیں رہو گے۔" وہ مسکرایا اور اندر لاؤنج کی طرف اشارہ کیا۔

"چنگیز تم سے ملنے آیا ہے۔"

ماہر کے ابرو اکٹھے ہوئے۔ "اسے اس وقت کس نے بلایا ہے؟"

"میں تو اسے جانتا ہی نہیں ہوں۔ پتہ نہیں کون ہے۔ خود ہی اندر گھس آیا۔" بیربل تیزی سے ایک طرف ہوا اور نو وارد کو راستہ دیا۔

"ماہر آفندی... کہاں گم ہو؟" بھاری

آواز میں اس کا احوال پوچھتا ایک آدمی ٹیرس پہ آیا۔ اس نے کالر والی شرٹ پہن رکھی تھی جس کے اوپری بٹن کھلے تھے اور گردن میں جھولتی سلور چین جھانک رہی تھی۔ انگلیوں میں بھی دو تین سلور انگوٹھیاں تھیں۔ وہ چوڑے کندھوں والا اونچا لمبا سا مرد تھا جس کو دیکھ کے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا وقت تھانے سے زیادہ جم میں گزرتا ہے۔ چہرے پہ تراشیدہ مونچھیں اور ایک بے تکلفانہ مسکراہٹ تھی۔

ماہر نے پہلے اسے دیکھا۔ پھر ایک تیز نظر ریلنگ کے ساتھ کھڑے بیربل پہ ڈالی۔ اس نے فوراً لاعلمی سے کندھے اچکا دیے۔

''واللہ میں اس آدمی کو پہلی دفعہ دیکھ رہا ہوں۔''

چنگیز نے ہاتھ جھلا کے اسے ہٹنے کا اشارہ کیا اور کاؤچ کے دوسرے کنارے پہ جا بیٹھا۔ ٹانگ پہ ٹانگ جمائی اور بغور اپنے بائیں ہاتھ بیٹھے، ماہر کو دیکھا جس کے چہرے پہ اب صرف اکتاہٹ تھی۔

''کیسی محبت تھی تمہاری؟ لڑکی کے پیچھے گئے مگر خالی ہاتھ آ گئے۔ چچ۔'' مایوسی بھری خفگی سے شکوہ کیا۔

بیربل نے بے اختیار ماتھا چھوا۔ ماہر کے دوست بھی اس جیسے تھے۔

''میں اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا۔'' وہ سامنے دیکھ رہا تھا۔ آواز ہلکی تھی۔

''لیکن ہم کرنا چاہتے ہیں۔'' چنگیز کا لہجہ خفا خفا سا تھا۔ ''بلکہ پہلے بتاؤ اپنے اس روبوٹ چچا کی خبر لی جس نے اس کا ریستوران بکوایا تھا؟''

ماہر نے جواباً تیز نظروں سے بیربل کو گھورا۔ وہ بہت مصروف سا اپنے پیروں کو دیکھ رہا تھا۔

''مالک نے کسی وجہ سے یہ بات مجھ سے چھپائی ہے۔ اس سے پوچھنے کا فائدہ نہیں ہے۔ میں اب صرف اس پہ خاموشی سے نظر رکھے ہوئے ہوں۔ مجھے اس کے خود سے بولنے کا انتظار ہے۔''

''تمہارا چچا مجھے مشکوک لگتا ہے ماہر!''

''تمہیں تو ہر آدمی مشکوک لگتا ہے۔'' بیربل بدمزہ ہوا۔ ''مانا کہ وہ روبوٹ ہے، بیٹری سے چلتا ہے لیکن وہ ماہر سے واقعی محبت کرتا ہے۔ وہ اس کو ایسے دھوکہ نہیں دے گا۔ کوئی وجہ ہوگی۔''

چنگیز نے گھور کے ریلنگ کے ساتھ کھڑے بیربل کو دیکھا۔

''میں ہومی سائیڈ (قتل) ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتا ہوں بیربل۔ ستر فیصد قتل کیسز میں قاتل قریبی فرد نکلتا ہے۔''

''اور باقی تیس فیصد تم سے حل نہیں ہوتے ہوں گے۔''

''جاؤ یار! کوئی چائے قہوہ پلاؤ۔'' اس نے ہاتھ جھلا کے اسے جانے کا اشارہ کیا۔ پھر ماہر کو تشویش سے دیکھا۔ وہ اسی انداز میں بیٹھا نیچے باسفورس کے سیاہ پانیوں کو دیکھ رہا تھا۔

''اور تم مجھے یہ سمجھاؤ کہ کون سا مرد صرف ایک دفعہ کہنے پہ کسی عورت کو چھوڑ سکتا ہے؟''

☆☆☆

''کون سا مرد کسی عورت کے کہنے پہ اسے چھوڑ کے چلا جاتا ہے مالا!'' موسیقی کے شور میں صفورا اس کے کان کے قریب زور سے بولی تھی۔ ''عورت چھوڑ سکتی ہے۔ لیکن مرد اتنی آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑتے۔''

وہ دونوں اس وقت مہندی کے ایک فنکشن میں موجود تھیں۔ لاہور شہر سے ذرا باہر ایک فارم ہاؤس پہ مالا کی ایک کلاس فیلو کی مہندی منعقد کی گئی تھی۔ اونچے مار کی کی چھت، فانوسوں اور گیندے کے پھولوں سے ڈھکی تھی۔ ہر طرف پھول ہی پھول تھے۔ روشنیاں۔ رنگ۔ چمکتے دمکتے لوگ۔

کشمالہ بڑے دن بعد، ماں کو بخت بی اور معید کے پاس چھوڑ کے کسی فنکشن میں آئی تھی۔ مغرب ڈھل کے رات میں بدل چکی تھی۔ مہندی کا فنکشن لاہور کی دوسری مہندیوں سے مختلف نہ تھا۔ خواتین ہوں یا مرد، سب کا فوکس ایک ہی تھا۔

تصویر اچھی آنی چاہیے۔

چاہے حقیقت جیسی بھی ہو،سب کو تصاویر میں پرفیکٹ نظر آنا تھا۔ بڑی بڑی فوٹوگرافی اور ویڈیوگرافی کمپنیز ہائر کی گئی تھیں، جو اس فنکشن کی عکس بندی کر رہی تھیں۔ لائٹنگ سے لے کر ہیش ٹیگ تک سب کچھ انسٹاگرام پہ اپ لوڈنگ کے لحاظ سے تیار کیا جا رہا تھا۔

پھر ہر مہندی پہ رقص کے مقابلے ہوتے تھے۔ وہ زمانے گئے جب لاہور کی مہندیوں پہ ڈانس ویڈیوز بنانے سے منع کیا جاتا تھا۔ اب نہیں کیا جاتا۔ اب لاہور ہو یا استنبول انسانوں کی اکثریت کو مشہور ہونے کا شوق ہو چلا تھا۔ شادی کتنے دن تک سوشل میڈیا پہ ٹرینڈ کرے گی کس کی ویڈیو وائرل ہو جائے گی اب ایک مقابلہ تھا۔

ایسے میں وہ دونوں، تصاویر اور برائڈز کی اس مقابلے بازی سے دور، ایک اونچی میز کے گرد بیٹھی تھیں۔ صفورا نے ساڑھی پہن رکھی تھی۔ وہ آج اپنے باس گرل حلیے سے مختلف نظر آ رہی تھی۔ مالا البتہ سادگی سے تیار ہوئی تھی اور اس چیز نے صفورا کو چونکایا تھا۔ اس کے لمبے بال ایک شانے پہ آگے کو سمٹے ہوئے تھے۔ کانوں میں جھمکے تھے اور لباس آنکھوں جیسے سبز رنگ کا تھا۔ صرف منقش کے جھلملاتے ہوئے، سبز دوپٹے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ مہندی کے فنکشن میں آئی ہے۔ ورنہ چہرے پہ میک اپ نہ ہونے کے برابر تھا۔ ایک اداسی سی تھی جو اس کے سارے وجود کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھی۔

''میں بتائے دے رہی ہوں مالا! وہ سائیکو ہے۔ اتنی جلدی پیچھا نہیں چھوڑے گا تمہارا۔''

موسیقی کے بے ہنگم شور پہ صفورا اس کے کان کے قریب زور سے بولی۔

کشمالہ چہرہ اٹھا کے چھت سے لٹکتے گیندے کے پھول دیکھنے لگی۔ دونوں ہاتھ باہم پھنسائے وہ انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ صفورا نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔

''کیا تم پچھتا رہی ہو؟''

''میں نے غلط تو نہیں کر دیا؟''

''دماغ درست ہے تمہارا؟'' صفورا نے بے یقینی سے اسے دیکھا جو چھت کو دیکھ رہی تھی۔ ''وہ ایک خطرناک آدمی ہے۔ اس نے تمہارا ریستوران چھینا کیف کو ڈرایا دھمکایا پھر تمہاری زندگی میں داخل ہو کے تمہیں دھوکہ دیا۔ تمہیں تو اس کو پولیس کے حوالے کرنا چاہیے تھا۔ بہت سستے میں چھوڑ دیا۔''

مالا نے نظریں فانوسوں سے ہٹا کے صفورا کے چہرے پہ مرکوز کیں۔ اس کی آنکھوں میں ایک تذبذب سا تھا۔

''کیا معلوم اس کی بہن واقعی لاپتہ ہو اور وہ، یہ سب اس کو ڈھونڈنے کے لیے کر رہا ہو۔'' وہ ایک انگلی گردن میں جھولتی چین پہ پھیر رہی تھی۔

''بہن لاپتہ ہے تو پولیس سے بات کرے نا۔ تم پولیس ہو کیا؟ اف کشمالہ!'' صفورا نے ماتھے کو چھوا پھر فکرمندی سے اس کا ہاتھ تھاما۔ ''وہ تمہارے ذہن کو چکر دے رہا ہے۔ ایسے لوگ بہت شاطر ہوتے ہیں۔ تم نے اس کی کہانی میں نہیں آنا۔ سب جھوٹ ہے۔ ہمدردی لینے کے بہانے ہیں۔''

''لیکن اگر اس کی بہن واقعی کسی مصیبت میں ہوئی؟'' اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ''وہ ایک گیارہ سال کی بچی ہے۔ اگر میں اس کی مدد نہ کر سکی تو میں خود کو کیسے معاف کروں گی؟''

''میں نے معلوم کروایا ہے یار! اس کی بہن مر چکی ہے۔ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اس کا جنازہ بھی ہوا تھا اور قبر بھی موجود ہے۔''

وہ خاموشی سے سر جھکائے لب کاٹنے لگی۔ صفورا نے گہری سانس لی اور اس کی طرف جھکی۔

''تم اس کی بہن کو جانتی ہو؟ یا اس کے اغوا کار کو؟''

اس نے جھکے سر کو دائیں بائیں ہلایا۔

''پھر تم کچھ نہیں کر سکتی۔ بالفرض یہ سچ ہو تب بھی یہ ماہر فرید کا اپنا مسئلہ ہے۔ تمہیں اس آدمی کو

اپنے ذہن سے نکالنا ہے۔" صفورا نے توقف کیا۔
"اور دل سے بھی۔"
کشمالہ نے چونک کے نظریں اٹھائیں۔ پھر اس کے چہرے پہ برہمی ابھری۔
"کتنی دفعہ بتاؤں' مجھے اس سے کوئی محبت وغیرہ نہیں ہے۔"
"پھر کیا ہے جو تمہیں اتنا بے چین رکھے ہوئے ہے؟ وہ جب سے گیا ہے تم ڈسٹرب ہو۔"

☆☆☆

"تم جب سے آئے ہو' ڈسٹرب ہو۔ ہم سے بات کرو' یار!"
ٹیرس کی خاموشی میں چنگیز کی فکرمند آواز گونجی۔
"کیوں بات کروں؟" کاؤچ پہ نیم دراز ماہر ہنوز باسفورس کے کنارے کھڑی چھوٹی کشتیوں کو دیکھ رہا تھا۔
"تاکہ تمہارا دل ہلکا ہو۔"
"ہاں اور آدھے شہر کو خبر ہو جائے۔" ایک گھورتی ہوئی نظر سامنے قہوے کی ٹرے رکھتے بیربل پہ ڈالی۔
"وہ تمہارے لیے پریشان ہے' ماہر۔"
اور پریشان، ڈھٹائی سے دانت نکالتے ہوئے اسٹول پہ بیٹھ گیا۔ ایسے کہ اس کی ریلنگ کی طرف پشت تھی اور وہ دونوں اس کے سامنے تھے۔
"میں ٹھیک ہوں۔ کام کر رہا ہوں۔ روز آفس جاتا ہوں۔ اور کیا کروں؟"
"کیا تم دوبارہ اس سے بات کرنے کی کوشش نہیں کر سکتے؟" چنگیز آگے بڑھا اور مٹھی میں شکر کی دو ڈلیاں اٹھائیں۔
"وہ میری شکل تک نہیں دیکھنا چاہتی۔ اور وہ اس کے ساتھ خوش تھی۔"
شکر کی ڈلی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کے سرخ چائے میں جا گری۔ چنگیز کے ساتھ ساتھ بیربل بھی چونکا۔
"وہ کون؟ زیاد؟"
ماہر نے اثبات میں گردن ہلا دی۔
"وہ پھر سے درمیان میں آ گیا؟" بیربل کو جیسے بہت برا لگا تھا۔
"وہ درمیان سے کبھی نہیں جائے گا۔" کچھ تھا اس کی آواز میں۔ شکست خوردہ سا۔ ٹوٹا ہوا۔
بیربل اور چنگیز نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اور پھر اسے۔
"کیا وہ اس کو پسند کرتی ہے؟"
ماہر نے جواب نہیں دیا۔ نیچے دیکھتا رہا۔ اس کی نظروں کا محور بنی کشتی میں دو لوگ بیٹھے کچھ گنگنا رہے تھے۔ ان کے لوک گیت کی آواز خاموش رات میں ترنم بکھیر رہی تھی۔

☆☆☆

"پھر تم کسے پسند کرتی ہو؟ زیاد کو؟" موسیقی کا بے ہنگم شور مزید بلند ہو رہا تھا۔ صفورا کو اپنی کرسی اس کے قریب کھینچنی پڑی۔
"ہاں۔ شاید۔ زیاد بہت سچا اور سادہ انسان ہے۔" وہ سوچ کے بتا رہی تھی۔ "میں اس کے لیے وہی کشش محسوس کرتی ہوں جو کوئی بھی لڑکی ایسے مرد کے لیے کرتی ہے جس کے ساتھ وہ واقعی شادی کرنا چاہتی ہو۔ اس کا مجھ سے ملنا' بات کرنا' مجھے سب اچھا لگتا ہے۔"
"اور اس سائیکو پیتھ کے لیے کیا محسوس کرتی ہو؟"
گردن میں پڑی چین پہ چلتی اس کی انگلی رک گئی۔ آنکھوں میں کچھ ابھر کے ڈوب گیا۔
"وہ میرا دوست تھا۔ محافظ تھا۔ اس کے ساتھ کشش والا احساس نہیں تھا۔ بس کچھ مختلف تھا۔ میں اس پہ اعتبار کرتی تھی اور وہ میری حفاظت کرتا تھا۔ اور پھر نہ اعتبار رہا نہ حفاظت۔" اس شام پہلی دفعہ صفورا کو اس کے چہرے پہ سرخی نظر آئی۔ بے بسی۔ غصہ۔ "اس نے میرے ساتھ بہت غلط کیا۔ وہ وہ تھا ہی نہیں جو میں اسے سمجھتی تھی۔"

''وہ نہ تمہاری حفاظت کر رہا تھا نہ اعتبار کے قابل تھا' مالا!'' صفورا اسے سمجھا رہی تھی۔ ''میں اس وقت تمہیں اس سے نہیں بچا سکی لیکن اب میں بچانا چاہتی ہوں۔ایسے مرد بہت خطرناک ہوتے ہیں۔اس نے پہلے تمہارا اعتماد جیتا۔پھر وہ تمہارے گھر میں رہنے لگا۔پھر تمہیں اپنا عادی بنا کے وہ جان بوجھ کے چند دن کے لیے غائب ہوگیا تا کہ تم اس کو مس کرو۔آخر میں بھی اس نے جھوٹ بولا کہ کراچی جارہا ہے۔''

''اگر اس روز میں تم سے بات نہ کرتی تو ہم اس کی حقیقت کبھی نہ جان سکتے۔'' اسے یاد آیا۔ماتھے پہ لکیریں ابھریں۔

''یہی میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔اس نے تمہیں اپنی حقیقت نہیں بتائی۔تم نے اس کا جھوٹ خود پکڑا تھا۔اب وہ اعتراف کرے' معافی مانگے' یا اپنی بہن کی کوئی کہانی سنائے' کیا فائدہ؟''

☆☆☆

''اگر تم اسے اپنے منہ سے اپنی حقیقت بتا دیتے تو معاملہ یہاں تک نہ پہنچتا۔'' چنگیز افسوس سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''ایک کیک بنانے والے آدمی نے کہا تھا کہ ایسا نہ کرو۔لیکن نہیں۔'' بیربل کی زبان پھسلی۔چنگیز نے تادیبی نظروں سے اسے گھورا۔وہ خاموش ہوگیا۔

''میں کب انکار کر رہا ہوں کہ میں نے غلط نہیں کیا۔مجھے اپنی غلطیاں درست کرنی نہیں آتیں اور اسے معاف کرنا نہیں آتا۔''

''محبت میں انسان سب کچھ کر لیتا ہے' ماہر! مجھے سمجھاؤ کہ تم اسے چھوڑ کے کیوں آگئے؟''

ماہر فرید نے پہلی دفعہ چہرہ موڑ کے قریب بیٹھے چنگیز کو دیکھا۔پھر وہ ہلکا سا مسکرایا۔

''تم میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟''

''یہ تمہاری جگہ ہوتا تو زیاد کو کسی مقدمے میں اندر کروا چکا ہوتا۔'' بیربل زور سے ہنسا۔

ان دونوں نے سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھا تو اس نے چہرے کے زاویے سیدھے کیے۔

''او کے او کے میں چپ ہوں۔'' ہونٹوں پہ زپ کی لکیر کھینچی۔

''میں تمہاری جگہ ہوتا تو اس لڑکی سے معافی مانگتا۔بار بار اس کے پیچھے جاتا۔اس کا دل جیتنے کی کوشش کرتا۔اظہارِ محبت کرتا۔کوئی تحفہ دیتا۔'' پھر سر کو اعترافی انداز میں خم دیا۔ ''اور زیاد کو کسی مقدمے میں اندر کروا دیتا۔''

''یہ ہوتی ہے محبت۔'' بیربل نے ہاتھ ماتھے پہ لے جا کے سلیوٹ کا اشارہ کیا۔ماہر نے بغور اسے دیکھا۔

''یقیناً تم بھی یہی کرتے۔اس کے پیچھے پڑے رہتے یہاں تک کہ اس کی ناں ہاں میں بدل جائے۔''

''لڑکیوں کی ناں کا مطلب ہوتا ہے کہ کچھ دن میرے پیچھے بھاگو اور پھر میں مان جاؤں گی۔'' چنگیز نے شانے اچکائے اور پیالی سے گھونٹ بھرا۔بیربل نے بھی تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

اس نے باری باری دونوں کے چہرے دیکھے۔

''کس نے سکھایا ہے تمہیں یہ؟''

''کیا؟''

''یہی کہ ناں کا مطلب ناں نہیں ہوتا؟ فلموں نے؟ کہانیوں نے؟ ہوں؟'' ماہر نے پیر نیچے اتارے اور ٹرے اپنی طرف کھسکائی۔پھر شیشے کی کیتلی سے سرخ چائے اپنی پیالی میں ڈالنے لگا۔

''میں نے ہر جگہ یہی ہوتے دیکھا ہے دوست! شروع میں لڑکیاں نخرے کرتی ہیں۔پھر مان جاتی ہیں۔''

''تمہارے پولیس اسٹیشن میں ہومی سائیڈ (قتل) ڈیپارٹمنٹ کس فلور پہ ہے؟''

''چوتھے۔''

''کبھی دو فلورز نیچے جاؤ۔اسالٹ اور بیٹری (مار پیٹ) ڈیپارٹمنٹ میں۔تمہیں وہاں

بہت سے ایسے ٹاکسک بوائے فرینڈز اور شوہر قید ملیں گے جنہیں ناں کو ہاں میں بدلنے کا خبط تھا۔" وہ چائے کی دھار پیالی میں انڈیل رہا تھا۔ وہ دونوں بالکل خاموشی سے اسے سن رہے تھے۔

"جو مرد عورت کے ناں کہنے کے باوجود اس کو ہاں میں بدلنے کی کوشش کرتے ہیں' وہی ٹاکسک پارٹنرز بنتے ہیں۔" اس نے گرم پیالی اٹھائی اور پیچھے ہو کے بیٹھا۔ پھر ٹانگ پہ ٹانگ جمالی۔ "اور میں ایسے مردوں میں سے نہیں ہوں۔"

"لیکن اپنی محبت کے لیے کوشش تو کرنی چاہیے۔"

"کوشش کرنے ہی واپس گیا تھا۔ کوشش ایک دفعہ ہوتی ہے۔ یا دو دفعہ۔ بار بار تعاقب ہوتا ہے' بیربل آفندی!" اس نے رک کے گرم چائے کا گھونٹ بھرا۔ وہ دونوں بالکل خاموش تھے۔

"ایک مرد کو عورت کے انکار کا احترام کرنا چاہیے۔ اگر وہ کہے اس کی زندگی سے نکل جاؤ' تو نکل جانا چاہیے۔"

"لیکن ہوسکتا ہے وہ لڑکی ناں کہہ کے اپنا نقصان کر رہی ہو۔ تم اس کے لیے بہترین انتخاب ہو۔ پھر؟" بیربل کو یہ بات پسند نہیں آئی تھی۔

"مرد عورت کی طرف سے فیصلہ نہیں لے سکتا۔ وہ اپنے ساتھ بھلائی کرے یا نقصان' یہ فیصلہ اس عورت کا ہونا چاہیے۔ کسی مرد کو کسی عورت کے انکار کو اقرار میں بدلنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ کم از کم ماہر فرید ایسا مرد نہیں بن سکتا۔"

"بالفرض..." چنگیز کھنکھارا۔ "وہ کسی غلط آدمی سے شادی کرلیتی ہے اور کئی برس بعد اسے احساس ہوتا ہے کہ اس نے غلط کیا۔ تو اس کا ذمہ دار کون ہوگا۔"

"ہم سب اپنے حصے کی غلطیاں کرتے ہیں' یہ اس کے حصے کی غلطی ہوگی۔ میں نے جسے چھوڑ دیا۔ اسے چھوڑ دیا۔" وہ پھر سے نیچے کشتیوں کو دیکھنے لگا تھا۔ ان میں لگے رنگ برنگے قمقمے روشن تھے۔

چنگیز اور بیربل نے افسوس سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اور پھر اس کو۔ نیم روشن ٹیرس میں اس کے چہرے کی تکلیف واضح تھی۔

"لیکن تم دکھی ہو۔"

"ظاہر ہے میں دکھی ہوں۔ یہ میرے حصے کا دکھ ہے۔ مجھے کاٹنا ہے۔" اس نے چائے کا ایک اور گھونٹ بھرا۔ آواز آہستہ تھی۔

"کیا معلوم وہ پچھتا رہی ہو۔" بیربل سے اس محبت کی کہانی کا یہ انجام برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ "اتنے دن ہوگئے ہیں۔ کال کرکے اس کی خیریت ہی پوچھ لو۔"

ماہر نے نظریں اٹھا کے اسے دیکھا۔ لبوں پہ وہی اداس مسکراہٹ تھی۔

"پچھتائے گی تو خود کال کرے گی۔ میں پیچھے جانے والوں میں سے نہیں ہوں۔"

اور اسی لمحے جیب میں رکھے فون میں تھرتھراہٹ ہوئی۔ ماہر فرید نے عام سے انداز میں موبائل نکالا۔

گرین آئیز کالنگ۔

اسکرین پہ یہ الفاظ چمک رہے تھے۔

لمحے بھر کے لیے باسفورس کے کنارے پھیلی ساری دنیا رک گئی۔

☆☆☆

"ہاں۔ اب کیا فائدہ۔" وہ مہندی کی رونق پہ نظریں جمائے بڑبڑائی۔ "خود سے اس نے کبھی سچ نہیں بولا۔ ہمیشہ جھوٹ کہا۔ باتیں چھپائیں۔ میں بھی کس کا غم لیے بیٹھی ہوں۔"

"غم کے ساتھ غصہ بھی ہے۔ تمہیں اس غصے کو باہر نکالنا ہے تاکہ تمہیں closure ملے۔"

"کیسے؟" وہ اس کی طرف جھک کے اونچی آواز میں بولی۔

"اسے کال ملاؤ۔ ابھی۔ اور اس کو بہت سی گالیاں دو۔"

اسی پل میوزک بند ہوگیا۔صفورا نے جلدی سے آواز نیچے کی۔گالیوں کے لفظ پہ ساتھ سے گزرتے چند افراد نے مڑ کے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"میں اس کو مر کے بھی کال نہیں کروں گی۔" وہ تیزی سے بولی۔چہرے کی رنگت سرخ ہوئی۔

"پھر اس کو ذہن سے نکال دو۔کھرچ دو۔"

مالا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔صفورا کی بات اس کی سمجھ میں آنے لگی تھی۔

"جو شخص اتنے جھوٹ بول سکتا ہے وہ کچھ بھی کرسکتا ہے۔اور مجھے انسانوں کی پہچان کہاں ہے۔"

اس سے پہلے کہ صفورا جواب دیتی اس کے بچوں کی نینی اسے بلانے چلی آئی۔اس کی بیٹی رو رہی تھی۔صفورا اپنا کاؤنسلنگ سیشن بھول کے ساڑھی سنبھالتی فوراً اس طرف لپکی۔مالا نے سر دائیں سے بائیں ہلایا۔بچوں کی مائیں۔اُف۔

"کشمالہ..." چوڑیوں کی کھنک۔جھمکوں کی چھنکار۔چہکتی آواز۔وہ اس طرف پلٹی اور مسکرادی۔

سامنے رامین کھڑی تھی۔اس کی سب سے خوب صورت کلاس فیلو۔وہ یونی ورسٹی میں سب سے زیادہ تیار ہو کے آتی تھی۔کلاس فیلو سے شادی ہوئی اور آج تک وہ ویسی ہی نک سک سے تیار ہوتی تھی۔انسٹاگرام پہ ان کا پرفیکٹ کپل گاہے بگاہے نظر آجاتا تھا۔

"مالا! مجھے بہت افسوس ہوا سن کے" رامین حال احوال کے بعد کہنے لگی۔

"اب ماں بہت بہتر..."

"تمہاری جاب اور کیریئر ... سب ختم ہوگیا۔سو سوری۔ظہیر نے بالکل اچھا نہیں کیا۔" اسی پل کسی نے میوزک پھر سے آن کردیا تھا۔کانوں کے پردے پھاڑتی آواز کے باوجود رامین کی "چچ" دب نہ سکی۔

کشمالہ کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔لب کھولے لیکن پھر گہری سانس لی۔بہت سے الفاظ روک لیے۔وہ ماہی نہیں تھی جو منہ توڑ جواب دے دیتی۔وہ مالا تھی۔

"تھینک یو۔ایکسکیوزمی۔" وہ پرس اور موبائل اٹھائے آگے بڑھ گئی۔ایک دم تنفس بے رابط سا ہوگیا تھا۔ہال کی دیواریں تنگ ہوگئی تھیں اور آنکھیں جلنے لگی تھیں۔

(کیا یہ تمہارا حفاظتی نظام) ہے؟ سامنا کرنے کی بجائے فرار اختیار کرنا؟

خاموش ہوجاؤ۔اس نے ذہن میں ابھرتی آوازوں کو ڈپٹا۔ذرا دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔پھر دل نے سرگوشی کی۔

کیا واقعی یہ تمہارا حفاظتی نظام ہے؟ کیا اسی لیے تم ماں کو چھوڑ کے اسلام آباد چلی گئی تھیں؟

وہ پینسل ہیلز سے چلتی ہوئی مارکی کے واش رومز کی طرف آگئی۔

پہلے ایک بڑا سا Powder Room بنا تھا۔وہاں کوئی نہیں تھا۔وہ سنک کے سامنے آکھڑی ہوئی اور دیوار گیر آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔اس کی آنکھیں گلابی ہورہی تھیں۔

(میں بھی کس کا غم لے رہی ہوں۔ایسے شخص کا جس نے مجھے جاب لیس کیا۔سب اس کی وجہ سے ہوا ہے۔)

کم مائیگی کا احساس، رامین کی نظریں، سب جیسے دل میں گڑ گیا تھا۔اس نے نل کھولا اور ہاتھ نیچے کیے ہی تھے کہ ایک دم کسی نے اس کو گردن سے دبوچ لیا۔

چیخ کشمالہ کے حلق میں رہ گئی۔اس نے بے اختیار دونوں ہاتھ گردن پہ رکھے۔وہ ایک بوڑھا ہاتھ تھا جس کی نسیں ابھری ہوئی تھیں۔اور وہ اس کی گردن کو زور سے دبا رہا تھا۔لیکن وہ ہاتھ نظر نہیں آرہا تھا۔

اس نے چیخنا چاہا، اس ہاتھ کو اپنی گردن سے کھینچنا چاہا، لیکن ساری ہمت ختم ہوچکی تھی۔

ایک جھٹکے سے نادیدہ ہاتھ نے اس کی گردن

چھوڑی۔ وہ زور سے اوندھے منہ نیچے جا گری۔ سر دیوار سے لگا اور لمحے بھر کے لیے ساری دنیا گول گول گھوم گئی۔

"ماں... ماں..." وہ سر دونوں ہاتھوں میں لیے دیوار کے ساتھ گھسٹتی چلی گئی۔ سانس تیز تیز چل رہا تھا۔ اس نے گردن پہ ہاتھ رکھا۔ کچھ گیلا سا محسوس ہوا تھا۔ مالا نے ہاتھ اوپر کر کے چہرے کے سامنے کیے۔ بصارت دھندلی ہو رہی تھی کہ سر ابھی تک چکرا رہا تھا۔

اس کے ہاتھ پہ خون کا ننھا سا قطرہ تھا۔

وہ بدقت اٹھی اور سلیب کا سہارا لے کر کھڑی ہوئی۔ جو کندھا دیوار سے لگا تھا وہ شدید درد کر رہا تھا۔ سر کے پیچھے بھی گومڑ سا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے پلکیں جھپکائیں اور آئینے میں خود کو دیکھا۔

اس کی گردن سرخ ہو رہی تھی۔ اس پہ باقاعدہ ایک ہاتھ کی انگلیوں کا نشان تھا۔ اور اس پہ کچھ اور بھی تھا۔ درمیان میں ایک جگہ ننھا سا کٹ جس سے دو تین قطرے خون بہا تھا۔ اس نے یاد کرنا چاہا۔ کچھ نوکیلا سا چبھا تھا اس کو۔ نہ جانے کیا تھا۔

مالا نے نل کھولا اور پانی ہاتھوں میں بھرا۔ پھر اسے چہرے پہ ڈالا۔ جلتی آنکھوں کو قدرے سکون ملا۔ پھر اس نے دائیں بائیں دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ لیکن کوئی تھا۔

وہ تیزی سے دروازے تک آئی۔ ہینڈل گھمایا۔

وہ لاک تھا۔

کشمالہ مبین کا چہرہ سفید پڑنے لگا۔ اس نے زور سے ناب گھمایا۔ وہ جامد رہا۔

"کوئی ہے؟ ہیلو؟" وہ زور زور سے دروازہ بجانے لگی۔ پاؤڈر روم کی دیواریں تنگ ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ گرمی۔ حبس۔ گھٹن۔

اتنے شور کے باوجود کسی کو اس کی آواز سن لینی چاہیے تھی۔ لیکن کوئی اس طرف نہیں آیا۔

اس نے اطراف میں دیکھا۔ دائیں بائیں۔

اپنے پیچھے۔ چہرے کی رنگت آہستہ آہستہ نچڑنے لگی۔

سلیب پہ اس کا پرس رکھا تھا۔ اس نے جلدی سے موبائل نکالا۔ سامنے واٹس ایپ ان باکس کھلا تھا۔ اس کی انگلیوں نے دماغ سے رابطہ چھوڑ دیا۔ وہ خود بخود اسکرین پہ چلنے لگیں۔ ماہر فرید کے نمبر پہ وہ رکیں اور اسے کلک کیا۔

دوسری جانب گھنٹی جانے لگی۔

☆☆☆

وہ موبائل اسکرین کو بجتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اور وہ دونوں اسے۔

"ایکسکیوز می۔" وہ تیزی سے موبائل لیے اٹھا اور اندر لاؤنج میں آیا۔

اسی پل موبائل خاموش ہو گیا۔ محض دو گھنٹیاں ہی ہوئی تھیں۔

اس کی انگلیوں نے بنا سوچے سمجھے کال بیک کا بٹن دبایا اور فون کان سے لگا لیا۔ ساری دنیا ساکت ہو چکی تھی۔ اس کو صرف اپنے دل کے دھڑکنے کی آواز آ رہی تھی۔

کال آگے سے کاٹ دی گئی تھی۔ بے رحم سی ٹوں ٹوں بجنے لگی۔

ماہر کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ اس نے ہاتھ نیچے گرا دیا۔

"خیریت؟" اسے خاموش چہرے کے ساتھ باہر آتے دیکھ کے چنگیز نے پوچھا۔ ماہر نے سر جھٹکا۔ "شبنم تھی۔ شاید غلطی سے کال کی تھی۔" اس کی آواز پست تھی۔ ان کو دیکھے بنا وہ واپس اپنی کرسی پہ بیٹھا۔ چائے کی پیالی کو دوبارہ نہیں چھوا۔ وہ دونوں آپس میں کوئی اور بات کرنے لگے۔ ماہر خاموشی سے موبائل اسکرین کو دیکھے گیا۔

وہ ننھا سا آلہ اب خاموش تھا۔

☆☆☆

یہ میں کیا کر رہی ہوں؟ ابھی دو گھنٹیاں ہی گئی تھیں کہ اس نے جلدی سے کال کاٹ دی۔ پھر

گھبراہٹ سے ماتھے کو چھوا۔ یہ مجھے کیا ہو گیا تھا؟

ایک دم فون جگمگانے لگا۔ اسی نمبر سے کال آ رہی تھی۔ اس نے جلدی سے اسے کاٹ دیا۔

کیا سوچتا ہو گا وہ؟ اتنے دھڑلے سے کہا تھا اسے نہیں بلاؤں گی۔ پھر؟ اُف مالا۔ اُف۔

اس کے اوسان اب بحال ہو رہے تھے۔ اس نے جلدی سے صفورا کو کال ملائی۔ طویل گھنٹیاں جانے لگیں۔ لیکن جواب ندارد۔

وہ ایک دفعہ پھر دروازے تک آئی اور زور سے اس کو بجایا۔ ہتھیلیاں اب سرخ پڑ کے درد کرنے لگی تھیں۔

کوئی کیوں نہیں آ رہا تھا؟ یا شاید... اس نے آئینے میں خود کو دیکھا۔ گردن کی سرخی ہنوز برقرار تھی۔ شاید کوئی اس کی آواز کو دبا رہا تھا۔

کوئی ابھی بھی اس کے ساتھ وہاں موجود تھا۔

اس نے جلدی سے سر پہ دوپٹہ لیا اور چہرہ، دونوں ہاتھوں میں چھپا کے تیز تیز، آیت الکرسی پڑھنے لگی۔ خوف، بے بسی، الفاظ گڈمڈ ہو رہے تھے۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

کلک کی آواز آئی اور دروازہ کھلا۔ ایک لڑکی اپنا بچہ لیے معروف سے انداز میں اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے دیکھتی کشمالہ اپنا پرس اٹھائے تیزی سے باہر نکلی۔

ہال میں آ کے اس نے چند گہرے گہرے سانس لیے۔ اردگرد بہت سے لوگ تھے۔ کیمروں کی فلیش لائٹس۔ ہنسی کی آوازیں۔ وہ اپنے پیروں پہ گول گول گھومی۔ وہ اب بھی اس کے تعاقب میں تھا۔ وہ شخص جس کے پاس اس کی تصویر تھی۔

"ماہر فرید کے پاس ایک البم تھا۔ اس میں آپ کی تصویر تھی۔" کیف جمال کا کہا گیا فقرہ ذہن میں گونجا۔

میں جس آدمی کا غم لیے بیٹھی ہوں، وہ اس عامل کے ساتھ ملوث ہے۔ وہ زیر لب بڑبڑائی۔ بار بار اس کے جرائم یاد کرنے پڑتے تھے ورنہ دل ان کو بھلا دینے کے لیے تیار تھا۔

وہ تیز قدموں سے خارجی راستے کی طرف بڑھ گئی۔ اسے گھر جانا تھا، اور اسے معلوم تھا اسے گھر جا کے کیا کرنا ہے۔ عامل اسے ڈرا کے کیا پیغام دینا چاہ رہا تھا' کشمالہ مبین کی سمجھ میں آ گیا تھا۔

☆☆☆

باسفورس کنارے ایک کشتی کے اندر دو لوگ بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ جیسے فوج کے بچھڑے دوست کافی عرصے بعد ملے ہوں۔ ایک ترکش لوک گیت گنگنانے لگا اور دوسرے اس کو سن رہے تھے۔ ان کی آوازیں چند منزلیں اوپر اس نیم روشن ٹیرس تک سنائی دے رہی تھیں۔

"وہ سمجھتی ہے تم اس عامل کے ساتھ ملوث ہو جس کو وہ خواب میں دیکھتی ہے؟" چنگیز سوچتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ترکش لوگوں کی مڈل کلاس کی اکثریت جادو' جنات اور نظر کو مانتی تھی۔ اور وہاں جگہ جگہ ایسے hodja (مولوی) بیٹھے تھے جو جادو کا علاج کرنے کا دعویٰ کرتے تھے۔

"میں نے اسے بتایا ہے کہ وہ ہمارا مشترکہ دشمن ہے۔ لیکن وہ میرا یقین نہیں کرتی۔" ماہر نے کافی دیر بعد فون اسکرین سے نگاہیں ہٹائیں۔ شاید اب اس اسکرین کو روشن نہیں ہونا تھا۔

"تمہیں پہلے اس عامل کو ڈھونڈنا چاہیے تاکہ اسے بطور ثبوت اس کے سامنے پیش کر سکو اور....."

"چنگیز..." ماہر نے آہستہ سے کہا۔ "مجھے پہلے ہلال کو ڈھونڈنا ہے۔"

چنگیز اور ہیر بل نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر اس نے ہلکے سے سر جھٹکا۔

"آف کورس۔"

ٹیرس پہ خاموشی چھا گئی۔ اوپر لٹکتے قمقمے چپ چاپ اپنے نیچے بیٹھے، تینوں نوجوانوں کے تاثرات پڑھ رہے تھے۔

"کیا اس نے واقعی زیاد کو اپنی زندگی سے نکال دیا ہے؟" چنگیز نے پھر سے کوشش کی۔

"نہیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ خوش نظر آ رہے تھے۔" وہ موبائل کی بجھی ہوئی اسکرین دیکھ رہا تھا۔

"اپنی رقابت ایک طرف رکھ کے بتاؤ۔ وہ.... (چنگیز نے بیربل کو دیکھ کے دہرایا) ٹال ڈارک اور ہینڈسم کیسا آدمی ہے؟"

"ہینڈسم نہیں ہے وہ۔" ماہر نے زور سے موبائل میز پہ رکھا۔ اس کا موڈ خراب ہوگیا تھا۔ بیربل نے مسکراہٹ روکنے کے لیے لبوں پہ ہاتھ رکھ لیا۔

"اس کے علاوہ کوئی بری بات؟"

ماہر نے نیچے کھڑی کشتی کو دیکھا۔ وہ کنارے پہ پانی کے ساتھ ہلکا سا جھول رہی تھی۔

"بس وہ مجھے نہیں پسند۔"

"ہوسکتا ہے وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہوں، ماہر!" بیربل کھنکھارا۔ "شاید تمہیں ان کو ان کے حال پہ چھوڑ دینا چاہیے۔"

کچھ تھا بیربل کے انداز میں کہ ماہر چونک کے اسے دیکھنے لگا۔ "دیکھو اگر دو لوگ آپس میں محبت کرتے ہوں، تو ان کے درمیان میں نہیں آنا چاہیے۔" وہ سوچ سوچ کے بول رہا تھا۔

"اچھا، بیربل آفندی؟" وہ بغور اپنے بھائی کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔

"دو محبت کرنے والوں کو شادی کرنے کی مکمل آزادی ہونی چاہیے۔"

ماہر آنکھوں کی پتلیاں سکوڑے اسے دیکھے گیا۔ بیربل نظر ملائے بغیر کہے جا رہا تھا۔

"یہ ہر انسان کا حق ہے کہ وہ اپنا لائف پارٹنر اپنی مرضی سے منتخب کرے۔"

چنگیز نے ٹانگ سے ٹانگ ہٹائی اور آگے کھسکا۔

"کھل کے بات کرو۔"

بیربل نے تھوک نگلا۔ پھر مسکرا کے ان دونوں کو دیکھا۔

"میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

چنگیز کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے بے اختیار ماہر کو دیکھا۔ وہ حیران نہیں ہوا تھا۔ اس نے پیچھے ٹیک لگائی، سینے پہ بازو لپیٹے اور ٹانگ پہ ٹانگ جمائی۔

"اس دفعہ تم کس سے شادی کرنا چاہتے ہو؟"

زور اس دفعہ پہ تھا۔

"اس کا نام حازان ہے۔ وہ میری بیکری سے صبح کافی لینے آتی ہے۔ ہم پہلے اچھے دوست بنے اور اب ہم شادی کرنا چاہتے ہیں۔" وہ دونوں خاموشی سے سن رہے تھے۔ بیربل کی آواز پُراعتماد ہونے لگی۔

"وہ خوب صورت ہے۔ پڑھی لکھی ہے۔ (وہ کہہ رہا تھا اور ماہر انگلیوں پہ گن رہا تھا۔) اس نے لٹریچر میں ماسٹرز کیا ہے۔ اور..."

"اور لالچی ہے۔" ماہر نے کھلے ہاتھ کی ایک انگلی بند کی۔

"اور چالاک بھی۔" چنگیز نے اپنے ہاتھ کا انگوٹھا موڑا۔

"تمہاری دولت کے پیچھے ہے۔" ماہر نے آخری انگلی مٹھی میں بند کی۔

"بلکہ تمہارے جیسے تین چار پھنسا رکھے ہوں گے۔ تم جلدی شادی پہ مان گئے۔ وہ مان نہیں رہے ہوں گے۔"

چنگیز نے ماہر کو دیکھا اور وہ دونوں بے اختیار ہنس دیے۔

بیربل چند لمحے کچھ بول ہی نہیں سکا۔ پھر اس کا چہرہ سرخ پڑنے لگا۔

"تم لوگ..." اس نے مٹھی بھینچی۔ "تم اس کو جانتے بھی نہیں اور..."

"وہ تمہیں جانتی ہے نا؟" ماہر ٹانگ پہ ٹانگ جمائے پیر جھلا رہا تھا۔ "کیا اسے معلوم ہے کہ تمہارے پاس تمہارے باپ کی دولت اگلے چار سال تک نہیں آئے گی؟"

''اس کو اس سے فرق نہیں پڑتا۔''
''کیا وہ جانتی ہے؟'' اس کی آواز بلند ہوئی۔
''میں اسے بتادوں گا۔'' بیربل نے تھوک نگلا۔
''بتادوں گا..'' ماہر ہلکا سا ہنسا۔ چنگیز نے بھی ہنس کے سر جھٹکا۔
''آہ بیربل... تم کب سمجھو گے۔''
بیربل نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ لب ایک دوسرے میں پیوست کیے۔
''تم لوگ بغیر کسی کو جانے یا سمجھے، اس کے بارے میں اتنی گھٹیا سوچ کیسے رکھ سکتے ہو؟''
''چلو... جان لیتے ہیں۔'' ماہر مسکراہٹ دبا کے سیدھا ہوا۔ ''آج ہی اس کو اپنی حقیقت بتاؤ۔ پھر دیکھو وہ کیا کرتی ہے۔''
''میں بتاتا ہوں وہ کیا کرے گی۔'' چنگیز نے ہنستے ہوئے کیتلی اپنی پیالی میں پھر سے انڈیلی۔ سرخ دھار پیالی میں گرنے لگی۔
''پہلے وہ کہے گی' مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا بیربل!'' آواز باریک کرتے ہوئے شکر دان کے لیے ہاتھ بڑھایا۔
''غم ہو یا خوشی' میں تمہارے ساتھ ہوں بیربل۔'' ماہر نے شکردان اس کے سامنے کیا۔
''پھر وہ تمہارا فون اٹھانا کم کر دے گی...'' چنگیز نے شکر کی دو ڈلیاں چائے میں گرائیں۔
''اس کے بعد ملنا کم کردے گی۔'' ماہر اب اسے چمچ اٹھا کے دے رہا تھا۔
''پھر کچھ دن بعد وہ کہے گی' اِٹس ناٹ یو اِٹس می بیربل۔ ہم اچھے دوست بن کے الگ ہو جاتے ہیں۔'' چنگیز آواز کو باریک کر کے کہہ رہا تھا۔ ماہر بے اختیار ہنس دیا۔
''اور اس کے بعد میرے یار...'' چنگیز نے اپنے بھاری ہاتھ سے سامنے بیٹھے بیربل کا کندھا تھپکا۔ ''تم اگلی لڑکی کی طرف چلے جاؤ گے اور وہ اگلے شکار کی طرف۔''
بیربل نے غصے سے اپنا کندھا پیچھے کیا۔ اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔
''تم دونوں . . .'' اس نے دانت کچکچائے۔ چنگیز چائے میں شکر مکس کر رہا تھا۔ اور ماہر... وہ گردن پیچھے کیے ہنستا جا رہا تھا۔
''میں جس سے شادی کی بات کرتا ہوں' تم اس کے بارے میں یہی کہتے ہو ماہر!'' وہ بے بسی بھرے غصے سے بولا۔
''کیا میں کبھی غلط ہوا ہوں؟'' ماہر نے انگلی کی نوک سے آنکھ میں آیا پانی صاف کیا۔
''اس دفعہ تم غلط ہو۔ میں ثابت کر کے دکھاؤں گا۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ سب سے مختلف۔''
''مختلف۔'' ٹیرس پہ پھر سے ایک قہقہہ گونجا۔ بیربل پیر پٹخ کے کھڑا ہوا۔
''تم دونوں مجھ سے اپنے الفاظ کے لیے معافی مانگو گے۔''
''دیکھتے ہیں۔'' ماہر نے مسکرا کے کندھے اچکائے۔ بیربل چند لمحے اسے گھورتا رہا۔ پھر اس کی آنکھیں چمکیں۔
''اللہ کرے' کشمالہ اس ہینڈسم زیادہ سے شادی کرلے!''
ماہر کی مسکراہٹ برقرار رہی۔ بیربل نے بے بسی سے چنگیز کو دیکھا۔
''اور اللہ کرے تمہاری بیوی کسی کے ساتھ بھاگ جائے!''
چنگیز زور سے ہنسا۔ ''میری تو کوئی بیوی ہی نہیں ہے۔''
''کیونکہ وہ کسی کے ساتھ بھاگ چکی ہے۔'' وہ چلا کے بولا اور دھاڑ سے دروازہ کھول کے اندر چلا گیا۔ ان دونوں کا قہقہہ پھر سے گونجا تھا۔
فیضی خانم کچن میں فریج میں کچھ رکھ رہی تھیں۔ بیربل گلابی چہرہ لیے ان کے سامنے رکا۔

”اگر صبح میں اپنے کمرے میں مردہ پایا جاؤں‘ تو ان دونوں کو میرے جنازے پہ مت آنے دینا۔“
فیضی خانم نے چہرہ اٹھا کے پریشانی سے اسے دیکھا۔
”مگر کل تو میری چھٹی ہے۔“
”اف...“ وہ پیر پٹخ کے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔
دھاڑ سے دروازہ بند ہونے کی آواز باہر ٹیرس تک سنائی دی۔
چنگیز کی مسکراہٹ اب کم ہو چکی تھی۔ وہ پرسوچ نظروں سے ٹیرس کی کھڑکی کو دیکھ رہا تھا۔
”چار سال بعد اس کو اپنی دولت مل جائے گی‘ ماہر! تب یہ ان لالچی عورتوں سے کیسے بچے گا؟“
چار سال بعد بیربل نے تیس سال کا ہو جانا تھا۔ ان کے باپ کی وصیت کے مطابق‘ اگر وہ اپنی کمپنی کو ان کے مختص کیے گئے معیار تک نہیں لے جا سکتا‘ تب بھی تیس برس کی عمر میں اس کو اس کا ٹرسٹ فنڈ مل جائے گا۔
”تب کی تب دیکھیں گے۔“ وہ باہر پھیلی رات کو دیکھ کے کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ہنسی اب غائب تھی۔

☆☆☆

پورچ میں کار کھڑی کر کے وہ تیزی سے باہر نکلی۔ لوہے کے بیرونی زینے سامنے تھے۔ وہ ہیلز سے بدقت زینے پھلانگتی اوپر آئی۔
اسٹوڈیو کا دروازہ کھولا وہ سنسان پڑا تھا۔ سامنے ایک اسٹینڈ رکھا تھا جس پہ اسکیچ کرنے کے لیے کاغذ آویزاں تھا۔ مالا دھیمے قدموں چلتی اس کاغذ کے قریب آئی۔ پھر بے اختیار گردن پہ ہاتھ رکھا۔ اس وقت کوئی اس کا گلا نہیں دبا رہا تھا۔ لیکن گلا دبانے کی وہ تکلیف اسے یاد تھی۔
”مجھے تمہارا پیغام مل گیا ہے۔“ اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ وہ آگے بڑھی اور اسکیچ بک کا صفحہ پھاڑ دیا۔
”میں تمہارا اسکیچ نہیں بناؤں گی۔“ وہ اس صفحے کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہی تھی۔
”تنگ آ گئی ہوں میں تم سے۔ اور اس انسان سے جس نے تمہیں میرے پیچھے لگایا ہے۔“ اس نے ٹکڑے زور سے اچھالے۔ وہ اوپر تک گئے اور پھر تیزی سے اس کے اطراف میں گرتے چلے گئے۔
”چھوڑ دو تم میرا پیچھا۔ بس کر دو۔ تم یہی چاہتے تھے کہ میں زیاد سے شادی نہ کروں۔ نہیں کر رہی میں اس سے شادی۔“ وہ ایڑھیوں پہ گھومتی اطراف میں دیکھتی کہہ رہی تھی۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ بظاہر وہاں کوئی نہیں تھا۔
”میں صرف اپنی ماں کے ساتھ خوش رہنا چاہتی ہوں۔ خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دو!“ آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ وہ گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ دائیں دیکھا، پھر بائیں، وہاں خاموشی تھی۔ لیکن وہ جانتی تھی اس کا پیغام عامل تک پہنچ جائے گا۔
اس نے گردن پہ ہاتھ رکھا۔ وہاں مٹر کے آدھے دانے جتنا سرخ نشان موجود تھا۔ خون کے تین چار قطرے نکل کے جم گئے تھے۔ لیکن وہ قطرے کشمالہ مبین کو ہلا دینے کے لیے کافی تھے۔ وہ جتنا اس عامل کا تعاقب کرے گی‘ اتنا ہی وہ اسے ڈرائے گا۔ اسے اب اپنے تعاقب کار کو نظر انداز کر کے اپنی زندگی میں واپس جانا ہوگا۔
جس وقت وہ اسٹوڈیو کی سیڑھیاں اتر کے واپس نیچے جا رہی تھی‘ ہر طرف خاموشی اور سکوت تھا۔ نہ کوئی آواز تھی نہ کھڑک۔

☆☆☆

اپنی کال کوٹھڑی میں موجود سرکار نے اپنے سامنے زمین پہ رکھی تصویریں دیکھیں۔ ایک مسکراہٹ اس کے بوڑھے چہرے پہ بکھر گئی۔ اس کی سماعت میں کسی نادیدہ مخلوق کی آواز گونج رہی تھی۔
پھر اس نے سمجھ کے سر ہلا دیا۔

''ٹھیک ہے۔ ہم اسے کچھ دیر کے لیے اکیلا چھوڑ دیں گے۔''

اس نے سامنے رکھی کشمالہ اور زیاد کی تصاویر ایک طرف کیں۔ پھر ایک اور تصویر نکال کے اپنے چہرے کے قریب کی۔

وہ بھوری آنکھوں والی مسکراتی ہوئی ماہ بینہ کا چہرہ تھا۔

''ایک ماہ بعد اس کا بچہ ہونا ہے۔ لیکن نہیں ہونا چاہیے۔'' اس نے اپنی سرخ ہوتی آنکھیں اٹھا کے اپنے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے نادیدہ موکلات کو دیکھا۔

''اگر ہم یہ بچہ مارنے میں کامیاب ہو گئے تو ہماری پاور کئی گنا بڑھ جائے گی۔ ہمارے جادو جلد اثر کریں گے۔ ہم جو چاہے کر سکیں گے۔''

اس نے قریب رکھی ایک صندوقچی کھولی۔ اندر سے ایک ننھا سا گڈا نکالا۔ یہ بازار سے خریدا گیا کوئی سستا سا بے بی ٹوائے تھا۔

''یہ بچہ اس دنیا میں نہیں آنا چاہیے۔'' عامل کے ہاتھ اس بے بی کے کپڑے اتار رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ برہنہ ہو گیا۔ پھر اس نے ساتھ رکھی سوئیوں میں سے ایک سوئی نکالی اور اسے گڈے کے دل کے مقام پہ اندر گھسا دیا۔ اس کے چہرے پہ مسکراہٹ تھی۔

☆☆☆

چلی ویک کے اس سفید گھر کے لاؤنج میں ماہی بیٹھی تھی۔ سر پہ دوپٹہ لپیٹے، وہ تسبیح ہاتھ میں لیے ہوئے تھی۔ وہ نماز پڑھ کے ہٹی ہی تھی کہ ماں کی کال آ گئی۔ وہ خود اب صحت مند اور ہشاش بشاش لگتی تھیں۔ البتہ اسے دیکھ کے فکر مند ہو گئی تھیں۔

''پاکستان آ جاؤ ماہی! وہاں اکیلے کیسے ڈلیوری کرواؤ گی؟''

''جیسے گوریاں بچے پیدا کرتی ہیں ماں! یہاں بہت ہیلپ مل جاتی ہے۔ سب ہو جائے گا۔''

''نہیں بیٹے! پاکستان آ جاؤ۔ میں ہوں گی یہاں۔ مالا ہے۔ بختو ہے۔ بیٹے یہ بڑا مشکل وقت ہوتا ہے۔''

عباد کمرے سے نکل کے کچن کی طرف آ رہا تھا۔ اس بات پہ چہرہ گھما کے ماہی کو دیکھا۔ لیکن کہا کچھ نہیں۔ خاموشی سے کچن کیبنٹ کا دروازہ کھولا اور کچھ ڈھونڈنے لگا۔

''میں ڈلیوری کے فوراً بعد آ جاؤں گی۔ پکا پرامس۔''

جیسے ہی ماہی نے فون بند کر کے دوبارہ تسبیح اٹھائی، عباد کیبنٹ بند کر کے اس کی جانب گھوما۔

''تم کہو تو ہم پاکستان چلے جاتے ہیں۔ بزنس کلاس۔ ڈائریکٹ فلائٹ۔ تم آرام سے سفر کر لو گی۔''

''اب دن ہی کتنے رہ گئے ہیں، عباد! اسی مہینے کے آخر میں ڈلیوری ہے۔ اور پھر..'' اس کی آواز دھیمی ہوئی۔ ''پچھلی دو دفعہ بھی سفر کرنے کی غلطی کی تھی۔ ہر دفعہ اسی کم بخت دوہا ائیر پورٹ پہ کچھ نہ کچھ ہو جاتا تھا۔ میں اس دفعہ رسک نہیں لے سکتی۔''

''لیکن ڈاکٹر نے کہا ہے تم سفر کر سکتی ہو۔ فی الحال سب کچھ ٹھیک ہے۔''

ماہی نے بھوری آنکھیں اٹھا کے عباد کو دیکھا تو وہ بھیگی ہوئی تھیں۔

''تم مانو یا نہ مانو، کبیرہ تائی کی ہمارے بچے سے پرانی دشمنی ہے۔ وہ اس بچے کو دنیا میں نہیں آنے دینا چاہتیں۔ میری بے احتیاطی ان کو راستہ دے گی۔'' اس نے تسبیح پھر سے اٹھالی۔

''یار کس کے پاس اتنا ٹائم ہوتا ہے کہ کسی کے بچے پہ جادو کروائے۔ میں مانتا ہوں ان باتوں کو لیکن اب تم کچھ زیادہ ہی وہم کرنے لگی ہو۔'' وہ سر جھٹک کے کیبنٹ سے کچھ ڈھونڈنے لگا۔

''میں تم سے زیادہ پاکستان جانے کی خواہش رکھتی ہوں۔ میرے دل سے پوچھو۔ ماں جب سے بیمار ہوئی ہیں، میں ان سے نہیں ملی۔ ان کی خدمت کا موقع مجھے نہیں ملا۔ مالا اور معید کو ملا ہے لیکن جیسے ہی

بے بی پیدا ہوگا..." دھڑکتے دل سے کہا۔" ان شاء اللہ ہم پہلی فلائٹ سے پاکستان جائیں گے۔"

"فوراً نہیں جا سکیں گے ماہی! پہلے بے بی کا NICOP (شناختی کارڈ) بنے گا۔ تیس پینتیس دن لگیں گے۔"

"ہم نائیکوپ بنتے ہی چلے جائیں گے نا۔" اس نے خود کو تسلی دی۔" ویسے بھی ماں اب ٹھیک ہیں۔ تب تک وہ مزید بہتر ہو جائیں گی۔"

عباد اپنی مطلوبہ چیز تلاش کر کے وہاں سے چلا گیا اور ماہی خاموشی سے تسبیح پڑھتی رہی۔ دفعتاً فون پھر سے بجا۔ نمبر دیکھ کے اس نے گہری سانس لی۔ ماتھے پہ بل پڑ گئے۔

"میں کئی دن سے آپ کو میسیج کر رہی ہوں۔ آپ کہاں تھے ماہر بے؟"

"بزی تھا۔ آج وقت ملا ہے۔ خیریت؟"

"مجھے مالا نے بتایا ہے کہ آپ نے اس کا ریستوران خریدا تھا۔ آپ نے مجھے یہ نہیں بتایا۔" اس کی آواز میں خفگی تھی۔

وہ دھیرے سے ہنسا۔"تم بھی اپنی بہن کی طرح مجھ پہ شک کر رہی ہو؟"

"شک نہیں کر رہی۔" اس کی آواز دھیمی ہوئی۔" لیکن سوال کرنا میرا حق بنتا ہے۔"

"مجھے اس بارے میں علم نہیں تھا ماہ بینہ! میں وہ کمپنی نہیں چلاتا۔ مالک چلاتا ہے۔"

"مالک کون؟" ماہی کے ابرو مشکوک انداز میں اکٹھے ہوئے۔ فون اسپیکر پہ کر کے اس نے انسٹاگرام کھولا۔

"میرا چچا۔ اس نے ایک لبنانی گروپ کو اونرشپ خرید کے دیا ہے۔ ہماری کمپنی ہر روز ایسی خرید و فروخت کرتی ہے۔"

"کیا آپ نے مالک سے پوچھا کہ اس نے یہ کیوں کیا؟" اس کا انگوٹھا اسکرین کو اسکرول کر رہا تھا۔

"نہیں۔ ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔"

"یہ سفید بالوں والا ہے مالک؟"

"تمہیں کیسے معلوم؟" وہ حیران ہوا۔

"آپ نے اسے انسٹا پہ فالو کیا ہوا ہے۔ دنیا بہت چھوٹی ہے ماہر بے! اور یہ انگلیوں میں سما جاتی ہے۔"

وہ ہلکا سا ہنس دیا۔

"جاب کر لو لڑکی۔ ورنہ سارا دن گھر میں فارغ یہی کام کرتی رہو گی۔"

"مجھے شوق نہیں ہے جاب کا۔ میں اپنی گھرداری میں خوش ہوں۔ اچھا!" تڑخ کے بولی۔

وہ خاموش رہا تو اس نے آواز دھیمی کی۔

"مالک نے مالا کا ریستوران کیوں بکوایا؟"

"اس سوال کا جواب وہی دے گا۔ میں نے جب اسے البم کی تصاویر دکھائی تھیں اور بتایا تھا کہ میں اس لڑکی کو ڈھونڈ رہا ہوں تو اس نے تین دن میں مجھے مالا کی معلومات لا دی تھیں۔ میں سمجھا اس کے پاس بہت کام کے بندے ہیں۔ لیکن نہیں۔ مالک مالا کو پہلے سے جانتا تھا۔ وہ اس سے مل چکا تھا۔ کب، کہاں، مجھے نہیں معلوم۔ لیکن اس نے ہوٹل میں مالا سے ملنے کے لیے بیربل کو بھیجا۔ خود نہیں گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ مالا اس کو پہچانے۔"

"یعنی عبدالمالک فرید کچھ چھپا رہے ہیں۔" پھر اس کو یاد آیا۔" کبیرہ تائی کے نئے عامل کے بارے میں کچھ معلوم ہوا؟"

ماہر نے بے زاری بھری سانس خارج کی۔

"اس کی کیا ضرورت ہے؟ ہم کتنے عاملوں کو پکڑیں گے؟ تم اپنا ایمان مضبوط رکھو۔ کچھ نہیں ہوگا تمہارے بچے کو۔"

ماہی کی پلکیں بھیگنے لگیں۔" مجھے پھر سے برے خواب آنے لگ گئے ہیں۔"

"ہر چیز مکتوب ہے ماہ بینہ! مکتوب، لکھی ہوئی، تمہارے بچے کی زندگی بھی۔ اور موت بھی۔ وہ اپنے وقت پہ آتی ہے۔ ایک دن اوپر، نہ ایک دن نیچے، کوئی جادو کوئی جن اس کو اوپر نیچے نہیں کر سکتا۔"

ماہی کے لب مسکراہٹ میں ڈھلے اور آنکھوں سے ایک آنسو ٹپکا۔

''مکتوب۔'' اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''اگر میرے بچے کی زندگی اللہ نے لکھی ہوئی ہے تو اسے کوئی مار نہیں سکتا۔''

''اسے کوئی مار نہیں سکتا۔'' اس نے نرمی سے دہرایا۔

ماہی پورے دل سے مسکرا دی۔ فون بند کیا ہی تھا کہ عباد باہر آتا دکھائی دیا۔ اس کے چہرے پہ خفگی تھی۔

''تم یہ ٹھیک نہیں کر رہیں۔'' وہ صوفے پہ اس کے پیچھے جھک کے کھڑا ہوا اور اس کے کندھے کے قریب کہنے لگا۔ ''تم مالا کے ساتھ دھوکہ کر رہی ہو۔ اس کو معلوم ہوا کہ تم ماہر سے بات کرتی ہو تو وہ بہت ناراض ہوگی۔''

''میں اسے بتا دوں گی۔ جب پاکستان جاؤں گی۔ ابھی مجھے اسٹریس مت دو۔''

عباد افسوس سے سر جھٹک کے سیدھا ہوا اور واپس پلٹ گیا۔ ماہی کے آگے بین بجانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ پھر سے تسبیح پڑھنے لگی تھی۔

اگر اس کی اولاد مکتوب تھی تو دنیا کے سارے جادوگر اکٹھے ہو کے بھی اس کے بچے کو موت نہیں دے سکتے تھے۔

☆☆☆

اس تاریک کوٹھڑی، میں زمین پہ چوکڑی مارے عامل سرکار کے سامنے آج بھی بہت سی تصاویر رکھی تھیں۔ دھاگے، مختلف اقسام کی روشنائیاں لیکن فی الحال اس کی توجہ ہاتھ میں پکڑے گڈے پہ تھی۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ انگلی میں ایک لمبی نوکیلی سوئی تھی۔

سرکار کے ہاتھ اس کی نوک کو سرخ روشنائی میں ڈبو ڈبو کے گڈے پہ لگا رہے تھے۔ پہلے اس کے سینے کے درمیان صلیب کا نشان بنایا۔ پھر باری باری ہر عضو پہ اس کا نوکیلا قلم کانٹے لگاتا گیا۔

''ماں کے پیٹ میں بچے کا ایک ایک عضو آہستہ آہستہ ضائع ہو جائے گا۔'' سرکار کی بڑبڑاہٹ جاری تھی۔ ''یہاں تک کہ جب بچہ پیدا ہوگا' وہ مرا ہوا ہوگا۔'' اس کی آواز میں جوش تھا۔

بچوں پہ کیے جانے والے جادو سرکار، کو سب سے زیادہ پسند تھے۔

☆☆☆

زیاد کو کیمپین کی وجہ سے کچھ دن لاہور میں رکنا پڑ گیا۔ دبئی جانے سے پہلے وہ ان سے ملنے مبین منزل آیا تھا۔ معید اس کا پہلے ہی معترف تھا' اب اس کی نظروں میں زیاد کی عزت مزید بڑھ گئی تھی۔

بخت بی چائے لے آئیں۔ ماں نے اپنے زمانے کا کوئی قصہ شروع کر دیا۔ زیاد دھیمی آواز میں مسکرا مسکرا کے ان کے قصوں میں اضافہ کیے گیا۔ ماہی کی طرح اسے بھی سب رشتے داروں کا علم تھا۔ مالا اور معید ہنستے ہوئے سنتے گئے۔ وہ دونوں رشتے داروں کی خبر رکھنے کے معاملے میں ایک جیسے تھے۔

''اب میں اجازت چاہوں گا۔'' اس کی فلائٹ کا وقت قریب تھا۔ وہ گھڑی دیکھتے ہوئے اٹھا تو نہ جانے کیوں اس کا دل اداس ہوا۔

''جب بھی آیا کرو' ہم سے ضرور ملا کرو۔'' وہ ماں کے سامنے جھکا تو وہ اس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے تاکید کرنے لگیں۔

''اپنی امی کو سلام دینا۔''

''امی کے لیے دعا کیجئے گا۔ ان کے کچھ ٹیسٹ کروائے ہیں۔ رپورٹ کا انتظار ہے۔'' کچھ تھا اس کے لہجے میں۔ کچھ اداس! کچھ پریشان، کشمالہ چونکی۔ دل بری طرح دھڑکا۔ ایک اور ماں؟ نہیں۔

''تمہاری ماں بہت نیک ہے' زیاد! اس نے اپنے سسرال اور خاندان' سب کی بہت خدمت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو تکلیف نہیں دے گا۔ وہ ٹھیک ہو جائے گی۔''

''ماں ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ہم آنٹی کے لیے دعا

کریں گے۔"

وہ اسے چھوڑنے پورچ تک آئی۔ وہ کچھ مضطرب لگ رہا تھا۔

"زیاد وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔" اس نے اس کا چہرہ دیکھ کے تسلی دی۔ وہ دونوں پورچ کی دھوپ میں کھڑے تھے۔ کمپنی کی کار ساتھ کھڑی ان کی منتظر تھی۔

"وہ ٹھیک نہیں ہوں گی۔" زیاد نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھ کا کنارہ بھیگا ہوا تھا۔ "ڈاکٹرز کو بلڈ کینسر کا شبہ ہے۔"

اس نے بے اختیار سینے پہ ہاتھ رکھا۔ ایک اور ماں؟

"ان کو شاید خود بھی علم ہے کہ ان کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ وہ جلد از جلد میری شادی کرنا چاہتی ہیں۔" وہ دھوپ میں آنکھوں کی پتلیاں سکوڑے کار کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"ماؤں کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے زیاد! ان کی بات مان لیں۔ کوئی اچھی لڑکی ملے تو شادی کر لیں۔"

وہ زخمی سا مسکرا دیا۔

"میں عام سا انسان ہوں کشمالہ! مجھے عام سی لڑکی ہی ملے گی۔"

"مل جائے تو اس کو کھونا مت۔" حلق میں کچھ پھنس سا گیا۔ کیا اس نے غلطی کر دی تھی؟

زیاد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر وہ چلا گیا اور وہ کتنی دیر اس جگہ کو دیکھتی رہی۔

سلیم گیٹ بند کرنے لگا جب اسے "مالا باجی" کی آواز آئی۔ اس نے ماتھے پہ ہاتھ کا چھجا بنا کے دیکھا۔

"تم اتنی دھوپ میں یہاں کیا کر رہے ہو؟"

شلوار قمیص والا، پٹھان بچہ کمر پہ ہاتھ رکھے شرماتا ہوا اندر داخل ہوا۔ وہی مسکرا کے اسے آتے دیکھے گئی۔ یہاں تک کہ وہ اس کے سامنے آگیا۔

"کیا چھپا رکھا ہے؟"

اس نے دونوں ہاتھ آگے کیے۔ ان میں موتیوں کے گجرے تھے۔

"آپ کی امی کے لیے۔" وہ ہنس دی۔ پھر اس کی ہتھیلیوں سے گجرے اٹھائے اور ناک کے قریب لے جا کے سونگھا۔ خوشبو نے دھوپ اور گرمی کا احساس غائب کر دیا۔

"آپ نے کہا تھا مجھے فالتو رنگ دے دیں گی۔" وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ دفعتاً اس کی نگاہ لان پہ پڑی۔ اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوئی۔ لب بے یقینی سے کھل گئے۔

"آپ کے گھر میں موتیے کا پودا لگا ہوا ہے باجی؟" اس نے شاک کے عالم میں کشمالہ کو دیکھا۔ وہ بے اختیار ہنس دی۔

"ہاں۔ لیکن تم پھر بھی مجھے روز گجرے لا کے دو گے۔"

بچے نے ایک مایوس نظر اپنے گجرے پہ ڈالی۔ "لیکن..."

"میں تمہیں فالتو رنگ نہیں دوں گی۔ بلکہ میں تمہیں پینٹ کرنا سکھاؤں گی۔ سیکھو گے؟"

اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ شرما کے سر ہلا دیا۔

"اس کو اوپر میرے اسٹوڈیو میں لے جاؤ۔ میں آتی ہوں۔"

اس نے سلیم کو اشارہ کیا جو مشکوک نظروں سے اس پٹھان بچے کو گھور رہا تھا۔

"اور ان سب کا کیا؟" اس کی شرماتی آواز پہ وہ چونکی۔ گیٹ کی طرف دیکھا۔ وہاں اس کی شکل والے چار اور بچے دانت نکالتے جھانک رہے تھے۔ ان کے لباس بے ترتیب اور میلے تھے۔ لیکن چہروں پہ انوکھی رونق تھی۔

کشمالہ نے گہری سانس خارج کی۔ "ان کو بھی اوپر لے جاؤ۔" وہ اور کیا کہہ سکتی تھی۔

"یہ پلٹون کہاں سے جمع کر لی؟"

وہ ماں کے پاس واپس آئی تو دیکھا۔ وہ ڈرائنگ روم کی کھڑکی سے باہر جمع ہوئے بچوں کو

دیکھ کے ماتھے پہ ہاتھ رکھے ہوئے تھیں۔ دھڑ دھڑ کی آوازوں کے ساتھ وہ اوپری زینوں پہ بھاگ رہے تھے۔

''ریستوران والا پروجیکٹ ختم ہو چکا ہے' ماں! نیا کام ملنے سے پہلے کچھ دن میں گھر پہ ہوں گی۔ اچھا ہے ان بچوں کو کچھ سکھا دوں گی۔'' وہ ان کے قدموں میں بیٹھی اور ان کے نرم، بھری بھری کلائیوں میں گجرے پہنانے لگی۔ ماں نے مسکرا کے ان پھولوں کو دیکھا پھر اپنی بیٹی کے جھکے سر کو۔ وہ انہماک سے گجرے کا ہک بند کر رہی تھی۔

''ماہی سے کہو پاکستان آ جائے۔ وہ وہاں اکیلے کیسے ڈیلیوری کروائے گی۔'' ان کی ہر روز یہی تکرار ہوتی تھی۔

''وہ سفر کرنے سے ڈرتی ہے' ماں! ویسے بھی ستمبر کے آخر میں ڈیلیوری ہو گی اور بے بی کا ناٹیکوپ اکتوبر کے آخر تک بن جائے گا۔ یکم نومبر کو وہ آپ کے پاس ہو گی۔''

مسکرا کے انگلیوں پہ تاریخیں گن کے بتائیں۔

پھر ایک دم وہ ٹھہر گئی۔ بالکل ساکت۔

(آپ کی ماں کے پاس چھے ماہ ہیں۔ آپریشن کروائیں یا نہ کروائیں۔)

ڈاکٹر ووہرا کی آواز کسی کھائی سے آتی سنائی دی۔ (آج یکم مئی ہے۔ چھے ماہ بعد یکم نومبر ہو گی۔ ڈاکٹر ووہرا کی ڈیڈ لائن۔)

اُف۔ اس نے سر جھٹکا۔ چہرے کی رنگت یک دم پیلی ہوئی۔ پھر ماں کو دیکھا۔ اب وہ تندرست ہو رہی تھیں۔ کل ہی ایم آر آئی کروایا تھا۔ مننجیوما دوبارہ نہیں بڑھا تھا، نہ اگلے دس پندرہ برس تک بڑھنے کا امکان تھا۔

ڈاکٹر ووہرا کی ٹائم لائن جھوٹی تھی۔ یکم نومبر آ کے گزر جائے گا اور کچھ بھی نہیں ہو گا۔ وہ اب کوئی وہم نہیں پالے گی۔ نہ وہ اس عامل کو ڈھونڈے گی۔ نہ ہی وہ ان چکروں میں پڑے گی۔

اسے صرف ماں پہ فوکس کرنا تھا۔ ماں اور بچوں پہ۔ رنگوں اور پھولوں کے گجروں پہ۔

زیاد سلطان' ماہر فرید' عامل اور ڈاکٹر ووہرا کی ٹائم لائن... اسے ہر شے کو دماغ سے جھٹکنا تھا۔

☆☆☆

''ہر چیز قلم سے شروع ہوتی ہے۔''

کشمالہ کے اسٹوڈیو کے بلائنڈز ہٹے ہوئے تھے۔ فرش پہ بچے نیم دائرے کی صورت میں بیٹھے تھے۔ سب کے سامنے اسکیچ بکس تھیں اور وہ ان سب کو ایک ایک پنسل پکڑا رہی تھی۔ اس کے بال جوڑے میں بندھے تھے اور سر پہ سبز رومال بندھا تھا۔

''سب سے پہلے قلم کو بنایا گیا تھا۔''

(استنبول میں کیف کے کانفرنس روم میں بہت سے لوگ جمع تھے۔ ان کے سامنے درجنوں نقشے پھیلے تھے۔ وہ سربراہی جگہ پہ کھڑا' جھک کے' قلم سے نقشے پہ ایک جگہ دستک دے رہا تھا۔ سامنے بیٹھے افراد خاموشی سے سر ہلاتے اس کو سن رہے تھے۔)

''پھر قلم سے ایک کتاب لکھوائی گئی تھی۔ لوح محفوظ۔''

(کبیرہ بیگم اپنے بیڈروم میں کھڑی تھیں۔ دو ملازمائیں ایک لمبے بیگ میں مقید ڈریس سامنے لٹکا رہی تھیں۔ کبیرہ کے چہرے پہ مسکراہٹ تھی۔ اس نے انگوٹھیوں سے مزین ہاتھ سے بیگ کی زپ نیچے کی۔ اندر ایک سیاہ لباس جھانک رہا تھا۔ نیا ڈیزائنر وئیر۔ کبیرہ اپنے پسندیدہ جنازوں کے لیے نئے لباس اور نئی جیولری بنوایا کرتی تھی۔ یہ لباس ماہی کے بچے کی موت کے لیے تھا۔

جب کینیڈا سے خبر آئے گی' تو وہ یہی لباس پہن کے حور جہاں سے ملنے جائیں گی۔

کبیرہ نے ڈریسنگ ٹیبل پہ رکھی چیک بک کھولی۔ اور ایک قلم اٹھایا۔ پھر چیک پہ ایک رقم لکھ کے سائن کی۔ یہ اس عامل کے لیے تھی۔ جتنی رقم۔ اتنا مضبوط کام۔)

''اس کتاب لوح محفوظ میں ہم سب کی قسمتیں

مکتوب کر کے بند کر دی گئی تھیں۔"

(ایک کوورکنگ اسپیس کی اونچی خالی دیوار کے ساتھ کشمالہ مبین بیٹھی تھی۔ اس کی گریفائٹ پینسل دیوار پہ اسکیچ بنا رہی تھی۔ ارد گرد گزرتے لوگ رک رک کے ستائش سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اس کے لبوں پہ مسکراہٹ تھی' کانوں میں ہینڈز فری لگے تھے اور وہ بہت مہارت سے اپنا کام کر رہی تھی۔)

"قلم نے اس دنیا کی ہر چیز کو تخلیق میں آنے سے پہلے ہی لکھ دیا تھا۔"

(ماہر کے آفس میں نیم اندھیرا سا تھا۔ کھڑکی کے ساتھ ایک بڑی میز کا اضافہ کر دیا گیا تھا، جہاں ایک سرخ عمارت کے تین طرح کے ماڈل رکھے تھے۔ وہ اپنی کرسی پہ بیٹھا تھا۔ سامنے ایک گرافک ٹیبلیٹ رکھا تھا جس پہ وہ مہارت سے ڈیجیٹل پین کے ذریعے لکیریں کھینچ رہا تھا۔ اسکرین کی نیلی روشنی اس کے چہرے پہ پڑ رہی تھی۔ دفعتاً وہ رکا۔ ساتھ رکھا موبائل اٹھا کے دیکھا۔ گرین آئیز کی چیٹ کھولی۔ کوئی میسیج نہیں۔ کوئی پکار نہیں۔ اس نے کرب سے آنکھیں بند کیں۔ دل میں اٹھتے درد کو محسوس کیا۔

ایک لمحہ تھا۔ ماہر فرید نے اسے جی لیا۔ پھر آنکھیں کھولیں اور سپاٹ چہرے کے ساتھ پین پھر سے اٹھا لیا۔)

"اور اس قلم کے لکھے کو کوئی نہیں مٹا سکتا۔"

(ماہی ہسپتال کے کمرے میں لیٹی تھی۔ اس کا چہرہ پسینے سے تر تھا۔ جسم کی کئی ہڈیوں کو توڑ دینے والی جیسی تکلیف کے بعد وہ نڈھال تھی۔ عباد اس کے ساتھ کھڑا تھا اور مسکرا کے اس کا ہاتھ تھامے ہوئے تھا۔ نرس نے کمبل میں لپٹا ایک ننھا سا وجود اس کے سامنے کیا۔

"بے بی گرل ہے۔ اور بہت صحت مند ہے۔"

مکتوب۔ وہ بڑبڑائی۔ پھر وہ ایک دم چہرہ ہاتھوں میں چھپا کے رونے لگ گئی۔ وہ ہنس بھی رہی تھی۔ اور وہ رو بھی رہی تھی۔)

"انسان کو قلم بہت دیر سے ملا تھا۔ اسے ادریس علیہ السلام نے سب سے پہلے استعمال کرنا شروع کیا تھا۔"

(عالی سرکار کے ہاتھ زعفرانی سیاہی میں ڈوبے قلم کو غصے سے اس گڈے پہ رگڑ رہے تھے۔ بے جان گڈا ساکت تھا۔ پھر اس نے زور سے قلم کو دو حصوں میں توڑ دیا۔ اس کا چہرہ سرخ بھبھوکا ہو رہا تھا۔

"دفعہ ہو جاؤ تم سب۔ ایک کام نہیں کر سکے تم۔ ایک بچہ نہیں مار سکے!"

اس نے گڈا اٹھایا اور پوری قوت سے دیوار پہ دے مارا۔

عالی نے چہرے پہ آیا پسینہ آستین سے صاف کیا۔ پھر اپنے بوڑھے جھریوں زدہ ہاتھوں کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔

ایک بچہ ہم نہیں مار سکے۔ ایک کمزور بچہ؟ اس کا سر شکست خوردگی سے دائیں بائیں ہل رہا تھا۔)

"بہت سے انسانوں نے قلم کے لکھے کو بدلنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن آج تک کوئی کامیاب نہیں ہو سکا۔"

(ماں صوفے پہ بیٹھی مسکرا رہی تھیں۔ ساتھ موجود مالا نے موبائل ان کے سامنے پکڑ رکھا تھا۔ اسکرین پہ ماہی اور عباد نظر آ رہے تھے۔ ماہی ہنستے ہوئے گلابی کمبل میں لپٹی ننھی سی بے بی ان کو دکھا رہی تھی۔

"ہم نے اس کا نام حورِ عین رکھا ہے۔ حور جیسی آنکھوں والی۔"

"حور عین۔" ماں مسکراتے ہوئے بچی کی سبز آنکھوں کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ ان کا عکس تھی۔

ان کے ہاتھ میں دو نوکیلی سلائیاں تھیں جن پہ وہ مہارت سے انگلیاں چلاتے ہوئے اون کا گولہ بن رہی تھیں۔ ماہی کی بیٹی کے گلابی سوئیٹر کے گھر ایک کے بعد ایک چڑھ رہے تھے۔)

"قلم کے لکھے کو "قدر" کہتے ہیں۔ اور قدر کو کوئی شے نہیں بدل سکتی۔ نہ کوشش۔ نہ جادو۔ نہ

بددعا۔"

("دفعہ ہوجاؤ تم۔ ناکام عامل۔فراڈ۔ میں تمہیں اتنا پیسہ کھلاتی رہی اور تم ایک بچے کو نہیں مار سکے۔" کبیرہ فون پہ چیختے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"بی بی! ہم نے چالیس دن تک چلا کاٹا لیکن..."

کبیرہ نے زور سے موبائل دیوار پہ دے مارا۔

وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے فرش پہ بیٹھی تھیں۔مسلسل رونے کے باعث ان کی آنکھوں کا سارا کاجل، بہہ گیا تھا۔اور اب وہ سیاہ اور متورم ہو رہی تھیں۔انہوں نے ایک نظر وارڈروب کے ساتھ آویزاں ڈیزائنر ڈریس پہ ڈالی۔پھر گھٹنوں پہ رکھا ایک فوٹو فریم دیکھا جسے وہ کافی دیر سے پکڑے ہوئے تھیں۔

اس میں ایک چھوٹے بچے کی تصویر مسکرا رہی تھی۔گورا چٹا خوبصورت بچہ۔کبیرہ نے تصویر کے چہرے پہ ہاتھ پھیرا۔آنسو پھر سے بہنے لگے۔)

"قدر کو صرف ایک شے تبدیل کرسکتی ہے۔وہ ہے دعا۔"

(زیاد ایک ڈاکٹرز کلینک میں بیٹھا تھا۔اس کا چہرہ زرد اور جھکا ہوا تھا۔ڈاکٹر میکانکی انداز میں قلم سے پیڈ پہ کچھ لکھ رہا تھا۔پھر اس نے سر اٹھا کے زیاد کو دیکھا اور افسوس سے نفی میں سر ہلالیا۔

"زیادہ سے زیادہ ایک سال ہے ان کے پاس۔"

ایک آنسو زیاد کی آنکھ سے نکلا اور اس کے سانولے چہرے پہ گرتا گیا۔اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

"ایک سال۔" وہ بڑبڑایا۔)

"دعا نیچے سے اوپر جاتی ہے۔اور قدر اوپر سے نیچے آتی ہے۔جو زیادہ طاقت ور ہو فتح اس کی ہوتی ہے۔"

(کشمالہ نرمی سے ماں کا ہاتھ تھامے کھڑی تھی۔وہ سہج سہج کے قدم اٹھا رہی تھیں۔وہ مسکرا کے انہیں اگلا قدم رکھنے کے لیے کہہ رہی تھی۔پھر اس نے ان کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ماں نے بے چینی سے اسے دیکھا۔

"کچھ نہیں ہوگا۔اب آپ خود چلیں گی۔بغیر سہارے کے۔" وہ چند قدم پیچھے ہٹی۔ماں نے جھجکتے ہوئے ایک قدم رکھا۔پھر دوسرا، بنا سہارے کے وہ دھیرے دھیرے اپنے پیروں پہ چلنے لگی تھیں۔

مالا مسکراتے ہوئے انہیں اپنے قریب آتے دیکھ رہی تھی۔اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔اور لب مسکرا رہے تھے۔)

"قلم کے لکھے کا ایک وقت ہوتا ہے۔اس وقت سے نہ پہلے کچھ ملتا ہے نہ بعد میں، ہر انسان کو اپنا وقت پورا کرنا ہوتا ہے۔"

(ماہی اور عباد کے سفید لاؤنج میں ایک کاٹ رکھا تھا جس میں کمبل میں لپٹی ننھی گڑیا سو رہی تھی۔ماہی کچن سنک پہ نل کھولے کھڑی پانی سے برتن گزار رہی تھی جب گھنٹی بجی۔اس نے ہاتھ پونچھے اور پردہ ہٹا کے گلاس ڈور کھولا۔سردی کی ایک لہر اندر آئی۔

کوریئر بوائے نے ایک قلم اس کی طرف دستخط کے لیے بڑھایا۔اس نے ناسمجھی سے اس کے ٹیب پہ دستخط کیے۔پھر اپنے نام آیا لفافہ لیے اندر آئی۔کپکپاتے ہاتھوں سے اسے چاک کیا۔

اندر ایک نائیکوپ تھا۔حورعین عباد کا نائیکوپ۔

ماہی نے بے اختیار چیخ روکنے کے لیے منہ پہ ہاتھ رکھ لیا۔آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"حور... حور..." وہ بھاگتی ہوئی کاٹ میں لیٹی بچی تک آئی۔

"تمہارا نائیکوپ آگیا۔بے بی! اب ہم پاکستان جاسکتے ہیں۔اوہ میرے اللہ۔ہم ماں کے پاس جاسکتے ہیں۔" اس کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو بہہ رہے تھے۔

اس نے ایک نظر دیوار پہ لگے کیلنڈر کو دیکھا۔آج اٹھائیس اکتوبر تھی۔اس نے پہلے سے انتیس کی

شام کی فلائٹ بک کر رکھی تھی۔ کینیڈا سے جرمنی، جرمنی سے قطر اور قطر سے پاکستان۔ پھر وہی دوہا ائیر پورٹ آئے گا درمیان میں۔ لیکن خیر، یکم نومبر کی صبح وہ پاکستان میں ہو گی۔

وہ ایک سال سے ماں سے نہیں ملی تھی، لیکن ان کی بیماری کے یہ آخری چھ ماہ چھ سال پہ محیط تھے۔ اب بالآخر تکلیف ختم ہونے والی تھی۔

(وہ اپنی ماں سے ملنے جا رہی تھی۔)

''ہر انسان اس قلم کے لکھے کا پابند ہے۔ اسے اپنا مکتوب وقت پورا کرنا ہی ہے۔''

☆☆☆

یکم نومبر کی صبح ایک خوب صورت خواب سے ہوئی تھی۔

کشمالہ کی آنکھ آہستہ سے کھلی۔ اس نے پلکیں جھپکائیں۔ اس کے لبوں پہ مسکراہٹ تھی۔ آج بند آنکھوں کے دوسری طرف کوئی ڈراؤنا خواب نہیں آیا تھا۔ آج اس نے ایک خوب صورت ایک پیارا خواب دیکھا تھا۔ وہ چند لمحے اپنے خواب کو سوچتی رہی۔ نہ جانے اس کا کیا مطلب تھا۔

پھر فجر کی اذان پہ اس کی توجہ بھٹکی۔ بیڈ پہ حرکت ہوئی تو اس نے کہنی کے بل پہلو بدلا۔ ماں پیر بستر سے اتارتی دکھائی دے رہی تھیں۔ ساتھ ہی وہ سو کے اٹھنے کی دعا پڑھ رہی تھیں۔

''جاگ گئیں؟'' اس نے مسکرا کے ان کی پشت کو دیکھ کے پوچھا۔ وہ سائیڈ ٹیبل کا سہارا لے کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''ہاں۔ لیکن آج میں فجر کے بعد سوؤں گی۔'' انہوں نے گھڑی دیکھی۔

مالا مسکرا دی۔ ماں فجر کے بعد نہیں سوتی تھیں لیکن آج صبح ماہی نے پہنچنا تھا۔ وہ اس کے استقبال کے لیے پوری طرح سے تازہ دم ہونا چاہتی تھیں۔

''سوچ رہی ہوں، اب تمہارا کمرہ چھوڑ کے اپنے کمرے میں منتقل ہو جاؤں۔'' جب وہ باتھ روم سے وضو کر کے نکلیں تو یونہی کہنے لگیں۔ ''کیوں؟''

تم ڈسٹرب ہوتی ہو گی نا بیٹے!'' وہ گیلی آستین نیچے کر رہی تھیں۔

وہ بے اختیار ہنس دی۔ ''چھ ماہ بعد خیال آیا کہ میں ڈسٹرب ہوتی ہوں گی۔ صاف صاف کہیں، آپ کی فیورٹ بیٹی آ رہی ہے اور آپ اس کے کمرے میں شفٹ ہونا چاہتی ہیں۔'' مالا جانتی تھی ماہی کے سامنے، معید اور وہ بہت پیچھے چلے جائیں گے۔ وہ ایسی ہی تھی۔ آئے گی اور چھا جائے گی۔

وہ محض مسکرا دیں۔ پھر سفید دوپٹہ سر پہ لپیٹا اور بیڈ کے کنارے پہ بیٹھیں۔ دوپٹہ کانوں کے پیچھے اڑسا۔ چند سفید بال باہر جھانکنے لگے۔ مالا نے ان کے بالوں کی سفیدی کو دیکھتے ہوئے ''اوہ'' میں لب گول کیے۔

''ماہی کے آنے سے پہلے، آپ کا ہیئر ڈائی لگا دوں گی۔ ورنہ وہ بہت بولے گی۔'' کانوں کو باری باری چھوا۔ ماں نے ہلکے سے ہنس کے سر جھٹک دیا۔

ان کو نماز پڑھتے چھوڑ کے وہ باہر چلی گئی۔ باہر ابھی اندھیرا تھا۔ جب وہ واپس آئی تو ہاتھ میں موتیے کے پھولوں کی ٹوکری تھی۔ ماں نے سلام پھیرا اور چہرہ اٹھا کے دیکھا۔ ٹیبل لیمپ کی روشنی میں ان کی سبز آنکھوں کے گرد جھریاں صاف دکھائی دیتی تھیں۔

''ماہی دوہا پہنچ گئی ہو گی۔'' وہ ساتھ ساتھ زیر لب اذکار پڑھ رہی تھیں۔

''جی۔ کہہ رہی تھی بہت کوشش کی کہ، کہیں اور سے اچھی فلائٹ مل جائے لیکن اس کا ناپسندیدہ ائیر پورٹ، پھر سے آ گیا درمیان میں۔'' مالا نے موتیے کے پھول ان کی سائیڈ ٹیبل پہ رکھے۔

''میں اب سوؤں گی بیٹے!'' وہ سیدھی ہونے لگی تھی جب ماں نے اپنا بھاری جھریوں زدہ ہاتھ اس کے ہاتھ پہ رکھا۔ اس نے مسکرا کے انہیں دیکھا۔ وہ بھی مسکرائیں۔ کچھ کہنے کے لیے لب کھولے لیکن پھر خاموش رہیں اور اپنا ہاتھ ہٹا دیا۔ نہ جانے کیا کہنے لگی تھیں۔ یونہی اپنا خواب یاد آیا۔

''آپ آرام کریں۔ میں آج آپ کے نئے کپڑے نکلواتی ہوں۔ ماہی کو اپنی ماں کی ٹپ ٹاپ پسند ہے۔ ہیئر ڈائی بھی کیجئے گا اور میک اپ بھی۔''

وہ الماری کی طرف آئی اور ان کے کپڑے دیکھنے لگی۔ جب سے ماں بیمار ہوئی تھیں معید اور مالا کی ساری توجہ ان کی صحت پہ تھی۔ خوراک، دوائیں، ان کے نئے کپڑے بہت بنوائے تھے۔ خیر، ماہی آرہی ہے نا! وہی کرے گی یہ کام۔

''ماں! آپ کے لیے چائے بنوادوں؟''

''میں سوؤں گی بیٹے!'' انہوں نے بازو ماتھے پہ رکھے رکھے کہا۔ وہ نیند میں جارہی تھیں۔ ساتھ ہی وہ زیرلب کوئی اذکار پڑھ رہی تھیں۔ مالا جانتی تھی وہ ماہی کے آنے سے پہلے کا وقت، جلد از جلد کاٹنا چاہتی تھیں۔ وہ سوگئیں اور ان کی سانس کی آواز کمرے میں گونجنے لگی تو وہ باہر چلی آئی۔ باہر ایک نئی صبح طلوع ہورہی تھی۔ آج یکم نومبر تھی۔ اور ہر چیز ٹھیک تھی۔ اس کے سارے خوف' سارے واہمے پیچھے رہ گئے تھے۔

اس کی زندگی کی کہانی بالآخر مکمل تھی۔ کیا تھا جو اس میں ایک مرد نہیں تھا۔ اسے مرد نہیں چاہیے تھا۔ اسے اپنی ماں چاہیے تھی۔

وہ موتیے کے پودے تک آئی اور چند پھول اتارنے لگی۔ ماہی کو بھی پھول پسند تھے۔ سوچا لاؤنج میں بھی رکھ دے گی تاکہ اس کے آتے ہی سارے گھر سے خوشبو محسوس ہو۔ ماہی کی عادت تھی کہ گھر میں داخل ہوتے ہی ہر جگہ نقص نکالے گی۔ فلاں چیز ٹھیک نہیں، یہ جگہ یہ نہیں، ہونہہ! ماہی نہیں تھی تو کسی نے گھر کا خیال نہیں رکھا۔ اور واقعی وہ آتے ہی گھر کا سارا بگڑا حلیہ درست کردیا کرتی تھی۔

پھول توڑتے ہوئے اپنے خواب کے بارے میں سوچنے لگی۔ ابھی کیا دیکھا تھا اس نے؟

مالا نے آنکھیں بند کیں۔ ایک منظر نظروں کے سامنے بنتا گیا۔

وہ اپنے کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ سامنے ماں وہیل چیئر پہ بیٹھی ہیں۔ اس کے کمرے کی چوکھٹ پہ، پیچھے کوئی چھوٹے قد کی عورت، وہیل چیئر تھامے ہوئے ہے۔ وہ ماں کو دیکھ کے مسکراتی ہے۔ وہ بھی چہرہ اٹھا کے اسے دیکھتی ہیں۔ پھر مسکراتی ہیں۔

وہ ان کے قدموں میں بیٹھ کے ان کے ہاتھ تھام لیتی ہے۔

''آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں؟ میں آپ کو چھوڑ کے چلی گئی تھی ایک دفعہ۔''

''نہیں بیٹے! میں نے تو ساری باتیں بھلادی ہیں۔ میں ناراض نہیں ہوں۔'' وہ بھی مسکراتی ہیں۔ ان کی آنکھیں بہت چھوٹی ہیں۔ حقیقت سے بھی چھوٹی۔ پھر وہ آگے بڑھتی ہے اور ان سے گلے ملتی ہے۔ اس کے سیاہ اسکارف کی نرمی اسے محسوس ہوتی ہے...

پھول توڑتا اس کا ہاتھ رک گیا۔ سیاہ اسکارف؟ وہ چونکی۔ ماں نے خواب میں اسکارف لے رکھا تھا۔ کالا سیاہ اسکارف جس سے صرف چہرہ نظر آتا تھا۔ ایسا اسکارف انہوں نے پہلے کب لیا تھا؟

ہاں۔ اسے یاد آیا۔

احرام کا سیاہ اسکارف۔ جب وہ حج کرنے گئی تھیں۔

اللہ کے گھر۔

کسی کانٹے سے انگلی ٹکرائی۔ خون کی بوند ٹپکی۔ پھول ہاتھ سے گرے۔ وہ ایک دم اندر بھاگی۔

''ماں... ماں...''

وہ دیوانہ وار بھاگتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ اسی طرح کروٹ لیے سورہی تھیں۔ وہ ان کے سرہانے جھکی اور تیزی سے ان کو جھنجوڑا۔

''ماں۔ ماں...''

ان کی رنگت سفید تھی۔ اور بند ہوئی آنکھیں بہت چھوٹی لگ رہی تھیں۔

مالانے کپکپاتے ہاتھ سے ان کا ماتھا چھوا۔
وہ ٹھنڈا تھا۔ برف جیسا ٹھنڈا۔
"ماں۔ میری ماں۔" وہ چیختے ہوئے ان کا چہرہ تھپتھپا رہی تھی۔
وہاں کوئی آواز نہیں تھی۔ صرف سناٹا تھا۔
اور سفید چہرے پہ ایک پرسکون سی مسکراہٹ تھی۔ ایک آواز تھی جو ہر طرف سنائی دے رہی تھی۔
"آج میں فجر کے بعد سو جاؤں گی۔"
"میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔"
"میں نے ساری باتیں بھلا دی ہیں۔"
ہر چیز سلوموشن فلم کی طرح ہو رہی تھی۔ ایسی فلم جس میں کوئی آواز نہیں ہوتی۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی پیچھے ہٹتی گئی۔ یہاں تک کہ اس کی کمر کھڑکی سے جا لگی۔
اس نے بھاگتے ہوئے معید کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ بخت بی اونچا اونچا رو رہی تھیں۔
معید ان کی کلائی پہ ہاتھ رکھے ہوئے تھا۔ پھر گردن پہ۔ وہ کچھ پکار پکار کے کہہ رہا تھا۔
اسے صرف لب ہلتے دکھائی دے رہے تھے۔ معید ان کی آنکھوں پہ ہاتھ پھیر کے انہیں بند کر رہا تھا۔
"آج میں فجر کے بعد سو جاؤں گی۔"
کوئی آواز نہیں تھی۔ کوئی صدا نہیں تھی۔ معید زمین پہ بیٹھے اپنا سر بیڈ سے لگائے رو رہا تھا۔ بخت بی روتے ہوئے ان کے چہرے کے گرد کپڑا لپیٹ رہی تھی۔
اور وہ ساکت سی کھڑکی سے کمر ٹکائے کھڑی تھی۔ جامد۔ مبہوت۔ لب کپکپا رہے تھے۔ آنکھوں سے بے آواز آنسو گر رہے تھے۔ لیکن آنکھیں اسی طرح شاک کے عالم میں کھلی تھیں۔
"آج میں فجر کے بعد سو جاؤں گی۔"
"میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔"
☆☆☆
ماہ بینہ، حمد انٹرنیشنل ایئرپورٹ (دوہا) کے ویٹنگ لاؤنج میں بیٹھی بار بار گھڑی دیکھ رہی تھی۔ اس نے لمبا کوٹ پہن رکھا تھا اور اسکارف سر پہ لپیٹے ہوئے تھی۔ اسے آج کچھ زیادہ ہی ٹھنڈ لگ رہی تھی۔ ساتھ اسٹرولر میں لیٹی ننھی حور خاموشی سے سو رہی تھی۔
بالآخر گیٹ کھلنے کی اناؤنسمنٹ سنائی دینے لگی۔ وہ مسکرادی اور کاٹ میں لیٹی سوتی ہوئی بچی کو دیکھا۔
"حور! بس پانچ گھنٹے بعد ہم لاہور میں ہوں گے۔ ماں کے پاس۔"
وہ اسٹرولر دھکیلتے ہوئے اٹھی ہی تھی کہ اس کا فون بجا۔ اس نے نکال کے دیکھا۔ واٹس ایپ پہ سلیم کی کال آرہی تھی۔ اُف۔ جب سے اس نے تسلیم سے کہا تھا کہ اسے گھر میں ہونے والی ہر بات کی اطلاع کرتا رہے اس کی ہر روز ہی کال آجاتی تھی۔ اس نے عجلت میں فون کان سے لگایا۔
"کتنی دفعہ بتاؤں تمہاری شرٹیں لا رہی ہوں۔"
"ماہی باجی... ماہی باجی!"
ماہی کو پہلے تو سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ وہ رو رہا ہے یا ہنس رہا ہے۔
"کیا ہوا سلیم؟ اونچا بولو۔" ارد گرد اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی۔ اس نے دوسرے کان پہ ہاتھ رکھ کے سننا چاہا۔ وہ نہیں راستے کے بیچ کھڑی تھی۔
"ماہی باجی آپ کہاں ہیں؟" وہ اونچا اونچا رو رہا تھا۔ اس کا دل بری طرح سے دھڑکا۔
"کیا ہوا ہے؟ بولو نا۔"
"بڑی بی بی فوت ہوگئی ہیں۔"
اس کے کانوں میں سلیم کی آواز گونجی۔ اسے سمجھ میں نہیں آیا۔ یہ کون تھا؟ بڑی بی بی کون تھی؟
"کیا مذاق ہے سلیم؟ کیا کہہ رہے ہو؟" اس کو اپنی آواز چلاتی ہوئی سنائی دی۔
وہ کون تھی؟ اسٹرولر میں لیٹی بچی کون تھی؟
"ان کا ہارٹ فیل ہوا ہے۔ سوتے میں۔" وہ

روتے ہوئے بتارہا تھا۔
"ماہی باجی! بڑی بی بی فوت ہوگئی ہیں۔"
سینے میں کچھ زور سے آکے لگا۔ جیسے دور سے اڑتا ہوا کوئی تیر ہو۔ ماہی کو لگا اس کے سینے سے خون ابلنے لگا ہے۔
"بکواس کررہے ہوتم۔ یہ مذاق ہے کوئی ہاں؟ میں ائیرپورٹ پہ ہوں۔ ائیرپورٹ پہ۔" وہ چلائی لیکن اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔
"ماہی باجی! بڑی بی بی چلی گئیں۔"
"سلیم! اس کو کیوں کال کررہے ہو؟ ڈفر۔ جاہل۔" پیچھے سے معید کی چلاتی آواز آئی۔ کسی نے فون کھینچا۔
"ماہی!"
"معید... معید..." وہ ایک ہاتھ سینے پہ رکھے اونچا اونچا چلا رہی تھی۔ اردگرد لوگ اکٹھے ہورہے تھے۔
"معید! مجھے سچ بتاؤ۔ میری ماں ٹھیک ہے؟"
"ماہی!" وہ بھی ایک دم بچوں کی طرح رونے لگا۔
"ماہی! تم کیوں نہیں آئیں؟"
"معید! میری ماں کہاں ہے؟" وہ چیخی۔
"ماں چلی گئیں۔"
فون پھسل کے نیچے جاگرا۔ اس نے دونوں ہاتھ کانوں پہ رکھ لیے۔ چہرہ آنسوؤں سے یوں تر تھا جیسے بارش سے گیلا ہو۔ وہ اونچا اونچا رو رہی تھی۔
"میری ماں... میری ماں..."
لوگ بھاگتے ہوئے اس کی طرف آرہے تھے۔ اسے دھندلی آنکھوں اور اپنی چیخوں کے درمیان میں کہیں سیکیورٹی گارڈ نظر آیا۔ کسی نے پانی کی بوتل بڑھائی۔ ایک بچے کی رونے کی آواز۔
"یہ بچہ کس کا ہے؟"
"میم! آپ نے بورڈنگ کرنی ہے؟ گیٹ کلوز ہونے والا ہے۔"
مگر وہ کوٹ والی لڑکی زمین پہ بیٹھے اونچا اونچا رو رہی تھی۔
"میری ماں نے میرا انتظار نہیں کیا۔ کیوں؟ کیوں؟" وہ اوپر دیکھتے ہوئے روتے ہوئے کسی سے پوچھ رہی تھی۔
بچی کے حلق پھاڑ کے رونے کی آواز بھی ساتھ شامل ہوگئی تھی۔ کوئی اسے کندھے سے جھنجھوڑ رہا تھا۔
"کیوں؟ کیوں؟" وہ گردن اٹھائے اوپر کسی سے پوچھ رہی تھی۔
"میں آرہی تھی۔ میں راستے میں تھی۔ کیوں میری ماں چلی گئی؟ کیوں؟"
کسی نے اس کا کندھا جھنجھوڑا۔ ماہی نے سر اٹھا کے اپنے اردگرد دیکھا۔ بھانت بھانت کی بولیاں۔ مختلف ملکوں کے لوگ۔ کسی نے اسٹرولر اس کی طرف بڑھایا۔
ہر روتا بچہ ماں کو دیا جاتا ہے۔ کیونکہ اسے صرف اس کی ماں سنبھال سکتی ہے۔
وہ کس کے پاس جائے گی؟

☆☆☆

خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ ہمسائیوں سے لوگ آنے لگے تھے۔ کچھ لوگ لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ کچھ عورتیں اندر مالا کے کمرے میں۔ کسی نے ششدر سی مالا کو ماں کے ساتھ کرسی پہ بٹھا دیا تھا۔
وہ بس گم صم تھی۔ اس کے کھلے بال چہرے کے دائیں بائیں گررہے تھے۔ وہ گردن ترچھی کیے ماں کے سوتے وجود کو دیکھ رہی تھی۔ آنسو آنکھوں سے گر رہے تھے۔ لیکن آواز نہیں نکل رہی تھی۔
"بیٹا! رولو، اونچا اونچا رولو، اندر سے غم نکالو۔" کسی رشتے دار خاتون نے کہا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اونچا رونے کے لیے آواز چاہیے ہوتی ہے۔ آج ساری آوازیں دم توڑ گئی تھیں۔
کوئی اس کے ساتھ آکے بیٹھا۔ اس نے چہرہ اٹھا کے دیکھا۔ پھر سوچنے کی کوشش کی کہ وہ کون تھیں۔ ہاں۔ اسے یاد آیا۔ اس پٹھان بچے کی ماں

انہی کے گھر کام کرتی تھی۔ یہ ان کے ہمسائے سے آئی تھیں۔ ڈاکٹر سلیمہ، ادھیڑ عمر خاتون، فٹ اور اسمارٹ سی، باب کٹ بال، وہ دنیا گھومتی تھیں۔ سوشل ورک کرتی تھیں۔ ان کے بچے ڈاکٹر تھے اور شادی شدہ تھے۔ ماں کی دوست تھیں۔ پہلے بھی آتی تھیں۔

وہ اس کے ساتھ بیٹھ کے افسوس کرنے لگیں۔ اس نے چہرہ پھیر لیا۔ اس وقت اسے کچھ نہیں سننا تھا۔

''ماہی سے بات ہوگئی ہے۔ اس نے فلائٹ لے لی ہے۔ وہ جنازے سے پہلے پہنچ جائے گی۔''

معید نے اندر داخل ہوتے ہوئے بتایا۔ اس کی آنکھیں سرخ اور گیلی تھیں اور وہ نڈھال لگتا تھا۔ مالا نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا اور سر اثبات میں ہلا دیا۔

وہ ابھی تک نائٹ سوٹ پہنے ہوئے تھی۔ کسی نے اسے دوپٹہ دیا جو اس نے میکانکی انداز میں کندھوں پہ لپیٹ لیا تھا۔ نیچے سے بال دوپٹے میں چھپ گئے۔ چہرے کے اطراف میں اسی طرح الجھے ہوئے سے گر رہے تھے۔

بخت بی اندر آئی اور ایک دفعہ پھر ہائے میری باجی کہہ کے ماں کا چہرہ دیکھ کے اونچا اونچا رونے لگی۔

''کوئی میری ماں کی موت پہ بین نہیں ڈالے گا۔'' معید ایک دم اونچی آواز میں غرایا۔ بخت بی کو چپ لگ گئی۔

''میری ماں نے ساری عمر اللہ کی نافرمانی نہیں کی۔ آپ کے بین سے ان کو تکلیف ہوگی۔ میں بتائے دے رہا ہوں۔'' اس نے سب خواتین کو دیکھ کے انگلی اٹھا کے تنبیہ کی۔ ''کوئی ماتم نہیں کرے گا نہ بین ڈالے گا۔ جس نے رونا ہے (آواز کانپی) ہلکی آواز میں روئے۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ کر کے گر رہے تھے۔ یہ کہہ کے اس نے کرسی کھینچی اور ساتھ بیٹھ گیا۔ ایک دم خاموشی چھا گئی۔ پھر کسی نے ہمت کر کے اسے کہا۔

''بیٹا! باہر قناتوں کا انتظام کروایا ہے۔''

''مجھے نہیں پتا۔'' معید نے ہاتھ جھلا کے سر جھٹکا۔ اور جھک کے ماں کا ٹھنڈا ہاتھ تھام لیا۔ پھر اس پہ اپنا چہرہ رکھا اور بے آواز رونے لگا۔

وہ آہستہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ کسی نے اسے پکارا لیکن وہ نہیں رکی۔ ننگے پیروں سے چلتی کچن تک آئی۔

''میں فجر کے بعد سوؤں گی۔''

''میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔''

کچن میں خاموشی تھی۔ لاؤنج والی خواتین بھی اندر جا چکی تھیں۔ ابھی صبح کے سات بجے تھے۔ ہر گزرتی گھڑی کے ساتھ رش بڑھتا جائے گا۔ اسے کچھ دیر کے لیے تنہائی چاہیے تھی۔

وہ خالی کچن کاؤنٹر پہ آ بیٹھی، چپ، گم صم۔ آنسو اسی طرح بہہ رہے تھے۔ اس نے چاہا کہ کھل کے رو لے۔ اونچا اونچا، بھلے بین ہی ہو، ماتم ہی ہو، لیکن آواز نہیں نکلی۔ لب کھولے ہی تھے کہ

''یہ جج اے شاک' کشمالہ!'' ہیل کی ٹک ٹک کی آواز پہ وہ چونکی۔ چہرہ اٹھا کے دیکھا۔ ڈاکٹر سلیمہ وہیں چلی آرہی تھیں۔ ان کے باب کٹ بھورے بال بلو ڈرائی سے سیٹ تھے۔ کلف لگا دوپٹہ سر پہ تھا۔

مالا نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ وہ اس وقت اکیلے رہنا چاہتی تھی۔

''میں کچھ دیر میں جانے والی ہوں۔ میری نیویارک کی فلائٹ ہے۔'' انہوں نے اپنی ایپ واچ دیکھی۔ پھر اس کو دیکھا جو لاتعلق سی کھڑی تھی۔

''تم ابھی شاک میں ہو۔ یہ غم کی پہلی اسٹیج ہوتی ہے۔''

''مجھے غم کی ساری اسٹیجز معلوم ہیں' آنٹی۔ ساری اسٹیجز ختم ہوگئی ہیں۔'' اس نے کرب سے آنکھیں بند کیں۔ ''میری ماں کے ساتھ سب ختم ہوگیا ہے۔''

''کیا واقعی؟'' وہ اس کے عین سامنے آ

رکیں۔ کمان جیسے ابرو اٹھا کے پوچھا۔
کشمالہ نے بھیگی آنکھیں کھولیں۔

''آج میری اور میری ماں کی کہانی ختم ہوگئی۔'' گرم گرم پانی آنکھوں سے گرنے لگا۔

''کشمالہ!''

''میں وہیں آ رہی ہوں۔ آپ بیٹھیں۔'' اس نے رخ پھیر لیا۔ وہ یہاں اکیلے رہنا چاہتی تھی۔ یہ پیچھے کیوں آ گئی تھیں؟

''میری ماں کی ڈیتھ کو چالیس سال ہو گئے ہیں۔ تب میں شاید اکیس برس کی تھی...''

''آپ کو پانی دوں؟'' وہ چہرہ موڑ کے گلاس الٹ پلٹ کرنے لگی۔

شاید پانی لبوں سے لگے تو وہ خاموش ہو جائیں۔ اسے خاموشی چاہیے تھی۔

''میں اس وقت تم سے چھوٹی تھی...'' وہ کاؤنٹر کے ساتھ کہنی رکھ کے کھڑی کہہ رہی تھیں۔ اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ وہ اپنی ماں کی موت کا بتا رہی تھیں۔ کینسر ہوا تھا انہیں۔ مالا ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اسے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اکیلے رہنا چاہتی تھی۔ ہر چیز سے دور۔ فرار۔ یہی اس کا ڈیفنس میکنزم تھا۔

''میری ماں کی موت کے بعد میری ایک سرجری تھی۔ میرے ہارٹ میں ایشو تھا۔''

''میں ذرا کسی کو کال کر لوں۔ قناتوں کے لیے...'' اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ موبائل کہاں تھا۔ اُف وہ انہیں یہاں سے کیسے ہٹائے۔

''سرجری سے پہلے جب انہوں نے مجھے اوٹی میں لٹایا تو...''

جیب میں۔ موبائل نائٹ سوٹ کی جیب میں تھا۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے موبائل نکالا اور کسی کو کال ملانے لگی۔ کس کو۔ اسے خود نہیں معلوم تھا۔ بس وہ چاہتی تھی کہ وہ خاموش ہو جائیں۔ شاید انہیں احساس ہو جائے کہ وہ نہیں سن رہی۔

وہ ابھی تک کچھ کہہ رہی تھی۔ مالا کپکپاتی انگلیوں سے نمبر ملانے لگی۔ اسکرین پہ آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

دوسری طرف رنگ ٹون جا رہی تھی۔ ڈاکٹر سلیمہ اور رنگ ٹون کی آواز آپس میں گڈمڈ ہونے لگی۔

''اس روز مجھے ایک راز معلوم ہوا۔''

کسی خواب کی سی کیفیت میں کشمالہ نے چہرہ اٹھایا۔ فون والا ہاتھ نیچے گر گیا۔ رنگ ٹون سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ بس ان کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ حیران، عجیب آنکھوں سے۔

وہ کچھ کہہ رہی تھیں۔ کچھ جو اسے سننا تھا۔

''کیا؟''

وہ دو قدم قریب آئیں اور مسکرائیں۔ ان کے چہرے پہ مدھم سی جھریاں پڑ گئیں۔

''ہر وہ بچہ جس کی ماں مر جاتی ہے، اس کو ایک راز تھمایا جاتا ہے۔ ایک ایسا راز جس سے وہ لوگ واقف نہیں ہیں جن کی مائیں زندہ ہیں۔''

وہ ساکت سی انہیں دیکھ رہی تھی۔ آنسو رک گئے تھے۔

''کچھ بچے اس راز پہ کان لپیٹ لیتے ہیں۔ اور کچھ... کچھ اسے سنتے ہیں۔ غور سے....''

وہ بنا پلک جھپکے ان کو دیکھ رہی تھی۔

''یہ راز ان بہت سے لوگوں کو معلوم ہے۔ جن کی مائیں ان کی زندگیوں سے چلی گئی ہیں، لیکن ان بچوں نے دنیا والوں کے ساتھ ایک بہت بڑی زیادتی کی۔ انہوں نے اس راز کو خود تک روک لیا۔'' انہوں نے نرمی سے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ ''میں نہیں روکنا چاہتی۔ چالیس سال پہلے میری ماں مری تھی۔ آج تمہاری ماں مری ہے۔ اس لیے میں تمہیں ایک راز بتانا چاہتی ہوں۔''

''اس سے کیا فرق پڑے گا؟ میری اور میری ماں کی کہانی تو ختم ہوگئی۔''

''اور اگر میں تم سے یہ کہوں کشمالہ...'' ان کی آواز مدھم ہوئی اور آنکھیں بھیگ گئیں۔

"کہ تمہاری اور تمہاری ماں کی اصل کہانی اب شروع ہوئی ہے.... تو؟"

وہ جہاں تھی ساکت رہ گئی۔ ساری دنیا تھم گئی۔

"کیسے؟"

☆☆☆

قریباً گھنٹے بھر بعد کشمالہ مبین، اپنے کمرے میں واپس داخل ہوئی تو اس کا چہرہ وہ نہیں تھا۔ کچھ تھا جو وہاں بدل گیا تھا۔ کچھ خواتین خود ہی ماں کی میت کو لاؤنج میں، منتقل کروا رہی تھیں کہ اب وہاں رش بڑھ گیا تھا۔ ایسے میں وہ الماری تک آئی اور اندر سے ایک فیروزی لباس نکال کے بخت بی کی طرف بڑھایا۔

"استری کر دیں۔" اس کا چہرہ اور آنکھیں خشک تھیں۔ بخت بی جو خود رو رو کے نڈھال سی بیٹھی تھیں، چونک کے اسے دیکھنے لگیں۔ لیکن کشمالہ کے چہرے پہ صرف سنجیدگی تھی۔ انہوں نے ہچکچاتے ہوئے سوٹ تھام لیا۔

"اپنی ساری بیٹیوں کو کال کریں۔ ان سے کہیں کہ فوراً یہاں پہنچیں۔ جنازے اور اس کے بعد کے سارے معاملات ان کو سنبھالنے ہوں گے۔" وہ سنجیدگی سے ہدایات دے رہی تھی۔

"بانو سے کہنا لازمی آئے۔ بانو کو بچوں کا تجربہ ہے۔ ماہی کی بچی کو سنبھالنا ہوگا، اور سلیم سے کہیں مہمانوں کے لیے چائے بنائے اور سب سے ناشتے کا پوچھے۔"

وہ تاکید کر کے آگے بڑھ گئی۔ بخت بی عجیب نظروں سے اسے جاتے دیکھ رہی تھیں۔

باتھ روم میں آتے ہی اسے زور کا چکر آیا۔ اس نے دیوار کو تھام لیا۔ پھر آنکھیں بند کیں۔ بہت سے آنسو رو کے۔

(تمہاری اور تمہاری ماں کی کہانی اب شروع ہوئی ہے۔)

اس نے اپنے زرد پڑتے چہرے پہ بہت سا پانی ڈالا۔ جلتے انگاروں کو ٹھنڈک ملی۔

میری اور میری ماں کی کہانی اب شروع ہوئی ہے۔ وہ آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے بڑبڑائی۔

تھوڑی دیر بعد وہ تیار نظر آ رہی تھی۔ گیلے بالوں کو اونچی پونی میں باندھا۔ دوپٹہ سر پہ لیا۔ اور پیروں میں سیاہ کھسے پہنے۔ اسے اپنی ماں کے جنازے کے انتظامات کرنے تھے۔

کچھ دیر بعد وہ چند افراد کے ساتھ کھڑی ہدایات دیتی نظر آ رہی تھی۔

"ہاں مجھے معلوم ہے اب گرمی نہیں ہے۔ یہ نومبر ہے لیکن جب لوگ زیادہ ہوں گے تو گرمی ہو جائے گی، جاوید!" وہ ڈپٹ کے کہہ رہی تھی۔ "ایک پنکھا مجھے وہاں چاہیے۔ ایک اس طرف۔" انگلی اٹھا اٹھا کے وہ مختلف جگہوں کی نشاندہی کر رہی تھی۔ لان میں کرسیاں لگوائی جا رہی تھیں۔ سڑک کے باہر گاڑیاں کھڑی تھیں۔ چند لوگ قناتیں نصب کر رہے تھے۔

"مجھے کفن کا کپڑا چاہیے۔ ابھی۔" وہ اب موبائل کان سے لگائے کسی سے کہہ رہی تھی۔ "نہیں غسل کا مسئلہ نہیں ہے۔ مولوی صاحب کی بیوی آ جائے گی۔ میں اور میری بہن اس کے ساتھ مل کے غسل دیں گے۔"

اس کی آنکھیں خشک تھیں اور انداز مصروف۔

☆☆☆

صبح کے دس بجے تھے جب ناموں کی کار گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ وہ اسلام آباد سے پہنچتے ہی پہلے ایئرپورٹ گئے تھے، اور اب واپس آئے تو لان خواتین سے بھرا ہوا تھا۔

پچھلی سیٹ کا دروازہ کھلا اور سیاہ کوٹ والی لڑکی باہر نکلی۔ اس کا ریشمی اسکارف ڈھلک کے پیچھے جا گرا تھا۔ الجھے الجھے بال، گیلا چہرہ، اس کی نظریں لان تک گئیں اور پلٹنا بھول گئیں۔

میت اب لان میں رکھی تھی اور اس کے گرد عورتیں بیٹھی تھیں۔

ماہی نے بے اختیار دل پہ ہاتھ رکھ لیا۔ اس

کے رونے کی بلند آواز نے سب کی توجہ اس کی جانب مبذول کردی۔ کچھ عورتیں اس کی طرف بھاگیں۔

"ماہی! تیری ماں نے تیرا انتظار نہیں کیا..."

"ماہی بیٹا! تو نے بہت دیر کردی...."

"ہائے حورِ جہاں کی بدقسمت بیٹی...."

"پردیس والوں کے مسئلے...."

"شکر ہے میت کے منہ پہ پہنچ گئی۔"

ہر طرف سے آوازیں تھیں۔ افسوس تھے اور وہ اس سب سے بے نیاز بلند آواز سے روئے جارہی تھی۔

عورتیں اسے سہارا دے کر میت کی چارپائی تک لے آئیں۔ کوئی اسے کہہ رہا تھا کہ ماں کا چہرہ دیکھو۔ دیکھو کیسی جنتی اور پرنور لگ رہی ہیں۔

لیکن ماہ بینہ اپنی ماں کا چہرہ دیکھنے نہیں آئی تھی۔

وہ اپنی ماں کے پیروں تک گئی اور دونوں ہاتھوں سے کفن میں لپٹے پیر تھام لیے۔

"ماں میں راستے میں تھی۔ ماں مجھ سے ناراض نہ ہونا۔" وہ ان پیروں پہ سر رکھے بلند آواز میں روئے جارہی تھی۔ "میری ماں مجھ سے ناراض نہ ہونا۔ میں بہت مجبور تھی۔ ماں مجھے معاف کردیں۔ مجھے معاف کردیں۔"

اس کی حالت دیکھ کے ہر کوئی رو رہا تھا۔ مرد حضرات کی بھی آنکھیں اشک بار تھیں۔ اگر کوئی نہیں رو رہا تھا تو وہ کشمالہ بیبن تھی۔ جہاں سب ماہی کی طرف متوجہ تھے وہاں کشمالہ، بانو کے ساتھ کار میں رکھا کاٹ نکال رہی تھی۔ اس کے اندر لیٹی بچی اپنی سبز آنکھیں، جھپک جھپک کے دنیا کو دیکھ رہی تھی۔ حیران اور خوبصورت آنکھیں۔

کشمالہ نے نرمی سے اس کو اپنے دونوں بازوؤں میں اٹھایا اور مسکرا کے اس کا چہرہ دیکھا۔

"میری اور میری ماں کی کہانی اب شروع ہوئی ہے۔"

پھر اس نے بچی کو اپنے کندھے سے لگالیا۔

"اس کو ٹھنڈ لگ جائے گی۔ اسے اندر ہیٹر کے پاس لے کر بیٹھ جاؤ۔" اس نے بچی، بانو کو تھمائی۔ بانو نے سمجھ داری سے بچی اٹھالی اور اندر لے گئی۔

پھر وہ رش میں سے راستہ بناتے ہوئے ماہی کی طرف آئی۔ وہ ماں کے قدموں میں بیٹھی، اب رو رو کے نڈھال ہوچکی تھی۔ مالا نے اس کا سر اپنے کندھے سے لگالیا۔

"مالا! ماں نے میرا انتظار کیوں نہیں کیا؟" وہ بچوں کی طرح بلک بلک کے رو رہی تھی۔

وہ کچھ نہیں بولی۔ بے آواز آنسو اس کی آنکھوں سے بھی گرنے لگے۔

"ماموں آگئے ہیں۔ ماہی آگئی ہے۔" کسی عورت نے سمجھ داری سے اس کے قریب سرگوشی کی۔ "سب آگئے ہیں۔ اب جنازے میں دیر نہ کرنا۔ میت کو تکلیف ہوتی ہے۔"

مالا نے اثبات میں سر ہلادیا۔ سب آگئے تھے۔ اب دیر نہیں ہوگی۔

اور اسی لمحے اس کے ذہن میں جھماکہ سا ہوا۔

ایک شخصیت تھی جو ابھی تک نہیں آئی تھی۔ وہ جو اپنے پسندیدہ جنازوں پہ، نیا لباس اور نیا زیور پہن کے آتی تھی۔

وہ بالکل ساکت رہ گئی۔

☆☆☆

کبیرہ بیگم اس صبح دیر سے جاگی تھیں۔ فون رات سے بند تھا۔ ناشتے کی میز پہ ملازم نے ڈرتے ڈرتے اطلاع دی کہ بہت سے لوگ فون کرچکے ہیں۔ کسی کا انتقال ہوگیا ہے۔

"کون مرگیا ہے؟"

انہوں نے بے زاری سے فون آن کیا۔ بہت سی میسیج ٹونز ایک ساتھ بجیں۔ اگلے ہی لمحے کبیرہ سادان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

کرسی دھکیلتی وہ ایک دم کھڑی ہوئیں۔

"آفس فون کر کے آج کی ساری میٹنگز کینسل کردو۔ میں کسی کی کال تک اٹینڈ نہیں کروں

گی۔"ملازمہ کو ہدایات دیتی وہ اپنے کمرے کی طرف مڑ گئیں۔

"آج مجھے ایک جنازہ اٹینڈ کرنا ہے۔"

کبیرہ سادات کو تیاری میں کافی دیر لگی تھی۔ بین گلے اور پوری آستین والا سیاہ لباس، بہت خوب صورت اور باوقار تھا۔ کف پہ سیاہ موتیوں کا کام کیا گیا تھا۔ وہ اپنے خوب صورت چہرے پہ ایک مطمئن نظر ڈال کے لائنر لگانے لگیں۔ پھر لبوں کو لپ اسٹک سے گلابی کیا۔

بالآخر انہوں نے اپنا جیولری باکس کھولا۔ نئے ڈائمنڈز، نئے پرلز۔۔۔ ہر شے جو انہوں نے ماہی کے بچے کی موت کے لیے سنبھال رکھی تھی' آج کام آنی تھی۔

آج ان کی سب سے بڑی دشمن کی موت واقع ہوئی تھی۔ آج عالیان کی موت کا بدلہ پورا ہوا تھا۔

"قسمت۔" وہ اپنا عکس دیکھ کے مسکرائیں۔

"جیسے میں اپنے عالیان کو ایک لمبے عرصے تک نہیں دیکھ سکی تھی۔ ویسے ہی تم بھی اپنی نواسی کو نہیں دیکھ سکیں۔"

وہ مسکراتے ہوئے ایک ایک انگلی میں انگوٹھیاں پہننے لگیں۔ پھر موتیوں کی ایک لڑی گردن میں ڈالی۔ کانوں میں ننھے ٹاپس پہنے۔ وہ مکمل طور پہ تیار تھیں۔ چہرے پہ افسوس طاری کرنے کی ناکام کوشش کی۔ لیکن وہ ایک اچھی اداکارہ تھیں۔ وہ وہاں پہنچنے تک اپنے چہرے کو ہمدردی اور افسوس سے بھر لیں گی۔

انہیں جنازے سے عین آدھا گھنٹا پہلے پہنچنا تھا۔ یہ میت کے گھر والوں کے لیے، سب سے زیادہ تکلیف دہ وقت ہوتا ہے اور اس وقت انہیں سب سے زیادہ سکون ملے گا۔

انہوں نے عامل کے نمبر پہ کال ملائی اور فون کان سے لگا لیا۔

"مجھے ایک تعویذ چاہیے، ابھی۔ اسی وقت۔" وہ ہدایات دیتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

☆☆☆

کشمالہ اپنے کمرے میں فون کان سے لگائے دائیں سے بائیں ٹہل رہی تھی۔

"کھانا کم نہیں پڑنا چاہیے۔ اوکے؟" سختی سے کہہ کے اس نے فون رکھا۔ ماہی' جو بیڈ پہ بیٹھی اپنی بچی کو فیڈ کروا رہی تھی' بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔

"ہماری ماں مر گئی ہے اور تمہیں جنازے کی دیگوں کی پڑی ہے؟"

"مجھے اس لیے پڑی ہے کیونکہ ہماری ماں مر گئی ہے۔ وہ ہوتیں تو یہ انتظام خود کرتیں۔ انہوں نے ہمارے گھر سے بھی کسی کو کھانا کھلائے بغیر نہیں بھیجا۔" وہ اسی تیزی سے بولی تو ماہی خاموش ہو گئی۔

"عجیب رواج ہیں اس ملک کے۔ موت بھی ہمارے گھر ہوئی ہے۔ کھانا بھی ہم کھلائیں۔"

باہر سے گزرتی بخت بی نے رک کے ادھ کھلے دروازے کو دیکھا۔ اسے یاد تھا۔ بڑی بی بی کی بیماری کے دنوں میں مالا مہمانوں سے کتنا چڑتی تھی۔ ان کو صرف قہوہ اور بسکٹ دیتی تھی تاکہ وہ جلدی جائیں۔ لیکن آج یہ وہ مالا نہیں لگ رہی تھی۔ اسے کچھ ہو گیا تھا۔

"جنازے میں زیادہ دیر نہیں ہے۔" مالا اب کھڑکی کے سامنے کھڑی تھی۔ نظریں باہر جمع ہوتی عورتوں پہ تھیں۔

"جنازہ۔۔۔۔" ماہی کی آنکھیں پھر سے بھیگنے لگیں۔ اب تو رونے کی ہمت بھی نہیں رہی تھی۔

"ہاں ماہی! جنازہ ہوگا ابھی اور کبیرہ بیگم آنے کی تیاری کر رہی ہوں گی۔"

ماہی بری طرح چونکی۔ اس سارے میں اسے کبیرہ تائی بالکل ہی فراموش ہو گئی تھیں۔

"وہ بھی آئیں گی؟" وہ بے یقینی سے بولی۔ اور پھر اسے یاد آیا۔ "جیسے نورِ جہاں خالہ کی ڈیتھ پہ آئی تھیں۔ نیا جوڑا۔ نئی جیولری۔" اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔ "نہیں۔ اگر وہ آئیں تو میں ان کا منہ نوچ لوں گی۔ میں ان کو جان سے مار ڈالوں

گی۔ ان کے جادوؤں نے میری ماں کو مار دیا۔"
"کسی کے جادو نے ہماری ماں کو نہیں مارا' ماہی!" وہ سینے پہ بازو لپیٹے کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ فیروزی دوپٹے کے ہالے میں اس کا چہرہ پرسوچ لگ رہا تھا۔ "ان کا جادو ٹوٹ چکا تھا۔ ہماری دعا سے۔ ہماری پڑھائیوں سے۔ ٹیومر ختم ہوگیا تھا۔ ان کی موت ہارٹ فیل سے ہوئی ہے۔ وہ ایسے ہی لکھی تھی۔ یکم نومبر کو۔ وہ مکتوب تھی۔ ٹیومر ہوتا یا نہ ہوتا۔"

"مگر انہوں نے جادو کیے تھے۔ اپنی کوشش کی تھی۔ یہ ایسا جرم ہے جس کی ایف آئی آر بھی نہیں کروا سکتے ہم۔" اس نے گود میں لیٹی حور کو دیکھا۔ وہ اب سو چکی تھی۔ "ہم کتنے بے بس ہیں' مالا! ہم ان کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اب وہ ہمارے سامنے آئیں گی۔ روتا چہرہ بنا کے ہم سے ہماری ماں کا افسوس کریں گی۔ میری بیٹی کی مبارک باد دیں گی۔"

وہ تنفر سے کہہ رہی تھی جب مالا دھیرے سے بولی۔

"اور وہ تعویذ ڈالیں گی۔"
ماہی دھک سے رہ گئی۔ "تعویذ؟"
"جیسے نور جہاں خالہ کی ڈیتھ پہ انہوں نے کیا تھا۔" اس نے پلٹ کے ماہی کو دیکھا۔ اس کا چہرہ بے تاثر سا تھا۔ "بھول گئیں؟ میں نہیں بھولی۔"
"کفن میں تعویذ ڈالنے والا جادو۔" ماہی بڑبڑائی۔ "تا کہ مردے کے پیچھے اس کا سارا خاندان تباہ ہو جائے۔"
ماہی نے بے بسی سے سر دونوں ہاتھوں میں گرا لیا۔
"لیکن ہم کیا کریں؟ ان کو آنے سے روکا تو وہ سارے خاندان میں مشہور کر دیں گی۔ سب ہمیں برا بھلا کہیں گے۔ ہماری ماں کی تربیت پہ انگلی اٹھے گی۔ ہم ان کو اپنے گھر میں آنے سے نہیں روک سکتے۔"

"میں روکوں گی۔" کشمالہ نے موبائل نکالا اور اسکرین روشن کی۔ "وہ عورت میرے گھر میں داخل نہیں ہوگی۔"
"کیسے روکو گی؟ پولیس کھڑی کرو گی باہر؟ تماشہ ہوگا مالا۔ تم تماشے کے بغیر ان کو نہیں روک سکتیں۔ سارا خاندان ہم پہ تھو تھو کرے گا کہ ایسے موقع پہ ہم نے کم ظرفی دکھائی۔"
"میں روک سکتی ہوں اور میں روکوں گی۔" وہ اطمینان سے نمبر ملا رہی تھی۔ ماہی دم سادھے اسے دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

کبیرہ بیگم کانوں میں بندے پہن رہی تھیں جب فون بجنے لگا۔
کشمالہ۔ وہ مسکرا دیں۔ کال اسپیکر پہ لی اور بندے کا اسٹاپر بند کرتے ہوئے آواز روہانسی کر لی۔
"ہائے کشمالہ! تمہاری ماں کا ابھی پتہ چلا' بیٹا! میرا تو دل ہی ڈوب گیا ہے جیسے۔ میں..."
"آپ میری ماں کے جنازے پہ نہیں آئیں گی۔" وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ جاڑے کی نرم دھوپ سے اس کی آنکھیں سنہری لگ رہی تھیں۔
"چ... کشمالہ بیٹا! ایسے موقعوں پہ پرانی نفرتیں بھلا دیتے ہیں۔ ایسے نہیں کرتے' بیٹا!"
"میں نے کہا نا' آپ میرے گھر میں قدم بھی نہیں رکھیں گی۔" اس کا لہجہ کسی قسم کے جذبے سے عاری تھا۔
"اور خاندان والے کیا کہیں گے جب انہیں معلوم ہوگا؟" کبیرہ مسکرائیں۔ "سب تم بہن بھائیوں کو ہی برا کہیں گے۔ تمہاری ماں کی تربیت پہ بات آئے گی۔"
"میں آپ کو اپنے گھر میں تعویذ نہیں ڈالنے دوں گی' کبیرہ بیگم!" وہ ایک دم پھنکاری۔
کبیرہ بیگم کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ انہوں نے میز پہ رکھے پیکٹ کو دیکھا جس میں ابھی ابھی

عامل کی طرف سے تعویذ موصول ہوا تھا۔
"اور تم مجھے کیسے روکو گی۔" وہ غرائیں۔
"مالا! نہیں کرو۔" ماہی نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ پریشان لگ رہی تھی۔ "وہ ہمیں سارے خاندان میں بدنام کر دیں گی۔"
لیکن مالا اس طرف متوجہ نہیں تھی۔
"اگر آپ میرے گھر آئیں تو....."
"تو کیا؟ پولیس بلا کے مجھے گرفتار کرواؤ گی؟ کسی کے جنازے پہ آنا جرم ہے کیا؟"
کشمالہ مبین نے گہری سانس لی۔
"میں معید نہیں ہوں۔ وہ بھی بات بات پہ پولیس کی باتیں کرتا ہے۔ اور رہی ماہی... تو وہ غصے کی تیز ہے۔" ایک نظر بیڈ پہ فکر مند بیٹھی ماہی کو دیکھا۔ "آپ کو دیکھ کے شاید وہ آپ پہ حملہ کر دے۔ لیکن کبیرہ بیگم! میں ماہی نہیں ہوں۔ میں مالا ہوں۔ مجھے صرف ایک کام کرنا آتا ہے۔"
کبیرہ غور سے اس کو سن رہی تھیں۔
"اور وہ ہے رنگ کرنا۔ میرے سب سے اچھے دوست رنگ ہیں۔"
"یعنی؟"
"میرے گھر کے دروازے آپ کے لیے کھلے ہیں۔ اور ان کھلے دروازوں پہ کچھ بچے کھڑے ہیں۔ یہ وہ بچے ہیں جن کو میں اپنے فالتو رنگ دے دیتی ہوں۔" اس کی آواز دھیمی ہوئی۔ ایک سرگوشی ہو جیسے۔
"یہ بچے آپ کو پہچانتے ہیں اور آپ کو پسند نہیں کرتے۔ اور وہ کیا ہے کہ، جب بچوں کو کوئی پسند نہیں ہوتا تو وہ معصوم شرارتیں کر جاتے ہیں۔"
وہ کہتے ہوئے پونی سے نکلی ایک لٹ انگلی پہ لپیٹ رہی تھی۔
"ان کے ہاتھوں میں میرے دیے گئے رنگ ہیں جیسے وہ کسی کے لباس..... نئے لباس..... یہ گرا سکتے ہیں۔ بھرے مجمع میں ہر طرف سے وہ کسی پہ رنگوں کی ہولی کھیل سکتے ہیں۔ کسی پہ حملہ بھی کر سکتے ہیں اور ایسا کر کے وہ بھاگ جایا کرتے ہیں۔ بچے ہیں نا۔ کوئی انہیں پکڑ بھی نہیں سکتا۔"
کبیرہ سادان سانس روکے سن رہی تھیں۔
"وہ کسی کا پرس بھی چھین سکتے ہیں۔ کسی کا موبائل بھی۔ اور ایک منٹ میں..." اس نے چٹکی بجائی۔ "وہ بھاگ کے نظروں سے اوجھل بھی ہو سکتے ہیں۔ بچوں کو کوئی الزام نہیں دیتا۔ لیکن..." اس کی آواز مزید دھیمی ہوئی۔
"لیکن اس عورت کا کیا ہوگا جو دن میں کئی بار اپنے ہاتھ دھوتی ہے؟ جو اپنی شخصیت پہ ایک داغ برداشت نہیں کرتی؟ جس کا لباس بے شکن ہوتا ہے؟ اگر ایسی کسی عورت پہ کسی بچے نے غلطی سے کچھ گرا دیا تو وہ کیا کرے گی؟ کیا وہ بھرے خاندان کے سامنے یہ ہزیمت برداشت کرے گی؟"
دوسری جانب بالکل خاموشی تھی۔
"اور جس وقت یہ ہوگا، ہم تین بہن بھائی اپنی ماں کا جنازہ اٹھا رہے ہوں گے۔ کون ہمیں الزام دے گا؟ بلکہ ہم تو ہر رشتے دار سے کہیں گے کہ پلیز کبیرہ تائی کو کال کریں۔ ان سے کہیں کہ جنازے پہ ضرور آئیں۔ کوئی ہم پہ شک نہیں کرے گا۔ نہ کوئی ان بھاگ جانے والے بچوں کو پکڑے گا۔ فیصلہ آپ کا ہے۔"
کال منقطع ہو گئی۔ ماہی کے لب ابھی تک کھلے ہوئے تھے۔
"کبیرہ تائی کو او سی ڈی ہے۔" وہ اس کی طرف مڑی اور سپاٹ انداز میں بتانے لگی۔ "وہ اپنے اوپر ایک چھینٹ بھی برداشت نہیں کر سکتیں۔ وہ نہیں آئیں گی۔ میں نے کہا تھا نا' میں انہیں روک سکتی ہوں۔"
ماہی نے میکانکی انداز میں سر ہلا دیا۔
"کیا تم نے واقعی بچوں کو اس کام پہ کھڑا کیا ہے؟"
مالا نے جواباً کھڑکی کی جانب اشارہ کیا۔ ماہی کی نظریں اس طرف اٹھیں۔ گیٹ کے ساتھ مرد

حضرات کے آگے پیچھے چند بچے ٹہل رہے تھے۔
"مالا تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"
وہ باہر جا رہی تھی جب ماہی نے اسے پکارا۔ وہ چوکھٹ سے پلٹی اور اس کا چہرہ دیکھا۔
"جب ماں مر جاتی ہے تو کچھ بچے ڈھے جاتے ہیں۔ اور کچھ....." اس نے بہت سے آنسو اندر ہی اندر اتار دیے۔ "کچھ بڑے ہو جاتے ہیں۔ اپنی ماں جتنے بڑے۔"
یہ کہہ کے وہ رکی نہیں۔ دروازہ بند کر کے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

یہ نومبر کے ابتدائی دنوں کی ایک صبح تھی جو استنبول پہ خزاں کی ٹھنڈی ہوا لیے اتری تھی۔ اس کے آفس کی کھڑکی میں رکھا کیکٹس کا پودا اب سبز نظر آ رہا تھا۔ اسے جاڑا راس آ گیا تھا۔
"یہ کب ہوا؟" بیر بل نے دھیرے سے پوچھا۔ وہ ماہر کے سامنے بیٹھا تھا۔ چہرے پہ افسوس تھا۔
"ایک ہفتہ پہلے۔" وہ خاموشی سے کھڑکی میں رکھے پودے کو دیکھ رہا تھا۔ چہرے پہ تکان تھی۔
"تمہیں کس نے بتایا؟" وہ بغور ماہر کا چہرہ دیکھ رہا تھا جس پہ ایک مانوس سی سوگواری تھی۔ قاسم فرید کے جنازے والے دن جیسی۔
"اس کی بہن نے۔"
ایک خزاں آلود خاموشی پھر سے چھا گئی۔
"کیا اس کی ماں کا انتقال جادو سے ہوا ہے؟"
"معلوم نہیں۔" وہ لبوں پہ مٹھی رکھے ہلکے سے شانے اچکا کے رہ گیا۔ "لیکن موت مکتوب ہوتی ہے بیر بل بے۔"
"یعنی جس کو دنیا میں آنا ہے اسے کوئی روک نہیں سکتا اور جس کو جانا ہے اسے بھی کوئی روک نہیں سکتا پھر ہمارے ہاتھ میں کیا ہے؟" عجیب بے زاریت سی محسوس ہوئی۔ بے بسی بھری بے زاریت۔
"بس اتنا کہ ہم اپنے ساتھ کیا لے کر جاتے ہیں۔" وہ آزردگی سے مسکرایا۔
"اسے کال نہیں کرو گے؟"
"معید کو کال کی ہے۔ اپنے حصے کی تعزیت کر لی ہے میں نے۔"
"ماہر!" بیر بل نے ماتھے کو چھوا۔ "چھوڑ دو اپنی انا۔ اس کو کال کر لو۔ وہ تکلیف میں ہو گی۔"
دروازہ دستک سے کھلا اور زارینہ اندر آتی دکھائی دی۔ اس نے لمبے سفید بوٹ پہن رکھے تھے۔ مڈی ڈریس میں کمر کے گرد بیلٹ بندھی تھی۔ کھلے بال شانوں پہ لہرا رہے تھے۔ وہ ٹھک ٹھک کی آواز سے چلتی ان کے سامنے آئی۔ باری باری ان کے چہرے دیکھے۔
"تم لوگوں کو کیا ہوا ہے؟" پھر ایک ٹیبلٹ ماہر کے سامنے رکھا۔
"کچھ نہیں۔" ماہر نے سر جھٹکا۔ "میں اسے بعد میں دیکھ لوں گا۔ ابھی میرے سر میں درد ہے۔"
زارینہ نے بغور اس کی آنکھوں کو دیکھا۔ "کوئی میڈیسن لا دوں؟"
"کچھ ایسا لا دو جو جمے ہوئے دل کو پگھلا دے۔"
"بیر بل۔" اس نے اسے تادیبی نظروں سے گھورا تو وہ منہ میں بڑبڑا کے رہ گیا۔
زارا نے باری باری ان دونوں کو دیکھا، پھر سر جھٹک کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔
"اتنے بڑے استنبول میں زارا کو تمہارے علاوہ کوئی کیوں نہیں نظر آتا؟" بیر بل اس کے جاتے ہی افسوس سے بولا تو ماہر نے بغور اسے دیکھا۔
"اس لڑکی کا کیا ہوا؟ وہ جو مختلف تھی؟"
"وہ ٹھیک ہے۔" بیر بل دائیں بائیں دیکھنے لگا۔
"اس کی طبیعت نہیں پوچھ رہا۔ ردعمل پوچھ رہا ہوں۔" وہ بغور بیر بل کے چہرے کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔
بیر بل نے ایک لمبی، ٹھنڈی آہ بھری۔

"پہلے اس نے ملنا کم کیا۔ پھر کال اٹھانی چھوڑی۔ پھر اس نے کہا" یہ تم نہیں ہو، یہ میں ہوں" (منہ بگاڑ کے نقل اتاری) پھر اس نے مجھے بالکل چھوڑ دیا اور آج مجھے معلوم ہوا کہ وہ، میرے ہی ایک دوست کے ساتھ شاپنگ کرتی دکھائی دی ہے۔ اب تم بھی بھر کے ہنس لو۔"

لیکن وہ نہیں ہنسا۔ کندھے اچکا دیے۔ "آئی ایم سوری۔"

"تمہیں کیسے ہر دفعہ علم ہو جاتا ہے؟ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے تم میری جاسوسی کرواتے ہو اور ان لڑکیوں کو مجھے چھوڑنے کے لیے پیسے دیتے ہو۔"

"میں ایسی عورتوں پہ پیسہ ضائع نہیں کرتا۔" ماہر نے ناک سے مکھی اڑائی۔

"پھر کیسے تمہارا اندازہ ہر دفعہ درست ہو جاتا ہے؟ تم ان میں سے ایک لڑکی سے بھی آج تک نہیں ملے۔ نہ تم انہیں جانتے ہو۔"

"کیونکہ میں تمہیں جانتا ہوں بی!" وہ آگے بڑھا اور نرمی سے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھا۔

"کیا مطلب؟" بیربل کی آنکھوں میں اچھنبا ابھرا۔

"خود سوچو بی! ہمیشہ تمہیں ہی ٹاکسک لڑکیاں کیوں ملتی ہیں؟"

"کیا میں ٹاکسک ہوں؟"

ماہر نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم ایک اچھے انسان ہو۔ لیکن تمہیں ایک جیسی لڑکیاں کیوں ملتی ہیں اس کسوٹی کو تمہیں خود ہی حل کرنا ہے۔"

تھوڑی دیر کے لیے ایک الجھن بھری خاموشی چھا گئی۔ پھر بیربل اٹھ کھڑا ہوا۔

"اسے کال کر لو ماہر۔" موبائل جیب میں ڈالتے ہوئے اس نے تاکید کی۔

ماہر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ بولا کچھ نہیں۔

بیربل کے جانے کے بہت دیر بعد اس نے انٹر کام اٹھایا۔

"م... میرے لیے اس ویک اینڈ پہ لاہور کی فلائٹ بک کروا دو۔" وہ اب میز پہ رکھی ایک خوشبو دار کینڈل کے گرد انگلی پھیر رہا تھا۔ نظریں اس کے جلتے سیاہ ہوئے دھاگے پہ جمی تھیں۔

☆☆☆

مبین منزل کی خاموشی ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔ اس رات وہ گم صم سی صوفے پہ بیٹھی تھی۔ آج اس نے گلابی لباس پہ سفید دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ آنکھیں آج بھی خشک تھیں اور، وہ گود میں رکھے موبائل پہ جمی تھیں۔ ماں کی تصویر اس نے وال پیپر پہ لگا رکھی تھی۔ اور اب دھیرے دھیرے اپنی انگلی ان کے چہرے پہ پھیر رہی تھی۔

"کیا مصیبت ہے؟ اس کو برپ کیوں نہیں آتا؟" سامنے کمرے میں ٹہلتی ماہی تھی جو، کو کندھے سے لگائے جھنجھلا کے کہہ رہی تھی۔

"ایک گھنٹے سے کمر پہ ہاتھ پھیر رہی ہوں۔ برپ ہی نہیں آ رہا۔" چڑچڑے انداز میں اس کا ہاتھ بچی کی کمر پہ تیزی سے چلنے لگا۔ تھپ تھپ۔

مالا نے چہرہ اٹھا کے اسے دیکھا۔ پھر واپس فون کو دیکھنے لگی۔

"برپ (ڈکار) نہیں آئے گا تو پھر سے دودھ نکال دے گی۔ اچھا عذاب ہے۔" ماہی نے تیزی سے بچی کو نیچے لٹایا اور اس کے اوپر جھکی۔

"مسئلہ کیا ہے تمہارا؟ کیوں نہیں آتا تمہیں برپ؟ نوکر ہوں میں تمہاری، جو سارا دن تمہیں تھپکتی رہوں؟" اس نے دونوں ہاتھوں سے بچی کو جھنجھوڑا۔ بچی کے ہونٹ رونے کی صورت میں بنے۔ ماہ بینہ کی تیوریاں مزید چڑھ گئیں۔

"آواز نہ آئے مجھے تمہاری۔" اس نے کھینچ کے ایک تھپڑ اس کے کندھے پہ مارا۔ بچی ایک دم اونچی آواز میں رونے لگی۔

"اف۔ رونا بند کرو۔" اس نے دوبارہ ہاتھ بڑھائے کہ اس کو جھنجھوڑ دے لیکن اس کی کلائی راستے میں زور سے کسی نے پکڑ لی۔ ماہی نے چونک کے سر اٹھایا۔

مالا اس کا ہاتھ جکڑے اس کے سر پہ کھڑی تھی۔
"میری بات کان کھول کے سنو ماہ بینہ بیگم! اگر تمہارا ہاتھ دوبارہ اس بچی پہ چلا تو میں اس کو یہاں سے لے کر چلی جاؤں گی اور تم اس کی شکل دیکھنے کے لیے بھی ترسو گی۔ آئی سمجھ؟"
ایک جھٹکے سے اس کی کلائی چھوڑی۔
ماہی کے کندھے ڈھیلے پڑے۔ آنکھوں میں نمی ابھر آئی۔ بچی اب حلق پھاڑ کے رونے لگی تھی۔
"میں کیا کروں؟ اس کو برداشت نہیں آرہا۔"
وہ اپنی سرخ کلائی سہلا رہی تھی۔ مالا دھیرے سے اس کے سامنے بیٹھی۔ اس کے بھرے بھرے چہرے پہ رت جگے کی تھکاوٹ تھی۔
"تم بے بی کو قصوروار سمجھتی ہو۔ تمہیں لگتا ہے سب اس کی وجہ سے ہوا ہے۔"
ماہی نے گلابی پڑتی آنکھیں اٹھائیں۔
"سب اس کی وجہ سے ہوا ہے۔ اس دن کے لیے لوگ اولاد مانگتے ہیں کیا؟ اس... اس..." تنفر بھری آنکھوں سے روتی ہوئی بچی کو دیکھا۔ "اس کی وجہ سے میں اپنی ماں سے نہیں مل سکی۔ اس کی وجہ سے....."
بانو بھاگتی ہوئی آئی اور روتی ہوئی بچی کو اٹھالیا۔
"ماں کی زندگی اتنی ہی لکھی تھی۔"
"مگر میں نہیں آئی۔ مالا میں کیوں نہیں آئی؟ اس کی وجہ سے۔" وہ روتے ہوئے بانو کے ہاتھ میں موجود بچی کی طرف اشارہ کررہی تھی۔
"میں نے اس کو اپنی ماں کے اوپر ترجیح دی۔ اس کی وجہ سے ہوا ہے سب۔ مل گئی مجھے اولاد۔ یہی چاہیے تھا مجھے۔ میری ماں چلی گئی۔" وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔
"سب کہتے ہیں ماہی بدنصیب ہے۔ ماں کی خدمت نہیں کرسکی۔ جو آتا ہے یہی کہتا ہے۔ کیا میں بدنصیب ہوں، مالا؟"
مالا نے نرمی سے اس کی سرخ کلائی تھامی۔ پھر اس کا ہاتھ سہلایا۔
"جو بچے اپنی مجبوریوں کی وجہ سے ماں باپ کے آخری وقت میں ان کے ساتھ نہیں ہوتے، وہ بدنصیب نہیں ہوتے، ماہی! بس یہ ان کے نصیب میں نہیں ہوتا۔"
اس نے نرمی سے ماہی کے چہرے پہ آئے آنسو پونچھے۔
"ماہی باجی! جب میرا شوہر میرے اوپر ہاتھ اٹھاتا تھا تو آپ کتنا برا مانتی تھیں۔" بانو روتی ہوئی بچی کو چپ کرواتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "وہ اپنا غصہ میرے پہ نکالتا تھا۔ اور آپ اس بچی پہ نکال رہی ہیں۔ یہ کوئی بات ہے بھلا؟" بانو باقاعدہ برا مان کے بچی کو لیے باہر چلی گئی۔
"مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس کو کیسے سنبھالوں۔ کوئی کہتا ہے سر بٹھاؤ۔ کوئی کہتا ہے ایسے اٹھاؤ۔ ماں ہوتیں تو بتاتیں کہ کیا کرنا ہے۔"
"صرف اتنا کرو کہ حور کو قصوروار سمجھنا چھوڑ دو۔ تم ایسے اللہ کی ناشکری کررہی ہو۔ ماں یہ کبھی برداشت نہ کرتیں۔" وہ اسے سمجھا رہی تھی۔ ماہی نے بھیگی آنکھوں سے اس کا چہرہ دیکھا جیسے کچھ ٹٹول رہی ہو۔
"تم اتنی کمپوزڈ کیسے ہو؟"
"کیونکہ میں کچھ ایسا جانتی ہوں جو تم نہیں جانتیں۔"
ماہی کے آنسو ٹھہر گئے۔ "تم مجھ سے شیئر نہیں کروگی؟"
"کروں گی۔ جب تمہارے آنسو رکیں گے اور تمہاری نظر دیکھنے کے قابل ہوگی۔"
ماہی ٹکرٹکر اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ وہ دونوں کب سے ایک دوسرے کے ساتھ راز رکھنے لگ گئی تھیں؟
"مالا باجی!" بانو کی چھوٹی بہن نے اندر جھانکا۔ "مہمان آئے ہیں۔ وہ... وہ جو باہر کے ملک میں رہتے ہیں...."
مالا کی گردن تیزی سے مڑی۔ "کون کیف؟"

''نن نہیں.. وہ ثریا صاحب کی امی۔''

اس کی اٹکی سانس جاری ہوئی۔ کندھے ڈھلک گئے۔ وہ ماہی کو دیکھے بنا اٹھ کھڑی ہوئی جو بہت غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''کیف؟ تم نے کہا کیف؟''

مالا اس کی طرف نہیں پلٹی۔

''منہ سے نکلا تھا۔''

''مگر ذہن سے نہیں نکلا۔''

مالا نے جواب نہیں دیا۔ وہ آگے بڑھ گئی۔

زیاد اسے روز ہی میسج کرتا تھا۔ وہ آ نہیں سکا تھا لیکن اس نے کہا تھا کہ امی کچھ دن بعد آئیں گی۔ مالا نے منع بھی کیا کہ ان کو سفر نہ کرنے دے لیکن اس نے بتایا کہ جب سے انہوں نے حور آنٹی کی ڈیتھ کی خبر سنی ہے وہ بہت غمگین رہنے لگی ہیں۔

نگینہ بیگم کو دیکھ کے اسے دھچکا سا لگا۔ وہ بہت کمزور اور بیمار لگ رہی تھیں۔ چہرہ زرد ہو چکا تھا۔ ہاتھ میں اسٹک تھی جس کے سہارے چلتی تھیں۔ سفید براق دوپٹہ چہرے کے گرد پھیلائے وہ اسے دیکھ کے مسکرائیں۔ ان کا چہرہ آج بھی مالا کو ہمیشہ کی طرح پرنور لگا تھا۔

''آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟''

کچھ دیر بعد وہ دونوں بہنیں ان کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ ماہی بھی انہیں دیکھ کے فکر مند ہوئی تھی۔

''بس بیٹا! اب تو اگلے سفر کی تیاری ہے۔''

انہوں نے مسکرا کے اسے دیکھا تو وہ ایک دم اندر تک ہل گئی۔ ماہی بھی جلدی سے بولی۔

''اللہ نہ کرے۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے!''

وہ اب بانو کو دیکھ رہی تھیں جو حور کو اٹھائے ہیٹر کے سامنے بیٹھی تھی۔

''اس کو گھٹی دی ہے؟''

ماہی نے لب کاٹے۔

''نہیں۔ عباد کو پسند نہیں تھا کہ کوئی اس کے منہ میں ہاتھ دے۔ لیکن میں نے سوچا تھا پاکستان آ کے ماں کے ہاتھوں سے...'' اس کی آواز بھیگ گئی۔ سر جھکا لیا۔

''بچی کو مجھے دو۔ اور جاؤ تم شہد لے کر آؤ۔''

بانو نے حور کو ان کے نحیف بازوؤں میں دیا۔ انہوں نے اسے اٹھایا اور کندھے سے لگایا۔ ایک دم بچی کو ڈکار آ گئی۔ ماہی نے بے یقینی سے چہرہ اٹھا کے دیکھا۔ (وہ بھی ایسے ہی کر رہی تھی۔ مگر یہ کیسے....؟)

پھر انہوں نے پیار سے اس بچی کو اپنے گھٹنے پہ بٹھا لیا۔ ننھی حور عین کا رونا بالکل ختم ہو گیا۔ وہ ایک دم پرسکون ہو گئی۔

بانو شہد لے آئی تھی۔ انہوں نے اپنے انگوٹھے سے ذرا سا شہد لے کر چٹایا۔ بچی نے مزے سے وہ کھا لیا۔ ماہی کے آنسو پھر سے بہنے لگے۔

''تمہاری ماں نہیں ہے تو کیا ہوا بیٹا! مائیں بھی سانجھی ہوتی ہیں۔ اب میری بات سنو....'' وہ پیار سے ماہی کو دیکھ کے اسے سمجھانے لگیں۔ ''اس کا سر یوں کندھے سے لگاؤ گی اور ایسے کمر پہ ہاتھ پھیرو گی تو اسے ڈکار آئے گا۔ اور جب اس کو سلایا کرو تو کپڑے سے باندھا کرو۔''

''مجھے لگتا ہے اس پہ ظلم ہو رہا ہے۔ کیسے باندھوں۔''

''نہیں بیٹا! ظلم نہیں ہے۔ ورنہ بچہ نیند میں اٹھ کے ڈر جاتا ہے... ایسے کرو ململ کا دوپٹہ لو اور....''

ماہی ان کے ساتھ صوفے پہ بیٹھی تھی اور وہ اس کو سمجھا رہی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ بولتی تھیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد سانس چڑھ جاتا تھا۔ وہ ٹھیک نہیں تھیں۔ مالا اپنی سیٹ پہ بیٹھی خاموشی سے ان کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

کیا نگینہ بیگم اس عامل کا اگلا شکار تھیں؟ یہ کیسا کھیل تھا جس میں ماؤں کی قربانی دینا لازم تھی؟

کیا زیاد بھی اپنی ماں کو کھو دے گا؟

''آپ پاکستان خیریت سے آئی ہیں؟'' اس کی توجہ ان کی باتوں کی طرف مبذول ہوئی۔ ماہی ان سے کچھ پوچھ رہی تھی۔

"بس بیٹا! زیاد کی پھپھو کے ہاں اس کی بات پکی کرنے لگی ہوں۔ وہ بمشکل مانا ہے۔ میری زندگی کا اب کوئی بھروسہ نہیں۔ سوچ رہی ہوں اگلے ماہ شادی کردوں اس کی۔"

کشمالہ نے پوری بات غور سے سنی۔ پھر پیروں میں پہنے سیاہ کھسے دیکھے۔ دل کو ٹٹولا۔ وہاں کچھ نہیں تھا۔ کوئی شاک، کوئی صدمہ کوئی دکھ نہ تھا۔

ماہی صحیح کہتی تھی۔ وہ بدل گئی تھی۔

☆☆☆

سرکار کی آنکھیں بند تھیں۔ اور جسم چوکڑی کی صورت میں ساکت نظر آرہا تھا۔ اس کا سر اثبات میں ہل رہا تھا۔ جیسے اس کے کان کسی کی بات سن رہے ہوں۔ ایک دم اس نے آنکھیں کھولیں۔ چہرے پہ تعجب ابھرا۔ اور پھر بے یقینی۔

"وہ نہیں۔ اسے پاکستان نہیں آنا چاہیے۔" اس کی آنکھوں میں خوف نظر آیا۔ اس کا سر دائیں بائیں نفی میں ہل رہا تھا۔

"ماہر فرید کو پاکستان نہیں آنا چاہیے۔ ماہ بینہ وہاں موجود ہے۔ وہ اس سے مل لے گا اور... نہیں..."

اس نے بے اختیار سر ہاتھوں میں گرا لیا اور نارنجی رومال نوچ لیا۔ اس کا دماغ جیسے درد سے پھٹنے کو تھا۔

"اگر وہ اس سے ملا اور اس نے اپنی کہانی سنا ڈالی تو سارا کھیل خراب ہو جائے گا۔ وہ مجھ تک پہنچ جائے گا۔ صرف ماہی جانتی ہے۔ وہ اس کی مدد سے مجھے پہچان لے گا۔ نہیں۔" اس نے پھر سے نفی میں سر ہلایا۔

"اس کو روکنا ہوگا۔"

جواب میں اسے کچھ کہا گیا۔ اس نے نگاہیں اٹھا کے طنز سے ان سب کو دیکھا جو وہاں مودب کھڑے تھے۔ وہ سب جو نظر نہیں آرہے لیکن سرکار کی نگاہ ان کو دیکھ سکتی تھی۔

"تم؟ تم روکو گے اس کو؟ ہونہہ۔ تم زخمی ہو ابھی۔ تم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ تمہاری پاور ٹوٹ چکی ہے۔"

(جب کسی عامل کا جادو ناکام ہوتا ہے تو اکثر وہ اس پہ اور اس کے جنات پہ پلٹ آتا ہے۔ یہ چیز اس کے جنات کو کمزور کر دیتی ہے اور وہ اگلے کئی ماہ کسی پہ جادو کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ انہیں اپنی پاور مجتمع کرنے کے لیے چند ہفتے یا مہینے لگتے ہیں۔ پاور کا لفظ پاکستان اور انڈیا کے جادوگر اپنی روحانی طاقت کے لیے استعمال کرتے ہیں۔)

"ماہ بینہ کی بیٹی نے تمہاری پاور توڑ دی تھی۔ ہمیں یہ کام کسی انسان سے کروانا ہوگا۔"

سرکار نے اپنا اسمارٹ فون نکالا اور اسکرین روشن کی۔ اس کا انگوٹھا کانٹیکٹ لسٹ نیچے کرتا گیا۔ وہاں کئی ملکوں کے لوگوں کے نمبر، ان کے شہر کے نام کے ساتھ محفوظ تھے۔ یہ سب اس کے کلائنٹس تھے۔

اس نے استنبول کی لسٹ نکالی۔ کئی ناموں پہ انگلی روکی۔ لیکن پھر نفی میں سر ہلایا۔ بالآخر ایک نام پہ اس کی آنکھیں چمکیں۔

اس نے کال ملائی اور فون کان سے لگایا۔

"مجھے تم سے کام ہے۔" اس کی آواز سرگوشی جیسی تھی۔

"حکم کریں سرکار!"

"ایک آدمی کو مارنا ہے۔ لیکن ایکسیڈنٹ سے۔ اسے بچنا نہیں چاہیے۔ اور یہ کام آج ہی ہونا چاہیے۔ اس کا نام ماہر فرید ہے۔ ہم تمہیں اس کی تفصیلات بھیج رہے ہیں۔"

اس نے موبائل رکھا اور مطمئن نگاہوں سے ان سب کو دیکھا جنہیں صرف اس کی آنکھیں دیکھ سکتی تھیں۔

"کہا نا یہ انسان کے کرنے کا کام ہے۔" طمانیت کی ایک لہر اس کے سارے وجود پہ پھیلتی گئی۔

☆☆☆

مبین منزل پہ رات اتری تو لان کی بتیاں روشن ہونے لگیں۔ اب کوئی نہیں تھا جو پوچھتا کہ پودوں کو پانی لگایا نہیں۔ یا ہر نماز پہ آواز دے کر کہتا کہ نماز پڑھ لو۔ گھر میں بہت سے لوگ تھے اور پھر بھی خاموشی تھی۔

ماہی بیرونی زینے چڑھتی اوپر آئی تو اسٹوڈیو کے بند دروازے کے پیچھے سے روشنی جھلک رہی تھی۔ اس نے دروازے پہ دستک دی۔ پھر اسے کھولا۔

سامنے مالا فرش پہ بیٹھی تھی۔ اس کے بالوں کا ملگجا سا جوڑا بندھا تھا اور اس کے گرد، بہت سے کاغذ بکھرے تھے۔ ماہی تحیر سے یہ سب دیکھتی اندر آئی۔

"معید نے کھانا کھالیا؟" وہ سر جھکائے ایک کاغذ پہ تیز تیز پنسل پھیر رہی تھی۔

"بچہ نہیں ہے، کھالے گا خود ہی۔" ماہی کی متعجب نظریں دیواروں کا سفر کر رہی تھیں۔ وہاں بھی چند کاغذ چسپاں تھے۔

"ماں کو اس کے کھانے کی ہمیشہ فکر ہوتی تھی۔ ہمیں بھی کرنی ہے ماہی!"

"تم کیا کر رہی ہو؟" ماہی دائیں بائیں گھوم کے اس سب کو دیکھ رہی تھی۔ ان کاغذوں پہ الفاظ تحریر تھے۔ اس کے خواب۔ خوابوں میں نظر آنے والی علامتیں۔ وہ جیسے گزشتہ چند ماہ میں ہونے والے واقعات کا ایک نقشہ تھا۔ تاریخوں کے ساتھ۔

"میں نقطے ملا رہی ہوں۔" وہ سر جھکائے کاغذ پہ پنسل رگڑ رہی تھی۔ "جب آخری دفعہ میں نے، اس عامل کا اسکیچ بنانے کی کوشش کی تھی تو اس نے مجھے ڈرایا تھا۔ اور میں ڈر گئی۔ اب نہیں ڈروں گی۔" وہ بالکل پرسکون تھی۔

ماہی دھیرے سے اس کے ساتھ زمین پہ بیٹھی۔ کشن کا سہارا لیا۔

"مگر مالا! تم کہتی ہو کہ ماں جادو سے نہیں...." آواز بھیگ گئی۔

"میری ماں جادو سے نہیں مری۔ ہاں۔ ان کی موت لکھی تھی۔ جیسے قتل ہونے والوں کی لکھی ہوتی ہے۔ لیکن قاتل کو معافی نہیں ملتی۔" اس نے چہرہ اٹھا کے ماہی کو دیکھا تو اس پہ کچھ ایسا تھا جو اتنے دنوں میں پہلی دفعہ اسے نظر آیا تھا۔ "اس عامل کے جادوؤں نے میری ماں کو چھ ماہ بہت تکلیف دی ہے۔ مجھے کئی ماہ ہراساں رکھا۔ اب اور نہیں۔"

اس نے دیواروں کی طرف اشارہ کیا۔

"میں اس عامل کو ڈھونڈوں گی اور اس کو ہائر کرنے والے کو بھی۔ اور پھر میں اس سے اپنی ماں کی ہر تکلیف کا انتقام لوں گی۔"

"لیکن ہم اسے کیسے ڈھونڈیں گے؟ ہم اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔"

"دو باتیں ہم جانتے ہیں۔" اس نے انگلیوں کی وی بنا کے دکھائی۔ "جب اس نے مہندی کے فنکشن میں مجھ پہ حملہ کیا تھا، تو میری گردن سے خون نکلا تھا۔ مجھے اس کے ہاتھ سے کچھ چبھا تھا۔"

"یعنی؟"

"یعنی وہ عامل ایک خاص قسم کی انگوٹھی پہنتا ہے، جس کا پتھر نوکیلا ہے اور وہ اسے، اندر کی طرف موڑے رکھتا ہے۔ یوں اگر وہ کسی کا گلا دبائے گا تو اس سے خون نکلے گا۔"

"کیا وہ ہاتھ اسی کا تھا؟ کیا معلوم کسی جن کا ہو۔" ماہی نے کہتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔

"وہ انسان کا ہاتھ تھا۔ اس نے جادو کے ذریعے یہ کیسے کیا، مجھے نہیں معلوم۔ لیکن یہ اسی کا ہاتھ تھا۔" وہ پر یقین تھی۔

"اور دوسری بات؟"

مالا نے جواب دینے کے بجائے ایک کاغذ اس کے سامنے کیا۔ ماہی نے حیرت سے اسے تھاما۔ پھر زمین پہ بکھرے دوسرے کاغذوں کو دیکھا۔

ان سب پہ ایک آدمی کے چہرے کے مختلف زاویے بنے تھے۔ دائیں۔ بائیں۔ سامنے سے۔ اس کے سامنے سے بال جھلک رہے تھے اور سر پہ نارنجی رومال بندھا تھا۔ وہ رنگین تصاویر تھیں سو سفید

بال صاف واضح تھے۔

"یہ ہے وہ عامل جس نے میری ماں پہ جادو کیا تھا۔ اور مجھے یقین ہے وہ اب بھی میرے پیچھے ہے۔"

ماہی بنا پلک جھپکے ان تصاویر کو دیکھ رہی تھی۔

"پتہ نہیں کیسے کہاں مگر میں نے اسے دیکھ رکھا ہے ماہی!"

"میں نے بھی..." وہ بڑبڑائی۔ مالا چونکی۔ پھر تیزی سے آگے ہوئی۔

"تم اس کو پہچانتی ہو؟"

ماہ بینہ مبین نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بالکل شل تھی۔

"یہ نہیں ہو سکتا۔ ناممکن ہے۔" ماہی بے یقینی سے کبھی اسکیچ والے آدمی کو دیکھتی، کبھی چہرہ اٹھا کے مالا کو۔

"یہ..."

ماہی کے حلق سے نکلنے والے اگلے الفاظ پہ کشمالہ ایک دم پیچھے ہٹی۔

ایک جھماکے سے اسے یاد آ گیا تھا کہ وہ اس شخص کو کیسے جانتی تھی۔

☆☆☆

سریار میں بنی اپارٹمنٹ بلڈنگز کے سامنے لمبی سڑک تھی جس کے پار باسفورس کا پرسکون کنارہ تھا۔ کارنش پہ فٹ پاتھ بنا تھا، جہاں فاصلے فاصلے پہ بنچ رکھے تھے۔ رات گہری ہو چکی تھی۔ کچھ لوگ بینچوں پہ بیٹھے تھے۔ کچھ ساتھ ٹہل رہے تھے۔ کچھ سودے سلف کے شاپر اٹھائے تیز تیز چلتے جا رہے تھے۔

ایسے میں ماہر سر جھکائے جیبوں میں ہاتھ ڈالے دھیرے دھیرے قدم اٹھا رہا تھا۔ اس کا ذہن کہیں الجھا تھا۔ بال ماتھے پہ بکھرے تھے اور شیو آج زیادہ ہی بڑھی ہوئی تھی۔

وہ جب سے آفس سے آیا تھا، طبیعت مضمحل سی ہو رہی تھی۔ اپارٹمنٹ میں گھٹن ہونے لگی تو وہ نیچے آ گیا۔ سامنے کہیں کشتیاں کھڑی تھیں۔ اور کہیں موسیقی گونج رہی تھی۔

دفعتاً وہ رکا۔ موبائل روشن کیا۔ اسکرین کی نیلی روشنی اس کے چہرے پہ پڑنے لگی۔ اس نے مطلوبہ چیٹ کھولی۔ ایک چیٹ جسے وہ کئی دفعہ کھول چکا تھا۔

جسے وہ کئی دفعہ کھول کے بند کر چکا تھا۔

کی پیڈ پہ انگلیاں چلنے لگیں۔ چند الفاظ لکھے۔ پھر مٹا دیے۔ سر جھٹک دیا۔

وہ مالا سے نہیں، ماہ بینہ سے ملنے جا رہا تھا۔ کیا کر لے گی وہ زیادہ سے زیادہ؟ غصہ کرے گی؟ چلائے گی؟ دیکھتے ہیں۔

بڑبڑاتے ہوئے وہ آگے بڑھ گیا۔

اس کی اپارٹمنٹ بلڈنگ سڑک کے سامنے تھی۔ سڑک پار کرنے سے پہلے عادتاً دائیں بائیں دیکھا۔ کوئی کار اس وقت نہیں گزر رہی تھی۔ قریب میں ایک سیاہ رنگ کی ایس یو وی کھڑی تھی۔ وہ سڑک پہ آگے بڑھا۔

ایسے ہی ذہن کے کسی خانے میں ایک خیال ابھرا۔ وہ ایک ڈیڑھ میل کی واک کے بعد اپارٹمنٹ واپس آیا تھا۔ یہ ایس یو وی کافی دیر سے اس کے قریب نظر آ رہی تھی۔ اس کی لائٹس بجھی ہوئی تھیں۔ لیکن انجن آن تھا۔

اس نے قدم آگے بڑھائے۔ پھر جو ہوا وہ تین سیکنڈ کے اندر اندر ہوا۔

ایک دم سیاہ ایس یو وی کے ٹائر چرچرائے۔ وہ پوری رفتار سے آئی۔ ماہر فرید نے گردن اس طرف گھمائی۔ قدموں نے حرکت کی۔ لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ سیاہ کار پوری وقت سے اس سے ٹکرائی۔ اور زن سے آگے نکل گئی۔

آس پاس شور بلند ہوا۔ بہت سے لوگ اس طرف بھاگے، جہاں سڑک کنارے ایک آدمی اوندھے منہ گرا ہوا تھا۔ ساتھ اس کا موبائل چکنا چور ہوا پڑا تھا۔ اور خون کا ایک تالاب تھا جو اس کے گرد جمع ہو رہا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

عندلیب زہرا

آپ جیسی

میری رائے کو سب تسلیم کرتے،
مشوروں کو صائب گردانتے......

ہر محفل۔ ہر موقع پر ہمیشہ میں نے اپنے نام کی پکار سنی تھی۔ اس بات میں کوئی شک نہیں، میں حسن صورت و حسن سیرت میں سب ہی کی آئیڈیل ٹھہرتی۔ اس میں زیادہ ہاتھ میرے گھر والوں بالخصوص میرے والدین کا تھا۔ جو میری کامیابیوں، خوبیوں کا تذکرہ ہر ایک کے سامنے کرتے۔ بہن بھائی میری ہر بات مانتے۔

اس لیے میرے اندر حاکمیت آ گئی تھی۔ بلکہ آمریت کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ میں نے لیکچرر شپ کا آغاز کیا تھا۔ زندگی اپنی ڈگر پر جاری تھی۔

میں نے زندگی میں پہلی اور آخری بار اپنے گھر والوں کے سامنے سر جھکایا تھا۔ بس ایک بار......
صرف ایک بار......

اور وہ موقع تھا جب میری شادی کے لیے رضامندی لی گئی تھی۔ میں نے اچھی بیٹیوں کی طرح سر جھکا دیا۔

رضا...... میرے والدین کی پسند تھے۔

نرم خو، حلیم الطبع، میرے مزاج کے برعکس اور مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ رضا کی نرم طبیعت نے میرے اندر کی آمریت کو مہمیز کیا تھا۔

اب عمر کے اس حصے میں مجھے احساس ہوتا ہے کہ مردوں کو عورت بالخصوص بیوی کے سامنے اتنا حلیم الطبع...... کمپرومائزنگ نہیں ہونا چاہیے۔ بیوی اس بات کو کمزوری سمجھ کر حاوی ہو جاتی ہے۔ گھر کے معاملات میں آخری فیصلہ مرد کا ہونا چاہیے لیکن اس وقت مجھے اپنی ذات سے آگے کوئی نظر نہیں آتا تھا۔

گھر کے تمام معاملات میرے ہاتھ میں تھے۔ تمام فیصلے میں کرتی تھی۔ جس طرح کا مزاج بن چکا تھا نا، اب میرے لیے کسی کے ماتحت رہنا بہت مشکل تھا۔ اور میرے دور اندیش والدین نے رضا کا انتخاب کر کے میری ازدواجی حیثیت کو محفوظ بنا دیا تھا۔

گھر...... گھر نہیں میری سلطنت بن چکا تھا۔

لیکن ہر عورت کے لیے اس کا گھر سلطنت ہے تو اس میں عجب کیا ہے بھلا؟

قدرت نے میری زندگی کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہنے دیا تھا۔ صحت مند اولاد سے نوازا تھا۔ نعمت اور رحمت دونوں سے میری آغوش بھی تھی۔ لیکن مجھے سب سے زیادہ پیار مرتضیٰ سے تھا۔ وہ پہلوٹی کا بیٹا تھا۔

میرے خواب اس سے وابستہ تھے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ میں نے اپنی ممتا کا بڑا حصہ مرتضیٰ کو دیا تھا۔ امن اور سالار سے محبت تھی لیکن اولیت مرتضیٰ کو تھی۔ وہ بھی ایسا تابع دار تھا جس پر فخر ہوتا۔

لیکن معلوم نہیں کیوں...... اچانک مجھے احساس ہونے لگا کہ میری اس قدر محنت، ڈسپلن کے باوجود بچے وہ رزلٹ نہیں دے رہے جو کہ دینا چاہیے۔

سالار لاپروا تھا۔ کم از کم مرتضیٰ کے مقابلے میں......

"ہر بچہ ایک جیسا نہیں ہو سکتا...... سالار کو گیمز میں دلچسپی ہے، اسے اس میں انعام ملتے ہیں۔"

رضا مجھے سمجھاتے جب میں سالار کو ڈانٹتی۔

"آپ کو کیا پتا...... اسی سولہ گریڈ کی جاب



پریشان سے بیٹھے ہیں۔" میں ازلی تنک مزاجی سے کہتی۔

وہ بڑبڑا کر ٹاک شو کی طرف متوجہ ہوجاتے اور میں سالار کے رپورٹ کارڈ کو گھورتی جس پر پاسنگ مارکس میرا جی جلاتے۔

امن نے بی ایس سی کیا تو میں نے اس کی نسبت اپنے بھائی کے گھر ٹھہرادی۔

رضا بالکل راضی نہ تھے۔ مرتضٰی نے بھی سمجھانا چاہا۔ امن گم صم، لیکن میں جو فیصلہ ایک بار کرلیتی اسی کو ٹھیک سمجھ کر قائم رہتی۔

"مما! سمیر غیر ذمہ دار ہے۔ تیز مزاج، گھر کا ماحول دیہاتی ہے۔ امن کیسے رہے گی؟" صرف مرتضٰی مجھ سے بحث کرسکتا تھا۔

"میں ماں ہوں اور ماں کبھی دشمن نہیں ہوتی۔" میں نے ازلی بے نیازی سے کہا تھا۔

"آپ ماں بن کر نہیں ایک ضدی عورت بن کر فیصلے مسلط کرتی ہیں۔" سالار بدتمیز تھا۔ چڑچڑا بھی۔ اللہ جانے اس کے رویے کے پیچھے کیا داستان تھی۔ میں نے کبھی سوچنے کی کوشش ہی نہ کی تھی۔

گھر میں تناؤ پھیلا...... امن نے میرے فیصلے کے آگے سر جھکا دیا۔

امن کی شادی ہوگئی۔ مرتضٰی کے خدشات درست تھے۔ مجھے اب احساس ہو رہا تھا۔

امن چپ چپ رہتی۔ جب میکے آتی۔ باپ کے پاس بیٹھ جاتی۔ دونوں باتیں کرتے، کبھی اس کی بھیگی پلکیں بے چین کرتیں۔ لیکن اس نے مجھے حالِ دل کبھی نہ بتایا۔ میں پوچھتی۔

"بیٹا! ٹھیک ہوناں؟"

"جی" وہ مختصر جواب دے کر ٹی وی کی طرف متوجہ ہوجاتی۔ رضا کی آنکھوں میں شکوہ ہوتا۔ لیکن میں انہیں کبھی خاطر میں نہ لاتی۔ سالار باہر جانے کی کوششوں میں تھا۔ یہ بات مجھے ایک کولیگ سے معلوم ہوئی۔ جن کا بیٹا سالار کا قریبی دوست تھا۔

"حیرت ہے آپ بے خبر ہیں۔" ان کی

آنکھوں میں استہزاء کی چمک تھی۔ مجھے توہین کا احساس ہوا...... اور یہ احساس گھر آ کر کشیدگی کی صورت اختیار کر گیا۔

"یہ میری انسلٹ ہے مجھے اپنے گھر کی خبریں باہر سے معلوم ہوں۔" میں ٹہل رہی تھی۔

"مجھ سے مشورہ کیا تھا اس نے۔" رضا نے رسانیت سے کہا۔

"آپ نے مجھے بتایا نہیں۔" میں حیرت زدہ تھی۔

"وہ کہہ رہا تھا، سرپرائز دوں گا۔" رضا مجھے ٹھنڈا کر رہے تھے۔ کاش وہ روایتی مردوں کی طرح مجھے کہتے۔ "میرے فیصلے کے آگے مت بولو......"

یہ سارے کاش عمر کے اس حصے میں آ کر کیوں ستاتے ہیں بھلا؟؟

مجھے غصہ تھا۔ سالار نے بتایا نہیں...... سالار کا موقف تھا، آپ جانے نہ دیتیں۔ امن کا خیال تھا سالار باہر جائے۔ شاید مزاج میں بہتری آ جائے۔

ایسے میں مرتضیٰ نے مجھے پرسکون کیا...... ہم۔ ماں بیٹے میں صلح کروائی...... بہرکیف جس دن اس کی فلائٹ تھی، وہ رضا کے گلے لگ کر رو دیا۔

"پپا! آپ کے بغیر نیند نہیں آئے گی۔" وہ شروع سے ان کے قریب تھا، رضا اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے رہے میرے پاس آیا تو رسمی سا سر جھکا کر ملا مجھے سبکی کا احساس ہوا بالخصوص رضا کے سامنے...... لیکن سب نارمل تھے۔

اس نے ایک بار نہ کہا۔ ماما! آپ یاد آئیں گی۔ مجھے گلہ ہوا......

بچوں کی تعلیم پر میری تنخواہ کا کثیر حصہ لگتا تھا۔ ......لوگ مجھے ایک مضبوط، کامیاب عورت کی حیثیت سے جانتے تھے...... لیکن جذباتی پل یا رشتہ مجھ میں اور میری فیملی میں نہ تھا۔ اس کا احساس اب ہوتا ہے۔ خاندان اور رشتے مضبوط کرنے کے لیے دلی تعلق ضروری ہے جو ہمارے گھر میں ناپید تھا۔

سالار کینیڈا چلا گیا۔ امن سسرال میں ایڈجسٹ ہونے کی کوشش کرتی رہتی......

رضا ریٹائرڈ ہو گئے تھے۔ جہاں سے چلے تھے وہیں سے ریٹائرڈ ہو گئے...... گھر میں رہتے۔ مرتضیٰ کامیاب تھا ویسا ہی جیسے میرے خواب تھے۔

"میرا بچہ" میں اس کا ماتھا چومتی۔ "میرے خواب اس نے پورے کیے ہیں" میں برملا کہتی۔

"اب بہو لے آئیں۔" ملنے جلنے والے کہتے میں خوش دلی سے سر ہلاتی۔

آخر ایک فیصلے پر پہنچ کر میں مطمئن ہو گئی۔ مجھے مرتضیٰ کی تابع داری پر یقین تھا۔ وہ کبھی مجھے انکار نہیں کرے گا۔

میں نے مسکراتے ہوئے سوچا......اور سنڈے کا دن منتخب کیا۔ اس روز فراغت ہوتی سو بات آسانی سے ہو جاتی۔

آج جمعرات تھی، اتوار آنے میں دو روز باقی تھے۔ میں نے نمبر ملایا۔

☆☆☆

میں نے ناشتے کے بعد ہلکے پھلکے انداز میں اس تک اپنی خواہش پہنچائی تھی۔ لیکن جو ماحول بنا، وہ غیر متوقع تھا۔

"میں نے ہمیشہ آپ کے فیصلوں کا احترام کیا ہے لیکن میں انہیں اپنی زندگی پر مسلط نہیں کروں گا۔ نو...... نیور......"

یہ چہرہ مرتضیٰ کا نہیں تھا! قطعاً نہیں۔ اس کے پتھریلے سرد تاثرات اجنبیت میں ڈھلے ہوئے تھے۔ میں تو ہمیشہ اس کی محبت، توجہ کی عادی تھی۔ اب یہ بیگانگی سہہ نہیں پا رہی تھی۔

"بیٹا!" ممتا کمزور ہوتی ہے۔ لمحے میں بکھر جاتی ہے۔ پگھل جاتی ہے اور اس کا اندازہ مجھے آج ہو رہا تھا۔

"مجھے آپ کا فیصلہ نہیں قبول......" اس نے دوٹوک انداز اختیار کیا تھا۔

"کیوں؟ کیا خرابی ہے بھلا۔" میں نے زچ ہو کر پوچھا تھا۔

"آپ اپنی ذات میں قید ہیں۔ خود سے آگے کسی کو نہیں دیکھ سکتیں۔ مما! آپ چاہتی ہیں، آپ کے فیصلے بس تسلیم کیے جائیں۔ اچھے یا برے......"

اس کے لہجے میں گلہ سمٹ آیا تھا۔

"تمہیں رضا نے سکھایا ہے ناں......" میں نے وثوق سے کہا تھا۔

"یہ شخص میری کامیابیوں سے ہمیشہ خائف رہا ہے۔ اس کے احساس کمتری نے اسے کبھی میرے سامنے سر نہیں اٹھانے دیا۔ اب، اب وہ تمہیں مجھ سے دور کر رہا ہے بیٹا!"

میں بے ربط سا بول رہی تھی اور اس کا احساس مجھے خود بھی ہو رہا تھا۔ میں وہی آموختہ دہرانے لگی جو روز ازل سے میں نے ازبر کر رکھا تھا۔

"پلیز مما! پپا کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔" اس کے لہجے میں بے زاری در آئی تھی۔

"اور یہ غلط فہمی دور کر لیں کہ انہیں آپ سے حسد ہے یا احساس کمتری۔ یہ پپا کی حلیم طبیعت ہے جو آپ کا گھر قائم ہے۔ چاہے اندرونی طور پر ٹوٹا پھوٹا شکستہ لیکن معاشرے کے سامنے بھرم تو قائم ہے ناں۔"

مجھے اس کے لہجے میں آنسوؤں کی نمی محسوس ہوئی تھی۔ میں نے تڑپ کر سر اٹھایا تھا۔ یہ کیسا آئینہ تھا جو میری اولاد نے میرے سامنے دھر دیا تھا۔

"آخر ردا میں کیا خرابی ہے۔ شکل صورت تعلیم، مقام ہر چیز میں وہ تم سے ایک قدم آگے ہے۔ ماحول تمہارا دیکھا بھالا ہے۔ ماموں تمہیں پسند کرتے ہیں۔ ان کا سب کچھ تمہارا ہے بیٹا!"

میں نے اسے کامیاب وکیل کی طرح دلائل دینے شروع کیے تھے۔ مجھے یقین تھا میں اسے مزید قائل کر سکتی ہوں اور وہ ہمیشہ کی طرح "اٹس اوکے" کہہ کر مان رکھ لے گا۔ لیکن مرتضیٰ نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے مزید کچھ کہنے سے روک دیا تھا۔

اس کا یہ رویہ میری انا پر کاری ضرب تھا۔

اس کے لہجے کا بدلاؤ...... بدلے تیور میرے دماغ میں الارم بجنے لگا تھا۔

میرے فیصلے اور میری رائے ہمیشہ صائب تسلیم کی جاتی تھی۔ سب کا خیال تھا میرے فیصلے دور رس ہوتے ہیں اور آج مجھے یعنی میری ذات کو رد کرنے والا کوئی اور نہیں بلکہ میری اپنی چہیتی اولاد تھی۔ جس کی تابع داری پر مجھے ہمیشہ فخر رہا تھا۔

"کیا عیب ہے اس میں؟" میں نے زچ ہو کر کہا۔

"اس میں کوئی عیب نہیں ہے۔" اس کے لہجے میں لاپروائی تھی۔

"پھر؟" میں نے استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

"اچھی بھلی لڑکی کو کیوں ٹھکرا رہے ہو تم۔" میں رونکھی ہو گئی تھی۔ وجہ وہ یقین تھا جو میں نے بھائی بھابی کو دلا رکھا تھا۔

چند لمحے سرکے۔

وہ مجھے ترحم آمیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"وجہ جاننا ضروری ہے۔" اس نے پوچھا۔

"ہاں!" میں گرہ کھولنا چاہتی تھی۔ اس نے چند ثانیے رک کر سوچا۔

"میں پپا جیسی زندگی نہیں گزارنا چاہتا، جھک کر...... خاموش رہ کر...... اور ردا بالکل آپ جیسی ہے۔"

اپنی بات کہہ کر وہ رکا نہیں۔

اس نے میرے تاثرات دیکھنے کی بھی زحمت نہ کی تھی، جہاں بے یقینی، صدماتی کیفیت تھی اور میں ایک ہی جملے کی بازگشت سن رہی تھی۔

"ردا بالکل آپ جیسی ہے۔"

کوئے ستم کی خامشی آباد کچھ تو ہو
کچھ تو کہو ستم کشو فریاد کچھ تو ہو
بیداد گر سے شکوۂ بیداد کچھ تو ہو
بولو کہ شورِ حشر کی ایجاد کچھ تو ہو

مرنے چلے تو سطوتِ قاتل کا خوف کیا
اتنا تو ہو کہ باندھنے پائے نہ دست و پا
مقتل میں کچھ تو رنگ جمے جشنِ رقص کا
رنگیں لہو سے پنجۂ صیاد کچھ تو ہو
خوں پر گواہ دامنِ جلاد کچھ تو ہو
جب خوں بہا طلب کریں بنیاد کچھ تو ہو

گر تن نہیں زباں سہی، آزاد کچھ تو ہو
دشنام نالہ ہاؤ ہو فریاد کچھ تو ہو
چیخے ہے درد اے دلِ برباد کچھ تو ہو
بولو کہ شورِ حشر کی ایجاد کچھ تو ہو
بولو کہ روزِ عدل کی بنیاد کچھ تو ہو

فیض احمد فیض

منسوب چراغوں سے طرفدار ہوا کے
تم لوگ منافق ہو، منافق بھی بلا کے

کیوں ضبط کی بنیاد ہلانے پہ تُلا ہے
میں پھینک نہ دوں ہجر تجھے آگ جلا کے

اک خود فراموش کی بے فیض محبت
جاؤں گی گزرتے ہوئے راوی میں بہا کے

اس وقت مجھے عمرِ رواں درد بہت ہے
تجھ سے میں تمنّی ہوں خدا دیر میں آ کے

زنجیر نہیں ہوتے تعلق کہ جکڑ لوں
جانا ہو تو پھر جاؤ ابھی ہاتھ چھڑا کے

میں اپنے خد و خال ہی پہچان نہ پائی
گزرا ہے یہاں وقت بڑی دھول اڑا کے

کرتی ہوں ترو تازہ ہری رُت کے مناظر
کاغذ پہ کبھی پیڑ کبھی پھول بنا کے

کومل جوئیہ

شگفتہ جاہ

رنگ برنگے پھول

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

حضرت عطا بن یسار رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا۔ میں نے حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے سوال کیا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک میں تم لوگوں میں قربانیاں کس طرح ہوتی تھیں؟"

انہوں نے فرمایا۔

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں آدمی اپنی طرف سے اور اپنے گھر والوں کی طرف سے ایک بکری کی قربانی کر دیا کرتا تھا۔ (اس میں سے) وہ خود بھی کھاتے اور دوسروں کو بھی کھلاتے۔ بعد میں لوگ فخر کے طور پر زیادہ جانور قربان کرنے لگے تو وہ حال ہو گیا جو آپ (آج کل) دیکھ رہے ہیں۔

(ترمذی)

فوائد و مسائل:۔

1۔ جن لوگوں کا کھانا پینا اور خرچ مشترک ہو، وہ ایک گھر کے افراد ہیں۔ ان کی طرف سے ایک بکری کی قربانی دینا، یا گائے یا اونٹ کا ایک حصہ قربانی دینا کافی ہے۔

2۔ ایک سے زیادہ قربانیاں کرنا جائز ہیں لیکن تفاخر اور مقابلہ بازی کے انداز سے زیادہ جانور یا قیمتی جانور قربان کرنا قربانی کے اصل مقصد کو ختم کر دیتا ہے۔ اس صورت میں کوئی ثواب نہیں ہوتا۔

3۔ کسی بھی نیکی میں نیت کا صحیح ہونا اور دل کا خلوص لازمی شرط ہے۔

مارشل لاء اور ادیب،

کافی ہاؤس میں ایک تختی نصب کر دی گئی "حضرات سیاسی گفتگو سے اجتناب کریں۔" شام کو میں ٹی ہاؤس پہنچا تو معمول کے خلاف خاموشی کا سماں تھا۔ باتیں ہو رہی تھیں۔ مگر بہت احتیاط کے ساتھ۔ کوشش کی کہ مارشل لاء کو موضوع بحث نہ بنایا جائے۔ مگر پھر ہوا یوں کہ کسی نے مارشل لاء پر کوئی اڑتا سا تبصرہ کیا۔ کسی نے گول مول فقرہ کہا۔ کسی نے اشاراتی انداز میں کوئی بات کی۔ رفتہ رفتہ حجاب اٹھتا گیا۔ اور جب گیارہ بجے کے قریب ٹی ہاؤس بند ہو رہا تھا تو بحث اپنے عروج پر تھی کہ مارشل لاء صحیح لگا ہے یا غلط لگا ہے۔

اگلے دن شام کو جب ہم جمع ہوئے تو دفعتاً حسن لطیفی ایک اشتہار قسم کی چیز ہاتھ میں لیے اندر داخل ہوئے۔ ہم سے منہ موڑ کر سامنے آویزاں بلیک بورڈ کے پاس آ گئے۔ اس پر اشتہار چسپاں کیا۔ پھر بیرے سے کچھ بات کی، وہ لپک جھپک اندر گیا اور دو توس لے کر پلٹا۔ لطیفی صاحب نے توس لیے اور خاموشی سے باہر نکل گئے۔ باہر ایک کتا ان کا انتظار کر رہا تھا۔

ان کے جانے کے بعد ہم نے بلیک بورڈ پر جا کر دیکھا کہ کیا اشتہار ہے۔ لطیفی صاحب کی تازہ ترین نظم تھی۔ عنوان تھا۔

واقعہ خوب ہوا، خوب ہوا، خوب ہوا

ساتھ میں جنرل ایوب خان کی وردی میں تصویر۔ یہ شاعر کی طرف سے مارشل لاء کا خیر مقدم تھا اور ایوب خان کو خراج تحسین۔

تیسرے چوتھے دن انجم رومانی غزل لکھ کر لائے۔ اس کا لہجہ دوسرا تھا۔

بیدار اہل قافلہ سونے کے وقت گئے
ہشیار کہ آگ میں ہے یہ جنگل گھرا ہوا

ہاں دیکھ کر ذرا کہ اندھیرا ہے راہ میں
ہاں تیز تر قدم کہ بادل گھرا ہوا

اس دور کی بساط پہ ہر شاہ کو ہے مات
گھبرائیے نہ دیکھ کر پیدل گھرا ہوا

انجم صاحب سیدھے سادے آدمی، جلدی گھبرا جاتے تھے۔ یاروں نے انہیں ڈرایا۔

"انجم صاحب پکڑے جاؤ گے، یہ تو مارشل لاء کے خلاف غزل ہے۔"

انجم صاحب بہت پریشان ہوئے۔ وہ تو یہ غزل لیل و نہار میں چھپنے کے لیے دے آئے تھے۔ فوراً وہاں گئے۔ غزل کے نیچے نوٹ لکھ آئے۔

"یہ غزل 7-اکتوبر سے پہلے لکھی گئی تھی۔"

جب پرچا چھپ کر آیا اور یاروں نے یہ نوٹ پڑھا تو انہوں نے انجم صاحب کو مزید ڈرایا۔

"انجم صاحب! یہ نوٹ دے کر تو آپ نے مارشل لاء حکام کو دعوت دی ہے کہ اس غزل کو پڑھو۔ اب تو وہ اس غزل کو خاص طور پر پڑھیں گے۔"

(چراغوں کا دھواں - انتظار حسین)

اگر سمجھو تو،

☆ سوچنا اور غور و فکر کرنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بہت کم لوگ اس کی زحمت گوارا کرتے ہیں۔

(ہنری فورڈ)

☆ کسی ادارے کو نااہل لوگ تباہ نہیں کرتے بلکہ وہ لوگ تباہ کرتے ہیں جو کچھ کامیابی حاصل کر کے اس کو بہت کچھ سمجھ کر بیٹھ جاتے ہیں اور مزید ترقی کا راستہ روک دیتے ہیں۔

(ایف-ایم-ڈرینگ)

☆ لوگوں سے نرمی کا سلوک کرو۔ یاد رکھو کہ تم جس کسی سے بھی ملتے ہو، وہ زندگی کی جنگ لڑ رہا ہوتا ہے جو ایک سخت جنگ ہے۔

(تھامس)

☆ محبت، دوستی اور احترام لوگوں کو آپس میں اتنا متحد نہیں کرتے جتنا کسی سے نفرت انہیں متحد کر دیتی ہے۔

(چیخوف)

تمہیں کیوں دوں؟

ایک امریکی کروڑ پتی سے ایک خیراتی ادارے کا رضاکار چندہ مانگنے آیا۔ رضاکار پوری تیاری کر کے گیا تھا۔ کروڑ پتی سے کہنے لگا۔

"جناب! ہماری اطلاع کے مطابق فلاں بینک میں آپ کے اتنے کروڑ اور فلاں بینک میں اتنے کروڑ جمع ہیں۔ فلاں ریاست میں اتنی زمین اور فلاں شہر میں اتنی عمارتیں ہیں۔ بے شمار کارخانوں میں آپ حصہ دار ہیں مگر آپ نے کبھی کسی خیراتی ادارے کو کچھ نہیں دیا؟"

کروڑ پتی نے بڑے تحمل سے ساری بات سنی اور پھر خیراتی ادارے والے سے کہنے لگا۔

"تمہاری معلومات مکمل طور پر درست ہیں مگر کیا تمہیں اس بات کا علم ہے کہ میری ماں فلاں شہر میں اکیلی رہتی ہے، اس کی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں۔"

رضاکار بولا۔ "نہیں جناب، مجھے علم نہیں۔"

کروڑ پتی نے کہا۔ "اور کیا تمہیں علم ہے کہ میرا بھائی معذور ہے، جو خود کچھ نہیں کر سکتا۔"

رضاکار شرمندہ ہو گیا۔ کہنے لگا۔ "نہیں سر! مجھے پتا نہیں تھا۔"

کروڑ پتی نے کہا۔ "اور تمہیں پتا ہے کہ میری بہن اپنے بچوں کے ساتھ رہتی ہے۔ ان کا کمانے والا بھی کوئی نہیں۔"

رضاکار بولا۔ "میں بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے پتا ہوتا کہ آپ پہلے ہی اتنے لوگوں کو پال رہے ہیں تو میں قطعاً آپ کے پاس نہ آتا۔"

کروڑ پتی گرج کر بولا۔ "اصل بات یہ ہے کہ

کروڑپتی گرج کر بولا: "یہ بات نہیں اصل بات یہ ہے کہ میں اپنے تمام غریب رشتے داروں کو کچھ نہیں دیتا تو تمہیں کیوں دوں؟"

محبت کو ضرب دیا کرتے ہیں

اشفاق احمد کہتے ہیں
"میرا پہلا بچہ میری گود میں تھا۔ میں باغ میں بیٹھا تھا اور مالی کام کر رہے تھے۔ ایک مالی میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔
"ماشاء اللہ بہت پیارا بچہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی عمر دراز کرے۔"
وہ کہنے لگا۔ "میرے آٹھ بچے ہیں۔"
جب اس نے آٹھ بچوں کا ذکر کیا تو میں نے کہا۔
"اللہ ان سب کو سلامت رکھے لیکن میں اپنی محبت کو آٹھ بچوں میں تقسیم کرنے پر تیار نہیں ہوں۔"
یہ سن کر مالی مسکرایا اور میری طرف چہرہ کر کے کہنے لگا۔
"صاحب جی! محبت تقسیم نہیں کیا کرتے، محبت کو ضرب دیا کرتے ہیں۔"

مدعی

یہ کیسی منصفی تھی کہ منصف کے روبرو
جھوٹی شہادتوں کو بھی سچا لکھا گیا
ہم چپ رہے کہ فیصلہ سارا تھا طے شدہ
یعنی جو مدعی نے لکھایا، لکھا گیا

سنہری حرف

جس برتن میں جو چیز ہوتی ہے وہی اس سے چھلکتی ہے۔ لہٰذا جو کچھ تیرے قلب میں ہوگا وہی تیرے اعضا پر چھلکے گا۔

برابر کے حقوق

(نوجوان لڑکا ہونے والی دلہن سے)
"میں خود چاہتا ہوں کہ عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق حاصل ہوں۔ اب تم بھی مجھے ہیرے کی ایک انگوٹھی پیش کرو۔"

موبائل

طلحہ پٹرول پمپ پر گیا۔ وہاں لکھا تھا کہ یہاں موبائل کا استعمال نہ کریں۔
"پھر؟"
"پھر کیا۔ طلحہ نے سب کو فون کر دیا اور کہا کہ مجھے ابھی فون مت کرنا میں ابھی پٹرول پمپ پر ہوں۔"

مجبوری

پروفیسر صاحب نہایت خوش اخلاق، متحمل مزاج اور شائستہ تھے مگر ایک محفل میں ویٹر نے غلطی سے گرم گرم سالن کا ڈونگا ان کی گود میں الٹ دیا۔ انہوں نے تکلیف ضبط کرتے ہوئے صبر و تحمل سے ادھر ادھر دیکھا اور رکتی رکتی سی آواز میں کہا۔
"محفل میں اگر کوئی بداخلاق اور بدزبان آدمی موجود ہو تو براہ مہربانی اس ویٹر کو کھری کھری سنا دے۔"
عائشہ۔ گوجرہ

محبت

امریکا کے دریا سی بی پی کے بارے میں مارک ٹوئن کہتے ہیں کہ شروع میں جب میں نے اسے دیکھا، اس میں وہ تمام حسن دکھائی دیا کہ میں خوش ہو اٹھا۔ پھر جب وہ دریا چلنے والی موٹر کشتیوں کا ملاح بن گیا۔ تو دریا سے وہ شاعرانہ تعلق ختم ہو گیا۔ محبت بھی تو اکثر ان لوگوں سے زیادہ کی جاتی ہے جو ساتھ نہیں رہتے۔
اقرا۔ کراچی

خواتین کی ڈائری

امۃ الصبور

زرینہ خانم لغاری — کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر قتیل شفائی کی یہ غزل آپ سب بہنوں کے لیے

رات کے سناٹے میں ہم نے کیا کیا دھوکے کھائے ہیں
اپنا ہی جب دل دھڑکا تو ہم سمجھے وہ آئے ہیں

بند جھروکے سونی کلیاں یا پھر غم کے سائے ہیں
چاند ستارے نکلے ہیں لیکن میرے لیے کیا لائے ہیں

جس دن سے تم بچھڑ گئے یہ حال ہے اپنی آنکھوں کا
جیسے دو بادل ساون کے آپس میں ٹکرائے ہیں

اب تو راہ نہ بھولو گے تم اب تو ہم سے آن ملو
دیکھو ہم نے پلک پلک پر سو سو دیپ جلائے ہیں

ہائے قتیل اس تنہائی میں کیا سوجھی موسم کو
جس دن سے وہ پاس نہیں اس دن سے بادل چھائے ہیں

ناہید اسماعیل — کی ڈائری سے

ایک پرانی ڈائری میں تحریر حبیب جالب کی یہ غزل موجودہ حالات پر فٹ بیٹھتی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

اب گناہ و ثواب بکتے ہیں
مان لیجیے جناب بکتے ہیں

پہلے پہلے غریب بکتے تھے
اب تو عزت مآب بکتے ہیں

بے ضمیروں کی راج نیتی میں
جاہ و منصب خطاب بکتے ہیں

شیخ، واعظ، وزیر اور شاعر
سب یہاں پر جناب بکتے ہیں

دور تھا، انقلاب آتے تھے
آج کل انقلاب بکتے ہیں

دل کی باتیں حبیب جھوٹی ہیں
دل بھی خانہ خراب بکتے ہیں

سلمیٰ حامد — کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر یہ غزل مجھے بہت پسند ہے۔ امید ہے آپ کو بھی پسند آئے گی۔

سرمئی بادلوں کے پیچھے ہے چاند یخ بستہ
سرد ہوا کے ہاتھوں میں پھول دل شکستہ

قدموں کی گونج سے آباد تھا کبھی
اب منظر ہے کب سے سنسان سرد رستہ

سردی نے کھینچ لی ہیں طنابیں اڑان کی
پرندے بھی شجر پہ ہیں خاموش لب بستہ

ٹھنڈی ہیں صبح شامیں ٹھنڈے ہیں سارے جذبے
ہر شخص نیم مردہ، ہر شخص دل گرفتہ

ہر مشکل کا حل بھی اب خود کھوجنا ہے
وہ جو ملا ہے ہم کو جو گھٹ ہے اس کی خستہ

کاوشوں میں مسلسل سب پھول پودے جنگل
سردی کا یہ لبادہ اترے گا بہت آہستہ

روحیلہ خان — کی ڈائری سے

قمر جلالوی میرے پسندیدہ شاعر ہیں۔ ان کی یہ غزل آپ سب کی نذر۔

دیکھیے ہو گئی بدنام مسیحائی بھی
ہم نہ کہتے تھے کہ ٹلتی ہے کہیں آئی بھی

تم بھی دیوانے کے کہنے کا برا مان گئے
ہوش کی بات کہیں کرتے ہیں سودائی بھی

بال و پر دیکھ تو لو اپنے اسیران قفس
کیا کرو گے جو گلستاں میں بہار آئی بھی

پاؤں وحشت میں کہیں رکتے ہیں دیوانوں کے
توڑ ڈالیں گے یہ زنجیر جو پہنائی بھی

اے قمر وہ نہ ہوئے دیکھیے تقدیر کی بات
چاندنی رات جو قسمت سے کبھی آئی بھی

حبیبہ خان — کی ڈائری سے

اپنی ڈائری سے آپ کے لیے اتباف ابرک کی اس غزل کا انتخاب کیا ہے۔ اس توقع کے ساتھ کہ آپ کو بھی پسند آئے گی۔

شہ رگ پہ یارِ غار کی تلوار دیکھ کر
دل بجھ گیا نوشتۂ دیوار دیکھ کر

پھر کیوں نہ سارے فیصلے میرے خلاف ہوں
کرتا نہیں میں گفتگو دربار دیکھ کر

ہم پہ گرا دی آپ نے دیوار شکریہ
بیٹھے تھے ہم تو سایۂ دیوار دیکھ کر

فرمان شاہ کا ہے کہ حالات ٹھیک ہیں
پھر دل ہنسا ہوں آج کا اخبار دیکھ کر

نسخہ گروں کے پاس تو نسخہ ہی ایک ہے
کرتے ہیں کب علاج یہ بیمار دیکھ کر

اتنا یقین دلایا یقین آ گیا ہمیں
پھر خود وہ پھر گیا ہمیں تیار دیکھ کر

ایسا نہیں کہ روشنی آئی نہ در سے
معصوم لوٹ جاتی ہے گھر بار دیکھ کر

ابرک خطا نہیں تھی قلم کی کوئی ترے
بدلی گئی کہانی اداکار دیکھ کر

ماہ نور عثمان — کی ڈائری سے

کچھ یادگارِ شہرِ ستم گر ہی لے چلیں
آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں

یوں کس طرح کٹے گا کڑی دھوپ کا سفر
سر پر خیالِ یار کی چادر ہی لے چلیں

رنجِ سفر کی کوئی نشانی تو پاس ہو
تھوڑی سی خاک کوچۂ دلبر ہی لے چلیں

یہ کہہ کے چھیڑتی ہے ہمیں دل گرفتگی
گھبرا گئے ہیں آپ تو باہر ہی لے چلیں

اس شہرِ بے چراغ میں جائے گی تو کہاں
آ اے شبِ فراق تجھے گھر ہی لے چلیں

خالدہ جیلانی

میری بیاض سے

غنساء احمد ——— بفرزون

وسعتوں میں لوگ کھو دیتے خود اپنا شعور
اپنی حد میں آئیے اور آگہی بن جائیے

حبیبہ خان ——— کراچی

ساری عمر لکھتے رہے پھر بھی ورق سادہ ہی رہا
جانے وہ کیا لفظ تھے جو ہم سے نہ تحریر ہوئے

انعم طلحہ ——— کراچی

مجھے تھا زعم میں بکھر گیا محسن
وہ ریزہ ریزہ بکھرتا مگر اپنے اختیار میں تھا

———

کہیں الفاظ خالی ہو گئے ہیں
کہیں لہجوں میں ویرانی بہت ہے

ریحانہ نوقاص ——— لاہور

ہاتھ پھیلائے نہ مانگا کبھی مکاری سے
زندگی ہم نے گزاری بڑی خودداری سے

طاہرہ حمزہ بلوچ ——— ستانواں

کبھی کبھی یونہی رو پڑتی ہیں آنکھیں
اداس ہونے کا کوئی بھی سبب نہیں ہوتا
میں اپنے دل کی یہ بات کیسے سمجھاؤں فراز
کہ کسی کو چاہنے سے کوئی اپنا نہیں ہوتا

طاہرہ جاوید ——— کراچی

اب میسر کہاں ہیں خود کو بھی
ہاں تیرے بے حساب تھے جب تھے

اسبر نادی ——— ہری پور

ممکن نہیں کہ ساتھ نبھائیں تمام عمر
ممکن بھی کس طرح ہو کہ دونوں دو راہی ہیں
ہم ان دنوں بہت سے مسائل میں ہیں گھرا
تجھ کو بچھڑنا ہے تو یہ دن بہترین ہیں

بشریٰ خان ——— حیدرآباد

کبھی کبھی آرزو کے صحرا میں آ کے رکتے ہیں قافلے سے
وہ ساری باتیں لگاؤ کی تھی وہ سارے عنوان وصال کے

ذمل مزمل گجر ——— بہاولپور

یاد کر رہی ہے ترسی ہوئی نگاہ
دیکھے ہوئے کسی کو زمانہ گزر گیا

ماریہ سلطان ——— ملتان

ہر دکھ ہر غم کو بھول جائیں ہم
تم جو آؤ تو عید منائیں ہم
سنبھال رکھے ہیں لفظوں کے موتی
دامن دل پھیلاؤ تو برسائیں ہم

حفصہ احمد ——— لاہور

اگر جینے کا دل میں حوصلہ ہو
کوئی مشکل نہ کوئی مسئلہ ہو

ناہید اسماعیل ——— کراچی

کوئی تدبیر کرو وقت کو روکو یارو
صبح دیکھی نہیں، شام ہوئی جاتی ہے

حمیرا لعل ——— شورکوٹ کینٹ

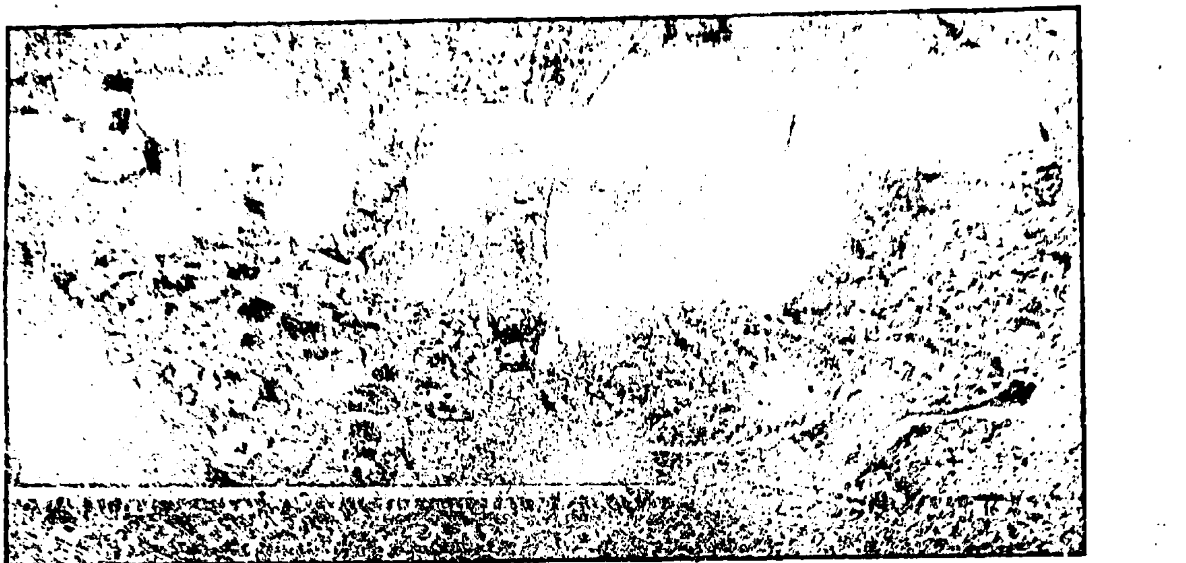
تیری عدالتوں کی شہرتیں بجا لیکن
میرا چمن اجڑ گیا تیرے فیصلوں کے بعد

ملیحہ نورین ——— گجرات

جو فطرتاً خراب ہیں، ان کا تو حل نہیں
جو بھٹک گئے ہیں ان کے لیے، مت عذاب کر
بے لوث چاہنے والے سمجھ لے تو خود کو مت الجھا
جو بات خود بخود ہی بنے، مت خراب کر

سعدیہ عامر ——— بورے والا

ہاتھ گل ہوتے چلتے ہو فراز اس سے ملے کیا
اتنی سی خوشی سے کوئی مر بھی نہیں جاتا



آپ کا باورچی خانہ

ندا چوہدری

(نداچوہدری......رحیم یار خان)

1۔ کھانا پکاتے وقت پسند ناپسند کو ہی مدنظر رکھنا پڑتا ہے۔ ذائقہ پہلے صحت بعد میں، جب گرما گرم مزیدار پکوڑے، خستہ سموسے، پوریاں، کچوریاں سامنے ہوں تو یہ بات یکسر فراموش کردی جاتی ہے کہ ابھی ابھی یہ سب تیل کی کڑاہی میں "غوطہ زن" ہوکر آئے ہیں بھلے ہی کھا کھا کر توند نکل آئے لیکن ذائقہ بہر حال پہلے ہے۔ لیکن یہ بھی نہیں ہے کہ صحت کا خیال نہیں ہے، یہ پکانے والے کی ذمہ داری ہے۔ آئل کولیسٹرول فری استعمال کیا جاتا ہے، اور ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے کہ زیادہ اسپائسی (چٹ پٹا) کھانا نہ بنایا جائے۔

2۔ مہمان تو ہمیشہ بغیر بتائے ہی آتے ہیں اور شاید مزا بھی تب ہی آتا ہے جب نانو یا شازی آنٹی یا چاچی لوگ یا ایسے ہی کوئی عزیز اچانک آجاتے ہیں، تب سرپرائز بڑے مزے کا لگتا ہے۔ (بشرطیکہ گرمیوں کی تپتی دوپہر میں اپنے فیورٹ رسالے کے ساتھ نیم دراز نہ ہوں) خیر مہمان آئیں اور تواضع نہ ہوا ایسا تو ہی نہیں سکتا۔ ہنگامی حالت، میں نمکو، کباب، کولڈ ڈرنکس بسکٹ، کیک، چائے وغیرہ سے تواضع کی جاتی ہے اور ساتھ میں ہمارے چٹکلے، نئی تازی، کچھ ان کی کچھ اپنی، جو خاصی حد تک مہمانوں کو مصروف رکھنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ اتنے میں فٹا فٹ کڑاہی گوشت، پلاؤ، بریانی (زیادہ تر پلاؤ) میں سے کچھ بھی ضرورت کے مطابق بنالیا جاتا ہے۔ ایک چولہے پر پلاؤ، ایک پر کڑاہی گوشت رکھو، پچیس تیس منٹ میں کھانا تیار، اب اتنا انتظار تو مہمانوں کا فرض اور ہمارا حق بنتا ہے ناں!

3۔ کچن کی صفائی کے لیے کوئی خاص اہتمام تو نہیں کرنا پڑتا۔ چولہا، شیلف، کچن کا فرش، مسالوں کے ڈبے، یہ سب چیزیں تو روزانہ ہی صاف ہوتی ہیں کہ ناشتے کے بعد کچن جنگ کا سماں پیش کررہا ہوتا ہے جو اپنی "تباہی کے اثرات" پیچھے چھوڑ گئی ہو۔ اس کے علاوہ فریج کی صفائی، کیبنٹ کے اخباروں کی تبدیلی، کچن کی دیواروں کی صفائی، اضافی اہتمام ہے جو "فرصت" میں کیا جاتا ہے۔

4۔ صبح اور ناشتہ تو ایسے لازم وملزوم ہیں جیسے رات کے ساتھ تارے اور دن کے ساتھ سورج۔ کم

ازکم ہمارے گھر میں تو ناشتا بہت ضروری ہے۔ سب کی پسند تقریباً ایک جیسی ہے (صرف ناشتا کی حد تک) وہ ہے پراٹھا، ساتھ میں رات کا سالن، یا دہی یا چائے یا پھر اچار اور زیادہ ہوا تو آملیٹ۔ سب ہی ناشتے میں پراٹھا لیتے ہیں سوائے مما اور پاپا کے وہ دونوں سادہ روٹی ہی پسند کرتے ہیں۔ ویسے کچھ عرصے پہلے تک میں آملیٹ بہت اچھا بنا لیتی تھی (اب تو ماشاء اللہ بہت کچھ بنانا آتا ہے) لیکن چند ناخوشگوار واقعات نے یہ "حق" مجھ سے چھین لیا ہے۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ شروع میں جب میں پکانا سیکھ رہی تھی (تب میرا پکایا ہوا کھانا پاپا نے بھی نہیں کھایا تھا) تب مما کو ضروری کام سے کہیں جانا پڑ گیا۔ اسی دن پاپا لنچ کرنے گھر آ گئے (عموماً دکان پر ہی کر لیتے تھے) اب میں پریشان کہ کیا دوں کہ کھانا تو مما نے بنایا ہی نہیں تھا۔ جلدی سے آسٹریلوی نقشے کی، دو روٹیاں پکائیں اور آملیٹ بنایا جس میں نمک "کچھ" زیادہ ہو گیا۔ کھانے کے بعد پاپا نے بڑے پیار سے کہا۔

"بیٹا! اگر ایسا آملیٹ کھلانا ہو تو آئندہ سے ٹرے میں بلڈ پریشر کی دو گولیاں بھی رکھ دیا کرو۔"

اور میں خجل ہوتی ٹرے اٹھائے واپس لوٹی۔

اس دن کے بعد جب بھی میرے آملیٹ بنانے کی بات ہوئی، سب کے قہقہوں نے دل ہی "برا" کر دیا۔ خیر اب کیک ہے جو میں بہت اچھا بناتی ہوں اور فرمائش کر کے بنوایا جاتا ہے اور چائنیز کھلاتے بہت مزے کے بناتی ہوں۔

5۔ اس سوال کے جواب میں ہمیشہ ایک ٹھنڈی "ہائے" لکھی ہوئی پڑھی تھی اور سوچا تھا کہ ایسا بھی کیا ہے۔ اب جب خود لکھنے بیٹھی ہوں تو بے اختیار ہی ایک ٹھنڈی آہ منہ سے نکلی ہے، اتنی ٹھنڈی کہ سردی لگنے لگی ہے۔ خیر یہ واقعی ایک "دل دکھانے" والا سوال ہے۔ باہر کے کھانے کو یعنی باہر جا کر کھانے کو، ہمارے ہاں کوئی بھی پسند نہیں کرتا جو بھی کھانا ہو منگوا کر گھر میں کھا لیتے ہیں ہاں البتہ جب گھر سے باہر کہیں چھٹیوں میں جاتے ہیں تب باہر کھانا کھانے ضرور جاتے ہیں اور ایسے مواقع سال میں دو تین بار ہی آتے ہیں لیکن جب خالائیں (جو کم و بیش میری ہی عمر کی ہیں) اور کزنز ساتھ ہوں۔ تب سال بھر کا انجوائے دو تین بار میں ہی ہو جاتا ہے اور وہ دن یادگار دنوں میں شامل ہو جاتا ہے۔

6۔ موسم کی اہمیت سے انکار کسی کو بھی نہیں ہے۔ کیونکہ جتنے پکوڑے رمضان میں کھائے جاتے ہیں عام دنوں میں نہیں، اور جتنی بار سوپ سردیوں میں بنتا ہے عام دنوں میں تو بالکل نہیں۔ اسی طرح سری پائے، سوپ، آئس کریم (ہاں آئس کریم) کافی، چائے، سردیوں میں زیادہ مزہ دیتی ہے اور لسی، روح افزا ملک شیک گرمیوں میں ہی لطف دیتا ہے۔

7۔ اچھا کھانا پکانے کے لیے محنت شرط ہے (جو کرنے کی میں پوری کوشش کرتی ہوں مگر......) اگر محنت سے پکایا جائے تو ضرور لذیذ بھی ہوتا ہے۔ جیسے کوفتوں کے لیے، قیمہ سل پر پیسنے سے جو ذائقہ ہوتا ہے، وہ گرائینڈر یا قیمہ مشین میں نہیں، اور ساگ کو گھوٹنے سے جو ذائقہ آتا ہے، وہ گرائینڈر میں گرینڈ کرنے سے نہیں۔ ہم تو کیچپ، اچار، اسکوائش، کشمیری چائے کا قہوہ، دہی، مکھن، دیسی گھی، روح افزا، جیم سب چیزیں گھر میں ہی بناتے ہیں۔ مما اور پاپا ہی زیادہ تر بناتے ہیں (کیونکہ میں تو ابھی "طفل مکتب" ہوں) اور۔

8۔ (I) لوہے کی کڑاہی، فرائی پین، توا یا کوئی بھی ایسا برتن دھونے کے لیے پانی میں تھوڑا سوڈا ملا کر دھوئیں، بہت صاف ہو جائیں گے۔

(II) اکثر بینگن، پالک یا اس جیسی سبزیاں کاٹتے وقت انگوٹھے اور انگلیوں پر سیاہ نشان پڑ جاتے ہیں۔ ان نشانوں کو دور کرنے کے لیے ہاتھوں پر تھوڑا سا نمک مل کر ہاتھ دھولیں، ہاتھ صاف ہو جائیں گے۔

(ندا چوہدری......رحیم یار خان)

بقیہ ہمارے نام

کرتے تھے اور یہاں ہر ماہ خواتین ڈائجسٹ، کرن، شعاع اخبار جہاں اور بچوں کے نونہال وغیرہ اخبار والے چاچا دے کر جاتے، ڈائجسٹ گھر کی تمام خواتین پڑھا کرتی تھیں اور ہر روز شام چائے کے ساتھ ٹی وی والے کمرے میں گرما گرم گفتگو چلتی۔ کبھی کسی اسٹوری پر تو کبھی لکھنے والوں پر۔ اب خواب ہوگئے وہ دن آپی مختصر الفاظ میں اب بس اتنا کہوں گی۔ ماشاء اللہ بچے کالج جاتے ہیں۔ میں نے اپنا کافی وقت روایتی فسادات میں گزارا۔ ڈپریشن میں رہی اس کڑے وقت میں میرے ڈاکٹر یہ رسالے تھے (اور ہیں) پڑھتی رہی سیکھتی رہی سنورتی رہی۔ کبھی روتی کبھی ہنستی سولہ سال اسکولنگ بھی کی۔ اچھے وقت اور محبت کا انتظار آج بھی اسی حوصلے سے کر رہی ہوں۔ گھر کے بڑے نانی دادی کی بھی ایک الگ ہی رونق ہوتی ہے سب کھو گیا۔ خواب ہوگیا وہ وقت۔ کبھی موقع ملا تو اپنی بہنوں کو وہ گزرا وقت ضرور بتاؤں گی۔

شادی کے بعد ہم نے اپنے میاں صاحب سے پہلی اور آخری فرمائش کہہ کر یہ فرمائش کی کہ بس آپ ہمیں ہر ماہ خواتین، کرن، شعاع لادیا کریں پلیز۔ یہ سن کر وہ کمرے سے باہر نکل گئے اور ہم سوکھے پتے کی طرح کانپنے لگے کہ یاخدا ان کو تو برا لگ گیا اب ہماری شکایت میکے جائے گی۔ لیکن یہ کیا وہ جب کمرے میں واپس تشریف لائے تو ساتھ میں بڑا سا ٹی وی کا کارٹن تھا، کھولنے پر پتا لگا اس کے اندر ڈائجسٹ کا سمندر ہے اف میرا تو خوشی سے برا حال میری دعا ہے۔

سب لکھنے والی بہنوں کے لیے آپ ایسے ہی پیارا پیارا لکھتی رہیں مجھ جیسی بن ماں باپ کی لڑکیوں کی تربیت کرتی رہیں، آپ بہنوں کے لکھے ہوئے لفظ ہمارا حوصلہ بڑھاتے ہیں۔ ہمیں جینا سکھاتے ہیں حرام موت خودکشی سے بچاتے ہیں اللہ آپ کو خوب خوب ترقی دے۔

پھر یوں ہوا کہ زندگی کے سفر میں ہم
اتنا چلے کہ راستے حیران رہ گئے

ج: اچھی بہن! آپ کا خط تو ایک مکمل افسانہ ہے بنت فاروقی تو آپ ہیں اور ہمیشہ رہیں گی لیکن کوئی نام بھی تو ہوگا آپ کا، اپنا نام نہیں لکھنا چاہتیں تو کوئی فرضی نام ہی رکھ لیں۔

صلاحیت تو ہے آپ میں۔ اپنی زندگی کے حالات افسانہ کی شکل میں لکھیں آپ کی کہانی یقیناً دلچسپ اور دوسروں کے لیے مشعل راہ ہوگی۔

ناہید اسماعیل...... کراچی

ٹائٹل ویسا ہی تھا جیسا ہم چاہتے ہیں دھیمے اور ٹھنڈے رنگوں سے مزین، کم جیولری سادہ اسٹائل۔ کہنی سنی ہمیشہ کی طرح قابل غور۔ کرن کرن روشنی سے مستفید ہوتے آگے بڑھے۔ پسندیدہ ناول کی طرف "زندگی ہم تجھے گزاریں گے" بے حد خوب صورت انجام کے ساتھ اختتام پذیر ہوا، سادگی اور پرکاری کا شاہکار رہا یہ ناول، راحت جی نے کسی بھی کردار کو نظر انداز نہیں کیا۔

"مالا" تو ہے ہی شاندار، ماہی کی ماہر سے پہلی ملاقات مزیدار اور یادگار تھی۔ نا جانے کتنی زندگیاں ان سفلی عملیات کے ہاتھوں برباد ہوتی ہوں گی لیکن آزمائش زندگی کا حصہ، جو تقدیر کا لکھا وہ مالک کی رضا۔ ہماری بہن نے توجہ دلائی کہ "مالا" کے خلاصے میں جادو ٹونے کے لیے "برحق" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو کہ شاید نہیں ہونا چاہیے جادو حقیقت ہے "برحق" نہیں۔

"مشک بام" چراغ کی شرانگیزیاں کچھ زیادہ ہی نہیں بڑھتی جارہیں اسے ابھی اندازہ نہیں مقابل شمس ہے اور سورج کے سامنے چراغ کی ننھی منی سی لو بھلا کب تک قائم رہ سکتی ہے۔

عنیزہ سید کے سحر انگیز قلم کا ایک اور شاہکار "جو کوئے یار سے نکلے" سچ میں آغاز سے اختتام تک اس تحریر نے ایسا حصار باندھا کہ ہم اب تک اس کی گرفت میں ہیں۔

"مٹی کے مکین" اچھی تحریر ہے لیکن اینڈ کچھ ادھورا سا لگا اگر عرشیہ کی ساس کی اصلیت اس کی زندگی میں ہی دکھائی دی جاتی تو کہانی مکمل لگتی۔

افسانوں میں "بے معنی لکیریں" ٹاپ پر رہا بزرگ ٹھنڈی چھاؤں کی مانند ہوتے ہیں یہ سوچ ختم ہوتی جارہی ہے کہیں پڑھا تھا کہ اچھی کتابیں اور اچھے دل ہر کسی کی سمجھ

میں نہیں آتے۔ یہی وجہ ہے کہ اچھی کتابیں ہمیشہ گرد اور اچھے دل ہمیشہ ٹھوکروں کی زد میں رہتے ہیں۔

"ہم زاد کا دکھ" اچھا لگا لیکن ہم زاد کی جگہ ضمیر ہوتا تو بہتر ہوتا ہم زاد ہمارے برے عمل پر سمجھاتا نہیں ہے۔ حنا اشرف کا افسانہ بھی اچھا لگا "کفارہ" اچھی تحریر تھی خصوصاً اختتام پر نور جہاں کا ردعمل......

"ساری کہانی خوب صورت ہے" فریدہ اشفاق کے نام پر نظر پڑتے ہی لب بے ساختہ مسکرائے بے شمار تحریروں کی ساتھ ساتھ موسم تھا بے قرار کی یاد آ گئی۔ کس قدر دلکش اور ستھری تحریریں ہوا کرتی تھیں، زندہ دل کردار، خوب صورت شاعری دل موہ لینے والے برجستہ جملے۔ باوقار ہیروز اور خوددار، عزت نفس اور مشرقی اقدار کا پاس رکھنے والی باحیا، سادہ، تعلیم یافتہ اور قابل (ہمیں لگتا تھا کہ فریدہ اشفاق جیسی) ہیروئن۔ یہ سب بھلا کیسے بھلائے جا سکتے ہیں۔ ان کے جوابات پڑھتے ہوئے خوشی اور افسردگی کا احساس ساتھ ساتھ رہا، ڈھیروں دعائیں ان کے لیے، بے شمار خوشیاں ان کا مقدر بنیں۔ آمین۔

ایک چیز جو شدت سے محسوس ہوئی کہ ہماری اکثر رائٹرز بڑے کرائسس سے گزری ہیں لیکن اپنی تحریروں میں اس کی جھلک تک نہیں آنے دیتیں۔ ایمل رضا کے جوابات پر حیرانی ہوئی جنہیں ہم قارئین اتنا پسند کرتے ہیں، ان کی فیملی میں خاص رسپانس ہی نہیں۔ رخسانہ نگار اور کنیز نبوی کے جوابات بھی بہت اچھے لگے۔

نگہت عبداللہ سے ملاقات اچھی لگی ماشا اللہ بہت اسٹرونگ ہیں اور اسٹرونگ ہونے پر سائرہ رضا کی بات یاد آ گئی جب انہوں نے کہا کہ یہ سب پڑھ کر مجھے کمزور مت سمجھیے گا ترازو کے ایک پلڑے میں پہاڑ رکھیں اور دوسرے میں میرا دل تو میرا دل زیادہ مضبوط نکلے گا۔

بہنوں کی محفل میں سارے ہی تبصرے اچھے تھے۔ گوشی جمال کے بچپن کے واقعات پڑھ کر بہت دل دکھا۔ پیاری گوشی آپ یقیناً وہ سب نہیں بھول سکتیں کوشش بھی کر لیں پھر بھی۔ بس آپ یہ سوچ لیا کریں کہ بے شمار گھرانوں میں بچوں کے ساتھ ایسا رویہ رکھا جاتا ہے۔ جب بھی آپ کو یہ تلخیاں یاد آئیں تو کچرا چنتے، پھول بیچتے، گاڑیاں صاف کرتے بچوں کی زندگی دیکھا کریں ان کا تو کوئی بچپن ہی نہیں۔ آپ کے سر پر چھت ہے، ان بے گھروں کو دیکھیں جن کے بارے میں سائرہ رضا نے لکھا تھا کہ بے گھر ملک کے کسی بھی حصے میں ہوں سب کے چہرے ایک سے لگتے ہیں بے رنگ اور نچڑے نچڑے۔ آپ تو اپنے خطوط سے ہی اچھے خاصے سنجیدہ انسان کو ہنسا دیتی ہیں سچ مجھے آپ کی اس صلاحیت پر رشک آتا ہے۔ آپ حساس ہیں، ساتھ ہمت و حوصلے والی ہیں اور باصلاحیت بھی۔ آپ اپنی لکھنے کی صلاحیت کو ضرور کام میں لائیں۔ اللہ آپ کو بے شمار خوشیاں عطا فرمائے، آمین۔ اعتبار ساجد کی غزل بہت اچھی لگی۔ نفسیاتی الجھنیں میں عدنان بھیا اتنے اچھے انداز میں سمجھاتے ہیں کہ اگر واقعی ان پر عمل کر لیا جائے تو زندگی آسان ہو جائے۔

ج: پیاری ناہید ہمیں افسوس ہے کہ آپ کا انتخاب کسی اور کے نام سے شائع ہوا، یہ آپ کی کشادہ دلی ہے کہ آپ نے برا نہیں مانا کر دیا تبصرہ اور خط تو آپ کا ہے ہی قابل تعریف۔

ماہ نور انجم......نا معلوم شہر

اس ماہ کا تبصرہ تو بھئی ہماری پیاری مصنفہ راحت جبیں اور ان کے لاجواب کرداروں، مراد اور نرمین کے نام جس خوب صورتی سے مراد کے کردار کو لکھا گیا۔ اس کے ہر ہر عمل پہ دل عش عش کر اٹھا۔ گویا ایک مکمل افسانوی کردار تھا کیونکہ اتنا اچھا انسان ہونا ناممکن ہے۔ ہر انسان پورا اچھا یا پورا برا نہیں ہوتا۔ خیر راحت جبیں نے جس طرح محبت، صبر، محنت، موٹیویشن، حوصلے، ثابت قدمی، خودداری اور کامیابی کے ان تمام جذبات کو جس طرح ان اٹھارہ اقساط میں بیان کیا، ایسا انداز بیان ایک منجھی ہوئی لکھاری ہی کا کارنامہ ہو سکتا ہے۔ نازک مگر بلند حوصلہ نرمین نے جس طرح حالات کو اپنے موافق کیا۔ ایسے ہی لوگ دوسروں کے لیے مثال بنتے ہیں۔ بس ایک کمی رہ گئی، اگر آخری قسط میں شادی کا منظر دکھا کر تھوڑا رومانس کا تڑکا لگ جاتا تو مزہ دوبالا ہو جاتا۔ بہر حال ایک خوب صورت کہانی اپنے اختتام کو پہنچی جس کی خوشی اپنی جگہ لیکن اگلے ماہ سے مراد کو نہیں پڑھ سکیں گے۔ اس کی اعلاظرفی کا

ایک نیا مظاہرہ نہیں ہوگا اس کا دکھ بھی ہے۔ باقی رسالہ مجموعی طور پر اچھا تھا بس ایک درخواست ہے کہ سرورق کا معیار اور اسٹائل بدلیں۔

ج: پیاری ماہ نور! راحت جبیں کے ناول پہ آپ کے تبصرے سے ہم بھی متفق ہیں۔ بہت سادہ اور دل نشین انداز ہے راحت کا اور اس ناول کے کردار یاد رہنے والے ہیں۔

ام حریم......لاہور

"زندگی ہم تجھے گزاریں گے" اپنے اختتام کو پہنچا راحت جبیں نے بے جا طوالت سے گریز کیا اور بہت اچھا اختتام کیا۔ آئندہ بھی آپ کا انتظار رہے گا "دانہ پانی" خالص ماحول میں لکھی جانے والی ایک بہت پیاری تحریر عمیرہ احمد کسی تعریف کی محتاج نہیں "مالا" نمرہ احمد آپ کو پڑھنے میں مجھے ہمیشہ ہی بہت مزہ آتا ہے ذہانت اور نالج سے بھری تحریر۔ سروے میں کنیز نبوی کو پڑھتے ہوئے یہ بات مجھے جھنجھوڑ کے رکھ گئی جو انہیں احمل صاحبہ نے کہا کہ تم سے تمہاری صلاحیتوں کی پوچھ ہوگی کنیز نبوی کی طرح اس بات سے میں بھی کانپ گئی ایک وقت تھا جب ایک وقت میں کئی کام سرانجام دے رہے تھے۔ دین دنیا دونوں علم پڑھنا، پڑھانا، لکھنا مصوری کتنا کچھ اور پھر زندگی کی الجھنوں میں سب چھوٹ گیا۔ ساری صلاحیتوں کو تھپک کر سلا دیا جب سوچتی ہوں تو بہت تکلیف ہوتی ہے اللہ تعالیٰ نے بہت کچھ دیا جو کام میں لایا جا سکتا تھا۔ خود کو ضائع کیا۔ غلط کیا۔ خیر جی اٹھ کھڑے ہوں گے ان شاءاللہ بھی۔

صدف ناصر اور منال بٹ میرے مائیکے شہر سے ہیں دونوں کے ساتھ چائے کا کپ تو واقعی ہونا چاہیے۔

آپ سے گزارش ہے کہ واٹس ایپ پہ رابطے کا طریقہ بتا دیں مجھے پوسٹ کروانے کا بہت مسئلہ ہوتا ہے کیا ٹیکسٹ میسج ہی لکھا جا سکتا ہے یا لکھی تحریر کا امیج بھی بھیجا جا سکتا ہے۔

میں نے "آپ کا باورچی خانہ" کے لیے بائی پوسٹ بھی اور واٹس ایپ پہ بھی بھیجی تھی شائع نہیں ہوئی۔ میں نے کچھ سال پیچھے جا کر لکھا پہاڑوں میں زندگی اب بھی ویسی ہی ہے اور ہم آتے جاتے رہتے ہیں۔

ج: پیاری حریم! آپ کا باورچی خانہ کے لیے اپنی تحریر اس خط کے ساتھ پوسٹ کر دیتیں تو زیادہ اچھا تھا۔ اب آئندہ ماہ خط لکھیں تو اس کے ساتھ اپنی تحریر بھی پوسٹ کر دیں۔ اور بھی کچھ لکھنا چاہیں تو خواتین کے صفحات حاضر ہیں۔ آپ کی تحریر سے لگتا ہے۔ آپ میں صلاحیت ہے۔ لکھ سکتی ہیں۔

سلمیٰ مسرت......راولپنڈی

سب سے پہلے شاندار اتنے دل سے سالگرہ کے سروے میں شرکت کی۔

ہر ماہ شامل ہونا ناممکن ہے کم از کم سروے میں جگہ دے دیا کریں، بہر حال دونوں سالگرہ نمبر زبردست سوپر ڈوپر تھے آپ نے مصنفین سے انٹرویو کر کے برسوں کی پیاس بجھا دی۔

یادوں کے سفر "یادیں رہ جاتی ہیں" اس سلسلے نے سارا ماضی سامنے کر دیا۔ یہ سلسلہ سب چیزوں کے اوپر رہا احمل سدا خوش رہو۔ اس سفر میں میرا لنک نسیم سحر قریشی کے ساتھ شروع ہوتا ہے ساتویں کلاس میں تھی ان کے ناولوں نے تحریروں نے مجھے اس ڈائجسٹ کا دیوانہ کر دیا وہ کیا رائٹر تھیں آج نمرہ، عمیرا، سائرہ، عمیرا کچھ مقابلہ کر سکتی ہیں ان کا وہ شاندار ہیرو آج بھی میرا خیالی ہیرو ہے ان کی موت کی خبر نے سکتہ کر دیا تھا کہ اتنی جلدی اس کے بعد ایسے شاک بے شمار لگے۔ شازیہ چوہدری آج تک نہیں بھولی نہ بھول سکتی ہوں آپ سب کو میں نے جہاں جہاں پڑھا میری وہ فرینڈز کالج کا کینٹین جمنازیم ایریا، نیوی کا ویٹنگ روم جب ایک لانچ مس ہو جاتی تھی ایک گھنٹے بعد دوسری آتی اس دوران اور پھر منوڑہ کے گھر کالا ان موتیا، گلاب سورج مکھی کے مہکتے پھول، سمندر کی لہروں کا شور۔ امی ابو کی محبت بھری آوازیں چھوٹی بہنوں کی شرارتیں میں سچ مچ اس دنیا میں پہنچ گئی شکریہ بہت شکریہ۔

عزیز بہن سلمیٰ......آپ چاہے ہر ماہ شرکت کریں یا وقفہ دے کر آپ اتنا اچھا خط لکھتی ہیں کہ ہم آپ کو نظر انداز کر ہی نہیں سکتے اگر کسی ماہ خط شامل نہ ہو تو اس کی ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے وہ ہے صفحات کی مجبوری۔ سالگرہ نمبر کا

سروے تو ابھی شائع ہی نہیں ہوا۔ جب شائع کریں گے تو آپ سرفہرست ہوں گی آپ کا قسیم سحر قریشی سے لنک شروع ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا ہماری سینئر ترین قارئین میں شمار ہوتا ہے۔ پرانی دوستی کی طرح پرانی قارئین بھی دل کے قریب ہوتی ہیں۔

روبینہ قریشی......سرگودھا

میرے پسندیدہ کلر میں سرورق کی لڑکی کو آنکھوں کے راستے دل میں اتارا۔ سب سے پہلے کہی ان کہی کو سنا۔ واقعی آدھا سال گزر بھی گیا اور پتا ہی نہیں چلا۔ بس جی اب پہنچے ہیں کرن، کرن روشنی تک۔ لیکن اس سے پہلے آپ کے نوٹ پر نظر پڑی کہ یہاں تمام تحاریر مستند احادیث سے لی گئی ہیں۔ اللہ آپ کو جزائے خیر سے نوازیں۔ ہمیشہ کی طرح تمام انتخاب نہایت عمدہ ہے۔ خاص طور پر آپ کے آخری وقت کے الفاظ" نماز اور تمہارے مملوک۔"

"ساری کہانی خوب صورت ہے" میں سب سے پہلے محترمہ فریدہ اشفاق صاحبہ کی باتیں پڑھیں۔ فریدہ آپ کی آسانی کے لیے بہت ساری دعائیں ہیں۔ کنیز نبوی کے لکھے ہوئے ایک ایک لفظ کو غور سے پڑھا اور اب پیارا جملہ پھر سے آپ سب کی نذر کر رہی ہوں۔

"شوہر ایک محبت اور احساس کا نام ہے جبکہ ممتا اپنی ذات کو مٹا دینے کا نام ہے۔" ایمل رضا کی ساری باتیں بچی اور کھری لگیں لیکن اس ایک بات پر تو ہم نے سچائی کی مہر ثبت کر دی ہے" لگتا تھا کہ خواتین ڈائجسٹ کی رائٹرز اللہ سے کچھ خاص قسمت لکھوا کر لائی ہیں۔" کیوں کہ ابھی تک میرے (روبینہ قریشی بقلم خود کے) پہلے افسانے (فیصلہ) کا کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ بس جی اب ہم پہنچے اپنی بہت پیاری اور پسندیدہ مصنفہ محترمہ نگہت عبداللہ کے انٹرویو تک۔ پیارے لوگوں کی پیاری باتیں...... بہت پیارا انٹرویو اور جب نگہت اپنے شوہر عبداللہ کی دائمی جدائی پر کہے گئے الفاظ بتاتی ہیں تو آنسوؤں کے بند ٹوٹ گئے۔"

عنیزہ سید کے مکمل ناول نے پہلی لائن سے ہی اپنی گرفت میں لیا تو مکمل کر کے ہی چھوڑ پائی۔ ناول کا بنیادی خیال بہت اچھا تھا۔ لیکن کہیں کہیں جگہ پر یہ تحریر کسی انگریزی ناول کا ترجمہ بھی لگ رہی تھی۔ یا شاید میں غلطی پر ہوں۔

اس کے بعد نصرت شمسی کا افسانہ" کفارہ" پڑھا۔ بے لوث اور بے غرض محبتوں میں گندھا ہوا افسانہ بہت اچھا رہا۔ یہ اپنے وطن سے دور جانے والے بہت سارے لوگوں کی کہانی ہے۔ مریم انصاری کا افسانہ "ہمزاد" ایک اچھی تحریر ہے شاباش مریم۔

"بے معنی لکیریں" ثمینہ عظمت علی کا ایسا افسانہ جو دل کے تار ہلا گیا۔

شاید ایک دن ہماری کتابیں جو ہم نے پتا نہیں کن کن حیلوں سے اکٹھی کی ہیں کسی فٹ پاتھ پر "پچاس کی تین، پچاس کی تین" کے حساب سے بک رہی ہوں گی۔ ثمینہ بہت داد آپ کے لیے۔ عینی عرفان کا افسانہ" مٹی کے مکیں" ہمارے معاشرے کی جیتی جاگتی اور ناقابل یقین حقیقت ہے۔ ایسے کئی لوگ میرے مشاہدے میں ہیں جو دو، دو چہرے رکھتے ہیں اور اپنے ساتھ رہنے والوں کو زچ کر دیتے ہیں۔

اب دو عدد ناول ہیں جنہیں میں بہت آرم، آرام سے پڑھوں گی۔ بھئی باقی سارا مہینہ بھی تو گزارنا ہے نا!!!

ج:۔ پیاری روبینہ......! آپ نے بہت اچھا تبصرہ کیا ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ آپ نے افسانہ ای میل کیا تھا یا اسے کوریئر کے ذریعے بھجوایا تھا۔ آپ کو اطمینان دلا دیں اگر افسانہ بھی اتنا ہی اچھا ہوا جتنا خط ہے تو یقیناً آپ کا شمار بھی ان رائٹرز میں ہوگا جو خاص قسمت لکھوا کر لاتے ہیں۔

نورین ظفر خان......لودھراں

اس ماہ تو کمال ہی ہو گیا، خواتین مقررہ تاریخ سے دو دن پہلے ہی مل گیا......اور پھر کئی دن سے ہوا بڑھا لو بی۔ پی فوراً ہی مناسب سطح پر آ گیا۔

بیضوی چہرے والی محترمہ بہت پیاری اور معصوم سی لگ رہی ہیں۔ لیکن پوچھنا یہ ہے کہ دراز گیسو واقعی حقیقی ہیں یا......؟؟؟

سرورق کے بالکل بائیں کونے پر عنیزہ سید کا نام نظر آیا اور پہلے کوئے یار چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہاں سے کس کو نکالا جا رہا ہے مجھے......؟؟؟

کوئے یار کا پتہ (صفحہ نمبر) حاصل کرنے کے لیے فہرست کھولی تو راستے میں ہی نگہت عبداللہ سے ملاقات ہوگئی۔ اب ہوا یہ کہ نگہت کی طرف بڑھنے کے لیے قدم بڑھائے ہی تھے کہ پہلے "فریدہ اشفاق پر نظر جا ٹھہری...... کیا رنگ تھا...... ہائے اور پھر غالب کے اشعار

اور پھر وہ کہانی کہ جس میں ماضی کی یادیں اور بچپن کے رنگ ہوں کیونکہ نہ خوب صورت ہوگی......؟؟؟

لیں جی فریدہ اشفاق سے ایک خوشگوار ملاقات کر کے اپنے اگلے پڑاؤ کی طرف بڑھے اور پہنچے نگہت عبداللہ کے پاس۔ ان کے انداز، اطوار، گفتار سب باکمال۔ ہم نے انہیں باہمت، بلند حوصلہ خاتون پایا......

ہم آگے کو روانہ ہوئے تو "عمیرہ صاحبہ" کو "دانہ پانی" کے ساتھ موجود پایا۔ ویسے تو سب ہی کردار بہترین ہیں لیکن مجھے ذاتی طور پر "تاجور" کے والد "شاہ صاحب" کا کردار بہت زیادہ پسند ہے۔

"دانہ پانی" سے سیر ہو کر آگے بڑھے تو "حنا اشرف" کو "خودغرض" "رابعہ باجی" کے ہمراہ پایا۔

آخر کار مختلف پڑاؤ سے گزرتے رکتے ہم "کوئے یار" تک پہنچ ہی گئے...... ناول کا آغاز مقناطیسیت لیے ہوئے تھا۔ دو مسافروں کی منزل ایک ہونے تک ہم نے بھی ان کے ساتھ سفر کیا۔

اب باری آتی ہے "نصرت شمسی" کے "کفارہ" کی...... عمدہ بہترین تحریر ماضی کے خوب صورت قصے یادیں اور مزیدار ذائقے کے ساتھ...... ہاں لیکن ایک بات جو مجھے بالکل اچھی نہیں لگی بلکہ بری ہی لگی۔ وہ یہ کہ یہ خط بھارت (ہندوستان) سے ہی کیوں آیا......؟؟؟ یہ خط تو پاکستان سے بھی جاسکتا تھا۔ اور جن کرداروں کو نصرت نے ہندوستان میں آباد کیا ان کو پاکستان میں بھی مکین کیا جاسکتا تھا...... کہ نہیں......؟؟؟

ج: عزیز بہن نورین! کہاں غائب تھیں آپ؟ ایک طویل مدت بعد آپ کی آمد سے دلی مسرت ہوئی۔ بہت اچھا خط لکھا ہے آپ نے نصرت شمسی کے افسانے میں ہندوستان کا ذکر اس لیے تھا کہ یہ افسانہ ہمیں انڈیا سے موصول ہوا تھا۔ آسیہ رئیس خان بھی انڈیا سے ہی لکھتی ہیں۔ تمام تر کوششوں کے باوجود انڈیا میں اردو پڑھنے والے بڑی تعداد میں ہیں اور اب ہمارے پرچے بہت ذوق شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔

خواتین پر آپ کا تبصرہ بہت اچھا ہے لیکن ہمیں کچھ ادھورا سا لگا۔ اب ایک خط لکھ کر پھر غائب نہ ہو جائے گا۔

زارا احمد، بجل علی، عائشہ غنی، پرواز...... ضلع دودو

کسی بھی ادارے میں ہمارا یہ پہلا خط ہے۔ لکھنے کی وجوہات بہت ساری ہیں۔ ان میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے میں...... زراع احمد بہت عرصہ سے کہانیاں لکھ رہی ہوں۔ ڈائجسٹ بہت بعد میں پڑھا۔ پچھلے سال نومبر میں نے ایک مکمل ناول ارسال کیا تھا۔ عنوان تھا "سود اور خسارہ" رابطے کی ہر ممکن کوشش کی رابطہ نہ ہو پایا۔ ہم سب کزنز کی پسند ناپسند مشترکہ ہوتی ہے۔ سب کی خواہش تھی نام ان سب کا بھی لگ جانا چاہیے۔ شعاع خواتین کی کہانیاں زبردست ہوتی ہیں پرانی رائٹرز نے تعلق توڑا تو نئی اور اچھی رائٹر کی بھرمار۔ سب اپنی جگہ پر اچھا لکھ رہی ہیں۔ خاص طور پر نمرہ احمد......

ج: پیاری بہنو! آپ سب خواتین باقاعدگی سے پڑھتی ہیں۔ یہ جان کر بہت خوشی ہوئی آپ نے افسانہ ای میل کا ئی ہے یا کوریئر سے بھیجا ہے۔

شگفتہ ناز ملک...... علی پور

میں ہمیشہ رسالہ لیٹ پڑھتی ہوں۔ تبصرہ کرنے سے رہ جاتی ہوں، کہ ستمبر کے شمارہ میں ایک کہانی تھی پرواز سے پہلے یہ سعیدہ عمر کی لکھی ہوئی تھی آپ یقین کریں کہ یہ اسٹوری پڑھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ خواتین ڈائجسٹ ہو یا شعاع انہوں نے ہمیں جینے کی ایک نئی راہ دکھائی ہے۔ ہر اس جگہ پر جہاں یہ ہمارے قدم تھوڑے سے لڑکھڑائے خواتین اور شعاع کی کہانی نے بڑھ کر تھام لیا اس سے پہلے سائرہ رضا کا ناول۔ خالی آسمان یقین کریں اس ناول کو پڑھ کر بھی میں کئی دنوں تک سو نہیں پائی تھی، یہ ہماری رائٹرز کا کمال ہے کہ وہ اتنا خوب صورت لکھتی ہیں اتنا مکمل لکھتی ہیں کہ ایسے لگتا ہے کہ ہاں یہ تو میرا دیکھا ہوا ہے ہاں یہی تو ہے جو ہو رہا ہے اور

بہت پہلے میں نے کہانی میں کہیں پڑھا تھا تب میں میٹرک میں پڑھتی تھی کہ بچوں کے دوست بنیں اور یقین کریں کہ اس کے بعد اپنی چھوٹی بہنوں کی دوست بن گئی گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اپنے بھانجوں کی، اپنے بھتیجوں کی سب بچوں کے ساتھ میرا بہت اچھے ایک دوست کا رشتہ بن گیا ایسی دوستی کہ ان کو کسی بھی راز داں کی ضرورت ہو۔ کوئی مشکل ہو، کوئی مسئلہ ہو تو میرے خاندان کے بچے مجھے بڑی بہن سمجھ کر ایک دوست سمجھ کر مجھ سے مشورہ کرتے ہیں اور یہ کس کا احسان ہے یہ ان ہی ڈائجسٹ کا احسان ہے اس سے پہلے ایک کہانی تھی شاید سمیرا حمید کی تھی، اس میں دبیسا نام کی لڑکی جو کہ کوڑھ کی مریض ہو جاتی ہے۔ اس نے اللہ پر پختہ یقین رکھنا اعتقاد رکھنا سکھایا تھا نانی بائی کی بیٹی عنیزہ سید کی لکھی ہوئی تو اس کہانی کو پڑھ کر بھی اور بہت ساری ایسی کہانیاں بہت سارے ایسے واقعات، بہت ساری ایسا کچھ تھا کہ جس نے گرتے ہوئے کو سنبھالا دیا جہاں پر حوصلے ٹوٹ گئے اور جہاں پر لگا تھا کہ بس اب زندگی کا اینڈ ہے، لگا تھا کہ اب مزید چلنا مشکل ہے اور جہاں پر لگتا تھا کہ بہت مشکلات ہیں، آگے بڑھنے کا کوئی راستہ نہیں، وہیں پر کسی ڈائجسٹ میں کوئی ایسی بات آ جاتی تھی کہ نہیں آگے بھی زندگی ہے، اور بہت دفعہ یوں ہوا آگے نہیں بڑھ سکتے لیکن وہیں پر کچھ ایسا پڑھنے کو ملا کہ زندگی سنور گئی اچھے الفاظ بھی رائیگاں نہیں جاتے کہانیوں سے سیکھا کہ زندگی کو جیا کیسے جاتا ہے ۔آج میرے اندر جو بھی اچھائی ہے۔ اس میں بڑا حصہ ان ہی رسالوں کا ہے۔

ج:۔ پیاری شگفتہ! آپ جیسے قارئین کسی بھی پرچے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعام ہوتے ہیں۔ خواتین اور شعاع کی کہانیوں نے آپ کو اندھیروں میں راہ دکھائی، آپ کی راہیں روشن کیں۔ اس نے ہمیں دلی سکون اور اطمینان دیا ہے۔ کہانوں کے انتخاب میں ہمیشہ ہم نے بہت احتیاط سے کام لیا ہے۔ بشر ہونے کے ناتے غلطی ممکن ہے لیکن ہمارے پیش نظر ہمیشہ یہی بات ہوتی ہے کہ کوئی بھی ایسی تحریر نہ شائع کی جائے جس سے مایوسی اور ناامیدی پیدا ہو، یا جو قاری کے لیے ذہنی انتشار کا باعث ہو۔

آپ کے خط نے ہماری حوصلہ افزائی کی ہے۔ اس کے لیے تہہ دل سے ممنون ہیں۔

نجمہ جبار .... بھاول پور

بہاولپور سے تعلق ہے اور کافی عرصے کراچی میں بھی وقت گزارا۔ میرے شوہر ارشد اور بچے آریان، ارغمان اور اشمل میری جنت ہیں۔ ماشاء اللہ کبھی میرے شوہر، ساس سسر اور میرے میکے والوں نے ڈائجسٹ سے تعلق پر اعتراض نہیں کیا۔ 1997ء سے آپ کے ان ڈائجسٹ کو پڑھ رہی ہوں اور حیران ہوں گے آپ کہ بچپن سے ایک ہی دکان سے لیتی ہوں۔ میں ایک دن میں ہی پورا رسالہ پڑھ لیا کرتی تھی۔ پھر 2005ء میں شادی کے بعد بھی یہ تعلق آج تک برقرار ہے۔ بچے اور شوہر نے ہمیشہ میری خوشی کا خیال رکھا اور اب بھی ہر ماہ وہی ڈائجسٹ لا کر دیتے ہیں۔ میرا یوٹیوب پر نجمہ اسٹوڈیو چینل بھی ہے جس پر نابینا افراد جو شوق کے باوجود نہیں پڑھ سکتے وہ ان خواتین، شعاع، کرن کی دلچسپ و اصلاحی تحریریں سن سکیں۔ اور بہت سی بلائنڈ خواتین بھی چینل پہ ایڈ ہیں۔

اشتل کا رائٹرز کا سروے بہت اچھا رہا کہ ایمل رضا اور کنیز نبوی کی باتیں اچھی تھیں واہ نگہت سے ملاقات بہت پسند آئی شاہین تم نے کمال کر دیا۔ اب جلدی سے رفعت سراج، افشاں آفریدی اور نگہت سیما سے بھی ملوا دو۔ نمرہ، عمیرہ و سمیرا کی تحریریں تو ہیں ہی بہت اچھی سب ایک دوسرے سے الگ و دلچسپ۔

راحت نے بہت اچھا اور مثبت اینڈ کیا بہت مبارک اس زبردست ناول کے ختم ہونے پر۔ عینی عرفان نے شاید پہلی بار لکھا اور بہت اچھا ہی لکھا موضوع بھی اچھا اور انداز بھی بہتر تھا۔ طویل ناول عنیزہ اتنے وقت بعد آئیں اور بہت اچھا ناول لے کر۔

ج:۔ پیاری نجمہ! آپ نے ہماری محفل میں شرکت کی۔ آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا آپ جس سلسلے میں چاہیں۔ شوق سے شرکت کریں۔ ہم نے یہ سلسلے قارئین کے لیے ہی شروع کیے ہیں۔

☆



چلائے۔ ان سے شادی کی وہ بھی اسی طرح شادی کرنا چاہتی ہیں۔ (بولی وڈ کیوں پاکستان انڈسٹری میں بھی ایسے کئی لوگ ہیں جن کی بغیر افیئر چلائے شادی ہوئی ہے۔ اف یہ بولی وڈ کا بھوت!!)

گریز

جٹ پٹی خبریں ہوں اور ہانیہ عامر کا نام نہ ہو ایسا ممکن نہیں۔ لیکن اس بار معاملہ مختلف ہے۔ ایک شو میں شرکت کے دوران ہانیہ عامر سے جب یہ پوچھا گیا کہ آپ کے سابقہ دوست کی پوسٹ پر کمنٹس میں آپ کو کیوں ٹیگ کیا جاتا ہے۔ (پرانی رفاقت ہے تو نام تو ساتھ آئے گا) لیکن حیرت انگیز طور پر ہانیہ نے اس سوال کا جواب دینے سے پہلے تو گریز کیا تاہم

خبریں وبریں

وصفہ سہیل

خواہش

شادی کا ذکر ہو اور مردوں کی چار شادیاں زیر بحث نہ آئیں یہ ممکن نہیں۔ اب یہی دیکھ لیں اداکارہ درخشاں سلیم نے ایک پروگرام میں حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ آج کل کے مرد حضرات سے ایک بیوی ہی ٹھیک طرح سے نہیں سنبھالی جاتی، وہ چار بیویوں کو کیسے سنبھالیں گے (بات تو سچ ہے مگر......) مہنگائی کے اس دور میں کہ جب پٹرول 200 روپے سے تجاوز کر چکا ہے تو یہ مرد کیسے چار بیویاں سنبھال سکتے ہیں؟ (اب یہ تو آپ مردوں کے دل سے پوچھیں)

درخشاں کا اپنی شادی کے حوالے سے کہنا ہے کہ ان کی خواہش ہے کہ وہ بھی بولی وڈ اداکارہ کترینہ کیف کی طرح رومانس کیے بغیر شادی کر لیں۔ اور (ہیں جی...... کیا آپ نے واقعی کترینہ کیا ہے؟) جس طرح کترینہ نے وکی کوشل سے بغیر افیئر

بعد میں انہوں نے اپنے جواب میں کہا کہ وہ اور عاصم بہت محنت سے کام کرتے ہیں (لیکن یہاں کام کی بات تو کسی نے نہیں کی ہانیہ؟) جب بھی کوئی کمنٹ



کرتا ہے اور منفی گفتگو ہوتی ہے تو ان کے کام پر اثر پڑتا ہے اور جب انٹرنیٹ پر لڑائی ہوتی ہے تو اس کا اثر ان کے چاہنے والوں پر بھی پڑتا ہے اس لیے وہ اس سوال کا جواب نہیں دیں گی (لیکن ہانیہ تعلق توڑتے وقت تو آپ نے یہ سب نہیں سوچا تھا!)

دل والا

طرح دار اداکارہ مہوش حیات نے اپنی نئی فلم کی پروموشن انٹرویو کے دوران یہ دعوی کیا ہے کہ ان کو کئی لوگوں نے بتایا ہے کہ ان کی فلم پنجاب نہیں جاؤں گی کو بارہ سے تیرہ بار جا کر سینما میں دیکھا ہے۔ (ہیں جی! مہوش جی لوگوں کا کام ہے باتیں بنانا آپ خوش فہمی میں مبتلا نہ ہوں) ان کے مطابق ان کی فلم پنجاب نہیں جاؤں گی کو پاکستانیوں نے بہت پسند کیا اور انہیں امید ہے کہ ان کی نئی آنے والی فلم کو بھی پسند کیا جائے گا۔

اس دوران وہاں موجود ہمایوں سعید نے مہوش حیات کی شادی کے حوالے سے کہا ہے کہ مہوش کو شادی کے لیے گورا یعنی غیر ملکی یا انگریز شخص چاہیے (آہم مم) ہمایوں کی اس بات پر مہوش نے کہا کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں ایسا نہیں ہے۔ جس پر اداکار ہمایوں سعید نے زور دیتے ہوئے کہا کہ مہوش سیٹ پر اکثر اس بات کا تذکرہ کرتی رہی ہیں کہ وہ گورے سے ہی شادی کریں گی۔ اداکارہ مہوش نے برجستہ جواب دیتے ہوئے کہا کہ گورا ہو یا کالا ہو بس دل والا (بالکل دل والا ہونا ضروری ہے)!

مانی کا مشورہ

پیٹرول کی بڑھتی ہوئی قیمتوں سے جہاں عوام پریشان ہیں وہیں شوبز شخصیات بھی متاثر نظر آرہی ہیں۔ اب یہی دیکھ لیں۔ پٹرول کی بڑھتی ہوئی قیمتوں پر اداکارہ و کامیڈین سلمان شیخ عرف مانی نے حکومت کو انوکھا مشورہ دے دیا ہے۔ اپنی انسٹاگرام اسٹوری میں مانی نے پاکستان کو بچانے کا واحد طریقہ کار بتایا ہے (حالاں کہ ہمیں تو کوئی طریقہ بجھائی نہیں دے رہا سوائے اللہ سے دعا کے۔) کہ پاکستان 100 ملکوں کے ساتھ ایک بلین ڈالر کی کمیٹی ڈال لے اور پہلی کمیٹی خود رکھ لے اور پھر بھاگ جائے؟

ماہنامہ ڈائجسٹ میں راحت جبیں کے قسط وار چھپنے والے خوب صورت ناول

زرد موسم



قیمت -/1000 روپے
25% ڈسکاؤنٹ
قیمت -/750 روپے

تتلیاں پھول خوشبو



قیمت -/300 روپے
25% ڈسکاؤنٹ
قیمت -/225 روپے

پاکستان میں کہیں بھی بذریعہ فون منگوائیں ڈاک خرچ فری

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر 021-32216361

موسم کے پکوان

واصفہ سہیل

مٹن مسالا بریانی

اجزاء:

بکرے کا گوشت	ایک کلو
ادرک لہسن	ڈیڑھ کھانے کا چمچہ
نمک	ڈیڑھ کھانے کا چمچہ
پسی لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
پسا دھنیا	ایک کھانے کا چمچہ
ثابت گرم مسالا	ایک کھانے کا چمچہ
کٹی پیاز	دو عدد
ٹماٹر	دو عدد

چاول کے اجزاء:

ابلے چاول	ایک کلو
گرم مسالہ	ایک کھانے کا چمچہ
تیز پتا	ایک عدد

دیگر اجزاء:

ہرا دھنیا	ایک گٹھی
پودینہ	آدھا گٹھی
ہری مرچ	سات سے آٹھ عدد
لیموں	چھ سے آٹھ عدد
آلو بخارے	آٹھ عدد
دہی	ڈیڑھ کپ
براؤن پیاز	آدھا کپ
گھی	حسب ضرورت
زردہ رنگ	ایک چٹکی
پسی جائفل، جاوتری	آدھا چائے کا چمچہ
ٹماٹر	دو عدد

ترکیب:

پہلے بکرے کے گوشت میں ادرک لہسن، نمک، پسی لال مرچ، ہلدی، پسا دھنیا، ثابت گرم مسالا، پیاز، ٹماٹر اور پانی شامل کر کے اتنا پکائیں کہ گوشت گل جائے۔ ایک پتیلی میں گوشت اور مسالا چاروں طرف پھیلا کر اس میں باریک کٹا ہرا دھنیا، پودینہ، ٹماٹر، ہری مرچ، پسی جائفل، جاوتری، بھیگے آلو بخارے، فرائی پیاز ——— دہی میں مکس کر کے شامل کریں۔ پھر اس میں گرم مسالا اور تیز پتا کے ساتھ ابلے چاول ڈال کر پھیلا دیں۔ ساتھ ہی زردے کے رنگ کو گھول کر چاول پر پھیلا کر ڈالیں اور آنچ تیز کر کے دم پر رکھ دیں۔ دم پر آجائے تو نکال کر گرم گرم سرو کریں۔

اچاری کڑاہی گوشت

گوشت	آدھا کلو
ادرک لہسن	ایک کھانے کا چمچہ
ثابت گرم مسالہ	ایک کھانے کا چمچہ
کڑی پتہ	چار عدد
رائی	چوتھائی چائے کا چمچہ
سونف	چوتھائی چائے کا چمچہ
کلونجی	چوتھائی چائے کا چمچہ
کٹی مرچ	ڈیڑھ کھانے کا چمچہ
سفید زیرا	ایک چائے کا چمچہ
میتھی دانہ	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
تیل	آدھا کپ
کٹی کالی مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
ادرک	ایک ٹکڑا (باریک کٹی)
ہری مرچ	چار عدد (بڑی)
لہسن	ایک چائے کا چمچہ

پیاز	ایک عدد
ٹماٹر	دو عدد
ہرا دھنیا	دو کھانے کے چمچے

ترکیب:

گوشت کو دو کپ پانی ادرک لہسن اور ثابت گرم مسالے کے ساتھ ابالیں، یہاں تک کہ گوشت گل جائے اب اسے نکال کر ایک طرف رکھ دیں۔

ایک پیالے میں کڑی پتہ، رائی، سونف، کلونجی، زیرا، میتھی، کٹی مرچ، کٹی کالی مرچ اور نمک ڈال کر مکس کرلیں۔ اس میں باریک کٹی ادرک اور کٹا ہوا لہسن بھی شامل کرلیں۔

اب ایک دیگچی میں تیل گرم کرکے تمام مسالاجات ڈالیں پھر اس میں پیاز شامل کرکے پانچ منٹ تک بھونیں۔ اب اس میں کٹی ہوئی ہری مرچیں، ٹماٹر ڈال کر اچھی طرح فرائی کریں۔ اب اس میں گوشت ڈال کر اتنا پکائیں کہ تیل اوپر آجائے آخر میں ہرا دھنیا چھڑک کر پیش کریں۔

دھواں مٹن بوٹی

بکرے کا گوشت	آدھا کلو
دہی	ایک پاؤ
پپیتا	ایک کھانے کا چمچہ
ثابت مرچ	چھ عدد
زیرا	دو چائے کے چمچے
ہری مرچ	دو عدد
لہسن	چار عدد
ادرک	ایک ٹکڑا
ٹماٹر	ایک عدد
ہرا دھنیا	آدھی گٹھی
پیاز	دو عدد
لیموں کا رس	چار کھانے کے چمچے
نمک	آدھا چائے کا چمچہ
گرم مسالا	آدھا چائے کا چمچہ
کوئلہ	ایک ٹکڑا
تیل	آدھا کپ

ترکیب

ثابت مرچ، زیرا، ہری مرچ، لہسن کے جوے ادرک، پیاز اور دہی ڈال کر پیس لیں۔ اب اس میں پپیتے کا پیسٹ، لیموں کا رس، پسا گرم مسالا اور نمک ملادیں اور پھر گوشت کی بوٹیوں کو اچھی طرح مسالے میں ملالیں اور آدھے گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں۔ آدھے گھنٹے بعد انہیں گرم تیل میں بھون لیں۔ جب گل جائیں تو کوئلے کا دھواں دیں۔

بھنا مغز

بکرے کے مغز	چار عدد
پیاز	دو عدد (درمیانی)
میتھی کے پتے	آدھا کپ
ٹماٹر	پانچ عدد
لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
زیرا	ایک چائے کا چمچہ
پسا دھنیا	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
ادرک لہسن	ایک کھانے کا چمچہ
گرم مسالا	آدھا چائے کا چمچہ
ہرا دھنیا	تین کھانے کے چمچے
ہری مرچ	چار عدد

ترکیب:

مغز کو نمک اور ہلدی کے ساتھ ابال لیں۔ اب تیل گرم کرکے باریک کٹی پیاز کو ہلکا سا گلابی کریں۔ میتھی کے پتے ڈال کر چند منٹ فرائی کریں۔ اب اس میں باریک کٹے ٹماٹر، لال مرچ، نمک، بھنا پسا زیرا، پسا دھنیا، ادرک لہسن اور گرم مسالا شامل کرکے اچھی طرح بھون لیں۔ اب ابلے ہوئے مغز کو چوتھائی کپ پانی کے ساتھ ڈال کر دس منٹ کے لیے دم پر چھوڑ دیں۔ آخر میں ہرا دھنیا اور مرچ سے سجا کر پیش کریں۔

بیف اسٹو

گوشت	ایک کلو
نمک	ایک چائے کا چمچہ
لہسن	ایک کھانے کا چمچہ
ادرک	ایک کھانے کا چمچہ
پیاز	تین عدد
زیرا	ایک کھانے کا چمچہ
دھنیا	ایک کھانے کا چمچہ
ثابت لال مرچ	دس عدد
کڑی پتا	تین عدد
دار چینی	دو ٹکڑے
کالی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
بڑی الائچی	دو عدد
دہی	ایک کپ
تیل	آدھا کپ
ہری مرچیں	پانچ عدد

ترکیب

ایک پین میں تیل گرم کر کے لہسن اور ادرک فرائی کرلیں۔ اب اس میں باریک کٹی پیاز، نمک اور گوشت شامل کر کے پانچ منٹ تک بھون لیں۔ اب اس میں ثابت گرم مسالہ اور ثابت لال مرچ ڈال کر بھون لیں۔ تین کپ پانی شامل کر کے دھیمی آنچ پر گوشت گلنے تک پکائیں اب اس میں دہی اور ہری مرچیں ڈال تیز آنچ پر دس منٹ پکائیں اور سرو کریں۔

کچری کباب

گائے کا قیمہ	آدھا کلو
پیاز	ایک عدد
خشخاش	ایک کھانے کا چمچہ
کھوپرا	ایک کھانے کا چمچہ
بھنے چنے	دو کھانے کے چمچے
ادرک لہسن	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	حسب منشا
لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
گرم مسالا	ایک چائے کا چمچہ
کچری پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ

ترکیب:

قیمے کو پیاز کے ساتھ باریک پیس لیں اور ایک طرف رکھ دیں۔ اب اس میں خشخاش، کھوپرا، بھنے چنے خشک پیس کر قیمے میں شامل کرلیں۔ اب اس میں ادرک لہسن، نمک، لال مرچ، گرم مسالا کچری پاؤڈر ڈال کر دوبارہ چوپر میں پیس لیں۔ گول ٹکیاں بنا کر توے پر تیل ڈال کر تل لیں۔ مزے دار کچری کباب تیار ہیں۔

نمک گوشت

گائے کا گوشت	2 کلو
نمک	ایک چمچہ
ہری مرچ	آٹھ سے دس عدد
کالی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
لیموں	دو سے تین عدد
لہسن ادرک	دو چمچے

ترکیب:

نمک گوشت کے لیے چکنا اور ہڈی والا گوشت لیں، ایک پتیلے میں گوشت میں اتنا پانی ڈالیں کہ گوشت بھیگ جائے اب گوشت میں اوپر دیے گئے تمام مسالے ڈال کر چڑھا دیں جب گوشت گل جائے اور پانی بالکل خشک ہوجائے تو اسے ہلکا سا بھون لیں۔ ادرک اور ہری مرچ سے گارنش کر کے پیش کریں۔

عدنان

نفسیاتی و ازدواجی الجھنیں

عما۔ کراچی

س: عدنان بھائی میں آپ کے پاس جو مسئلہ لے کر آئی ہوں ممکن ہے وہ آپ کو بہت عام سا لگے۔

میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں، میری عمر اس وقت تیس سال ہے۔ بارہ سال پہلے والد صاحب دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ وہ سرکاری ملازم تھے۔ پینشن آتی ہے۔ جس گھر میں رہتے ہیں۔ وہ ذاتی ہے۔ والد کے انتقال کے بعد امی نے اوپر دو کمرے بنوا کر انہیں کرائے پر دے دیا۔ امی اکیلے لڑکوں کو گھر کرائے پر نہیں دیتیں لیکن دو سال پہلے جس لڑکے کو کرائے پر دیا۔ وہ تنہا تھا۔ والدین گاؤں میں رہتے تھے۔ اس کی جاب کراچی میں تھی۔ امی بازار گئیں تو گرمی کی وجہ سے چکرا کر گر گئیں۔ خالد (اس کا نام خالد تھا) نے امی کو سہارا دے کر اٹھایا اور پھر گھر چھوڑنے چلا آیا۔ امی اس کے اخلاق سے بہت متاثر ہوئیں۔ باتوں کے دوران جب پتا چلا کہ اسے رہائش کا مسئلہ ہے تو امی نے کہا وہ ہمارے گھر میں رہ سکتا ہے۔ یوں وہ ہمارا کرائے دار بن کر ہمارے گھر رہنے لگا۔

گھر سے باہر کے سارے کام امی کرتی تھیں نل ٹھیک کرانا ہو، فریج خراب ہو۔ بجلی کا کوئی کام ہو، استری ٹھیک کام نہیں کر رہی ہو، اس طرح کے چھوٹے موٹے کاموں میں وہ امی کی مدد کرتا۔ اخلاق کا بہت اچھا اور خوش شکل بھی تھا۔ دراز قد، سرخی مائل گندمی رنگ، بڑی بڑی آنکھیں۔ یہاں میں یہ بتاتی چلوں کہ میں بہت معمولی شکل و صورت کی مالک ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ امی کی لاکھ کوششوں کے باوجود کہیں رشتہ نہ ہوا تھا۔ اس نے میری طرف توجہ دی، تو میں نے اسے اپنا وہم سمجھا لیکن جب اس نے اپنی محبت کا صاف لفظوں میں اظہار کیا تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ امی بھی خوش تھیں۔ اس نے امی سے کہا کہ وہ میری طرف سے بے فکر ہو جائیں۔ یہ رشتہ پکا سمجھیں۔ وہ آفس سے چھٹیاں ملتے ہی گاؤں جائے گا اور اپنے والدین کو ساتھ لے کر آئے گا اور وہ باقاعدہ رشتہ مانگیں گے۔

اس کے بعد اس نے نیچے ہمارے ساتھ ناشتا، کھانا شروع کر دیا، کرایہ کبھی دو ماہ یا تین ماہ بعد ایک ماہ کا دے دیتا۔ امی کو یہ رویہ کھٹک رہا تھا۔ انہوں نے کئی بار تقاضا کیا کہ وہ اپنی والدہ کو لے کر آئے تاکہ بات آگے بڑھے اور وہ اپنے فرض سے سبک دوش ہوں۔

ڈیڑھ سال کا عرصہ، اس نے ٹال مٹول میں گزار دیا پھر ایک دن وہ گاؤں چلا گیا، اس کو گئے تقریباً آٹھ ماہ

ہونے کو آئے ہیں۔ کوئی خیر خبر نہیں۔ اس کا فون بھی بند جا رہا ہے۔

اب ماموں نے میرے لیے اپنے بیٹے کا رشتہ دیا ہے، ان کا بیٹا معمولی شکل وصورت کا مالک ہے۔ واجبی سا پڑھا لکھا ہے۔ ماموں کے ساتھ ان کے جنرل اسٹور پر کام کرتا ہے۔ میرا دل نہیں مانتا مجھے یقین ہے۔ خالد واپس آئے گا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں سچی محبت دیکھی تھی۔ وہ یقیناً کسی پریشانی کی وجہ سے پھنس گیا ہے لیکن امی نہیں مانتیں۔ آپ انہیں سمجھائیں، میں آپ کا جواب انہیں پڑھا دوں گی۔

ج: اچھی بہن سمجھانے کی ضرورت آپ کی امی کو نہیں آپ کو ہے۔ آپ عقل کے ناخن لیں، اسے آنا ہوتا تو اب تک آچکا ہوتا یا کم از کم آپ کو فون تو کرتا۔ آپ سولہ سترہ سال کی کم عمر لڑکی نہیں۔ سمجھ دار ہیں خود کو فریب نہ دیں۔ وہ تو اب واپس نہیں آئے گا۔ لیکن یہ سمجھ لیں کہ آپ کی عمر نکل گئی تو کوئی اور رشتہ آنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ دنیا میں ماں کے سوا آپ کا کوئی نہیں، ذرا سوچیں ان کی آنکھیں بند ہو گئیں تو تنہا کس کے سہارے جئیں گی۔ اگر ماموں کا بیٹا پسند نہیں ہے تو بے شک انکار کر دیں لیکن اس شخص کے آسرے پر نہ رہیں اپنے بارے میں ضرور سوچیں زندگی بہت قیمتی چیز ہے اس کو کسی ایک شخص کے پیچھے ضائع نہیں کیا جا سکتا۔

فہمیدہ لاہور

س: میرے چار بیٹے ہیں۔ سب سے بڑے بیٹے کو میرے شوہر ڈاکٹر بنانا چاہتے ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ تینوں بیٹے تو پڑھائی میں بہت اچھے ہیں۔ ہمیشہ کلاس میں فرسٹ یا سیکنڈ، تھرڈ آتے ہیں۔ بڑا بیٹا بھی پاس تو ہو جاتا ہے لیکن کبھی بھی اس کے نمبر اچھے نہیں آتے جبکہ میڈیکل میں جانے کے لیے، اچھے نمبر حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔ شوہر کافی سخت سست بھی کہتے رہتے ہیں لیکن اس پر کوئی اثر ہی نہیں ہوتا۔ وہ کہتا ہے میں پڑھتا ہوں لیکن امتحان ہال میں جا کر سب بھول جاتا ہوں۔

عزیز بہن! آپ کے بیٹے میں کوئی خرابی نہیں۔ وہ ذہین ہے، آپ اس کی طرف سے بالکل فکرمند نہ ہوں۔ نہ ہی اس کا موازنہ دوسرے لڑکوں سے کریں۔ امتحان میں نمبر کم آنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ زندگی میں کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ دراصل ہمارا تعلیمی نظام اس طرح کا ہے اس میں سکھایا نہیں جاتا رٹوایا جاتا ہے۔ حافظہ اور ذہانت دو مختلف چیزیں ہیں۔ ضروری نہیں ہے جس کا حافظہ اچھا ہو وہ ذہین بھی ہو۔

پھر صرف ڈاکٹر انجینئر ہی بننا کامیابی کی دلیل نہیں اور بہت سے شعبے ہیں جہاں اپنے آپ کو منوایا جا سکتا ہے۔ آپ اپنے بیٹے کا رجحان دیکھیں پھر فیصلہ کریں کہ اس نے کیا کرنا ہے۔

اچھی بہن! جادو ٹونا، تعویذ گنڈے اس صورت میں زیادہ اثر کرتے ہیں، جب آپ ان پر یقین رکھتی ہوں یہ جادو ایک حقیقت ہے لیکن جادو کرنا اتنا آسان کام نہیں ہے۔ یہ بہت جان جوکھوں کا کام ہے۔ زیادہ تر لوگ جادو کی الف بے سے بھی واقف نہیں ہوتے۔ پیسا کمانے کے لیے بورڈ لگا کر بیٹھ جاتے ہیں اور ہر کام سو فیصد گارنٹی سے کرنے کا دعوا کرتے ہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ ہزار میں سے کوئی ایک عامل جادو کے عمل سے واقف ہوتا ہے اور اس کا جادو بھی اسی پر اثر کرتا ہے جو قرآن کی تلاوت نہیں کرتا اور گندا رہتا ہے۔ آپ سورہ فلق اور سورہ ناس باقاعدگی سے پڑھیں۔ ان شاء اللہ محفوظ رہیں گی۔

ذرا سوچیں اگر جادو اتنا ہی اثر رکھتا تو سارے لوگ اپنے مخالفین کو اس کے ذریعے زیر کر لیتے جبکہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایسا نہیں ہوتا۔

امتہ الصبور

بیوٹی بکس

کوثر خان......اسلام آباد

س: میری عمر چالیس سال ہے اس عمر میں جلد مرجھانے لگتی ہے، میرے شوہر ایک بڑے عہدے پر فائز ہیں۔ ان کے ساتھ مجھے بڑی بڑی پارٹیوں میں جانا پڑتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ میرا چہرہ اس عمر میں بھی جاذب نظر ہو، اس کے لیے مجھے کچھ مشوروں سے نوازیں......؟

ج: کوثر! اس عمر میں اپنی جلد کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ چہرے کی جھریاں ہماری عمر کا راز افشا کرتی ہیں۔ چہرے کی جلد ڈھیلی پڑ جائے تو چہرہ عمر کی چغلی کھانے لگتا ہے۔ خصوصاً خشک جلد پر تو جھریاں بہت جلد پڑتی ہیں۔ اس لیے سب سے پہلے آپ کو ایک اچھے موسچرائزر کا انتخاب کرنا ہوگا۔ صابن کے انتخاب میں بھی اس بات کو ملحوظ رکھیں روزانہ رات کو سونے سے پہلے موسچرائزر ضرور لگائیں اور اپنی غذا میں دہی کا استعمال بڑھا دیں۔

چہرے پر بھی دہی اور کیلے کا ماسک لگائیں۔ ایک کیلے کو اچھی طرح مسل کر اس میں ایک چمچہ دہی کا ملائیں اور بیس منٹ تک چہرے پر لگا رہنے دیں۔ یہ چہرے کی صفائی کرے گا اور جلد کو تازگی بخشے گا۔

جھریاں دور کرنے اور جلد کو تر و تازہ رکھنے کے لیے لیموں اور شہد کا ماسک بھی بہترین ہے۔

ایک چمچہ لیموں لے کر اس میں ایک چمچہ شہد ملا کر چہرے پر لگائیں۔ پندرہ منٹ لگا رہنے دیں پھر منہ دھولیں۔ ہفتے میں تین بار یہ عمل کرنے سے آپ کی جلد جھریوں سے محفوظ رہے گی۔

بڑھتی عمر کے اثرات روکنے کے لیے، صرف چہرے کا خیال رکھنا ہی کافی نہیں۔ اس کے لیے آپ کو اپنی جسمانی صحت کا خیال بھی رکھنا ہوگا۔ مرغن غذائیں، بیکری کی اشیاء، بہت زیادہ شوگر کا استعمال ترک کر کے سادہ غذا لیں۔ خصوصاً کچی سبزیاں اور پھل کھائیں تا کہ آپ اسمارٹ اور دبلی پتلی رہ سکیں کیونکہ چالیس سال کی عمر کے بعد ہمارے چربی کے گلینڈز زیادہ کام کرنے لگتے ہیں۔

سارہ ...... کراچی

س: میرے ساتھ بہت مسئلے ہیں۔ پہلا مسئلہ یہ ہے کہ میرے چہرے پر بالکل رونق نہیں ہے۔ میری جلد چکنی ہے۔ میرا قد بھی چھوٹا ہے۔ میرا رنگ ویسے تو صاف ہے مگر موسم کی تبدیلی کی وجہ سے رنگ کالا ہو جاتا ہے۔ میری آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے ہیں اور پلکیں بہت ہلکی ہیں......؟

ج: آپ صبح کے وقت، آدھا لیموں، نیم گرم پانی کے ایک گلاس میں نچوڑ کر پی لیا کریں۔

چہرے کی جلد چکنی ہونے کا سبب عموماً بد پرہیزی اور بدہضمی ہے۔ آپ خوراک سادہ اور زود ہضم استعمال کریں۔ گھی، مرغن، تلی ہوئی اشیاء اور بیکری کی بنی ہوئی چیزیں کم استعمال کریں۔ سنگترے کا جوس اور لیموں کا استعمال کھانے کے ساتھ ضرور کریں۔ اس سے جلد کی چکناہٹ دور ہوتی ہے۔ ٹماٹر اور کھیرے کا عرق چہرے پر لگائیں۔ خشک ہونے پر صاف پانی سے دھو ڈالیں۔ حلقوں پر بادام کے تیل سے مساج کریں۔ پلکوں پر کیسٹر آئل لگائیں۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے جسم میں آئرن اور وٹامن کی کمی کی علامت ہیں۔ ایسی سبزیاں اور پھل کھائیں۔ جن میں وٹامن بی اور آئرن ہو۔